جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۲ع

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

قیمت سالانہ ﷲ صہ — فی پرچہ ۸ عہ

زیر ادارت

[...]نا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

[ج]لد ۸ | بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۲ء | نمبر ۱

محمد مجیب بی اے (آکسن)، پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ قرولباغ سے شائع کیا۔

ہماری شاعری

میں عرصے سے خموش ہوگیا ہوں اور سے مدت سے جو چپ ہوں تو زباں صاف نہیں ہے۔ چہکنا کیا، اس ملک کی موجودہ فضا میں تو بولنا حرام ہوگیا ہے۔ ایک میں کیا، بلبلِ نالہ کش تک دم بخود ہے! مگر احباب کی فرمائش سے مجبور ہوکر آج کچھ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

مجھے مذہب سے محبت ہے اس لئے اس کی اس سریلی آواز یعنی شاعری سے بھی بہت الفت۔ اس شاعری کے متعلق حد کی غلط فہمیاں ہیں۔ اس لئے اس کی نسبت ذرا وضاحت سے کام لینا تھا۔ مگر ضیق وقت گلوگیر ہے۔ اندازے سے زیادہ زبان ہلانا مشکل ہے۔

اس بیان میں فلسفہ و روحِ شاعری اور اس کیف و انبساط کو بتانے کی کوشش کی ہے جسے ہم ہندی رس سے تعبیر کرتا۔ اور جسے ہمارا کُن رس و سخن رس ہی سمجھ سکتا ہے۔ افسوس کہ اتنی بڑی کہانی دو بولوں میں ختم ہوجائے گی۔ مگر اسے اہلِ علم اور اہلِ نظر دیکھیں گے۔ میرا مدعا پوشیدہ نہ رہے گا۔ میں مطمئن ہوں۔ آج نہیں، کل لوگ آئیں گے میرا مطلب سمجھیں گے، سمجھائیں گے اور اس مختصر کو مطول کر دکھائیں گے!!

نہ آئینہ کا قصہ اور نہ حالِ شانہ کہتے ہیں — حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

ہمارے یہاں شعر و شاعری کو سمجھا ہی نہیں گیا ہے۔ اس مبحث پر جو کچھ لکھا گیا اس میں اس سے گریز کرکے صرف نظم کی تعریف اور اس کی قصیدہ خوانی کی گئی ہے۔ بہت ہوا تو ایک صاحب نے فیاضی سے فرما دیا کہ ؎ شاعری جزویست از پیغمبری۔ اس چیستاں کا بوجھنا بھی آسان نہیں

اس لئے پہلے شاعری کو سمجھنا چاہئے تاکہ اُس کے متعلق غلط فہمیاں دور ہوں اور اُس سے وہ فوائد حاصل ہو سکیں جو منشائے فطرت ہے۔

جاننا چاہئے کہ اس عالم کے ذرہ ذرہ میں ہموزنی و تقابل اور تناسب پایا جاتا ہے جس کا دوسرا نام حسن ہے۔ اصطلاح میں اس صنعت کو ترصیع کہتے ہیں اس ترتیب و نظام پر نظر کر کے عقلا اس کا خود بخود وجود میں آجانا محال اور اس لئے کسی ایک صناع کا ماننا فرض سمجھتے ہیں جن عقلا نے اس صنعت و حسن کو سمجھ کر اُس کے صانع کی بندگی فرض سمجھی وہ تین گروہ میں منقسم ہیں۔

اول، وہ جو بذریعۂ وحی اُس کی غائت تک پہنچے اور دنیا کو اُس کے سمجھانے پر مستعد ہوئے اور خلق کو وہ قوانین دے گئے جو اُس صنعت کے برقرار رکھنے میں ممد ہوں اور اُس صانع کی بندگی کے لئے ضروری تھے۔ انھیں انبیا اور مرسلین کہتے ہیں۔

دوم، وہ جو بذریعۂ طبیعیات و مشاہدات اس مسئلے کی صداقت تک پہنچے اور اپنے استدراک اور استدلال کو عیاں کر گئے انھیں حکما و عقلا کہتے ہیں۔

سوم، وہ جو بذریعۂ حیات و جذبات اس مسئلے سے باخبر ہو سکے اور دلائل و براہین سے قطع نظر کر کے تخیلات و قیاسات سے کام لینے اور عوام کو اس طریقے سے متاثر کرنے لگے، انھیں شعرا کہتے ہیں۔

یہاں تیسرے قسم کے حکما و عقلا یعنی شعرا سے بحث ہے۔

شاعری و شاعر۔ ایسا ہر وہ خیال جو بذریعۂ حسیات و جذبات، دل و دماغ میں پیدا ہو کر زبان و قلم سے نکلے وہ شاعری ہے۔ اور جو فرد اپنے حسن اور جذبے سے اس عالم مرصع کی صنعت و حسن کو سمجھے اور اس کے صانع کا عاشق و مرید ہو کر اپنے خیالات، وہ نظم میں ہوں یا نثر میں، ادا کرے وہ شاعر ہے۔

شعر۔ کسی فقرے یا جملے کے موزوں یعنی وزن میں ادا ہونے کا نام شعر ہے۔ ایسے

نقرات کا بے اختیار منہ سے نکل جانا ہر ناطق کی فطرت میں ہی۔ اس لئے اس کا قدیم ہونا تعجب خیز نہیں۔

نظم۔ کسی خیال یا خیالات کا سلیقے سے کسی شعر یا اشعار میں بیان کرنے کا نام نظم ہے۔ یہ ملکہ بھی فطری ہے جو مشق سے بڑھتا اور ایک موزوں طبع اس پر قادر ہو جاتا ہے۔

تاریخی عہد میں اس شاعری کا زمانہ کئی ہزار برس قبل مسیح شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی بہترین یادگار رِگ وید و زَبور ہیں۔ شعر کی تاریخ مشتبہ ہی۔ اس لئے نظم کا کوئی زمانہ معین نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہندوستان کے بھجن (جو اکثر موزوں ہیں) اپنی عمر صدیوں قبل مسیح بتاسکتے ہیں۔ اور ملکوں اور دوسری قوموں میں بھی وہ جذبات جو حمد کے لئے مخصوص تھے، نثر و نظم میں ظاہر ہوا کئے۔ مگر اُن کا کوئی نمونہ موجود نہیں۔ اس لئے اُن کے متعلق کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ بے غش شاعری ایک عرصے تک قائم اور اپنے پرستار یعنی شاعر کے ذریعے سے دنیا پر ظاہر ہوتی رہی۔ لیکن اس میں رفتہ رفتہ آمیزش ہوتی چلی اور آخر وہ کم عیار ہوگئی۔ ہومر یونانی اور ورجل رومی کی نظمیں گو شاعرانہ کیف و انداز سے خالی نہیں۔ مگر اُن میں بھی یونان و روم سے قریب تر ملک شام کے اُن صحیح جذبات کا پرتو بہت کم نظر آتا ہے جو اس حصہ دنیا پر بصورت زَبور ظاہر ہوئے۔ اور اس وجہ سے یورپین نظموں میں جو ابتدا سے زیادہ تر یونانی و رومی خیالات کے زیر اثر رہیں۔ وہ حسن نظر نہیں آتا جسے ہم شاعری یا جان شاعری کہتے ہیں۔

ہند میں یہ شاعری اور ملکوں سے زیادہ چمکی۔ اور یہ ویدوں کے اثرات تھے۔ مہابھارت (نظم) میں سری کرشن جی کے عارفانہ و نصیحانہ بیانات اس کے شاہد ہیں لیکن سکندر کی بدولت جہاں اور یونانی خیالات یہاں داخل ہوئے وہاں اس غلطے کے آخر وہ جذبات بھی گھر کر گئے جو ہومر و ورجل کے لئے مخصوص ہیں۔ اور اس وجہ سے والمیکی و

کالیداس کے یہاں یونانی حکمت وتخیل زیادہ نظر آتی ہے۔ لیکن پھر بھی سنسکرت اور خصوصاً شاعری کی اکثر نظمیں اُس حسن سے خالی نہیں جو شاعری کے خط وخال ہیں۔

عرب، پر از جذبات وحسیات واقع ہوئے ہیں۔ جوش آور زود حسی شاعری کی جان ہیں۔ اور یہ دونوں باتیں قدرتاً ان میں موجود تھیں۔ انھیں ابتدا سے اگر کوئی ایسا علم ملتا جو اُن پر قابو کر کے انھیں روکے رہتا اور صحیح رستے پر لگا دیتا تو اس فن شاعری میں بھی وہ دنیا کے اُستاد ہو جاتے۔ مگر اُن پر کلدانیوں[1] کا اثر پڑا، اور نہ صابیوں[2] کا۔ وہ آل ابراہیم[3] کی گرفت سے بھی باہر رہے اور اس وجہ سے اُس نور کو وہ نہ دیکھ سکے جو حسن تک پہنچاتا اور اُس کا پروانہ کر دیتا ہے۔

اس قوم کی کائنات سبعہ معلقہ[4] ہے اور ان کا فصیح اللسان ناظم امرءالقیس۔ ایام جاہلیت کی ایسی نظموں میں جو خیالات نظر آتے ہیں وہ گو حسن ظاہر کی پر لطف تفسیریں ہیں، مگر لاعلمی کی وجہ سے حسن اصلی سے معرا۔ اور یہی سبب ہے کہ بعد کو اُن کی نسبت کہا گیا۔ کہ

والشعراء یتبعہم الغاوٗن[5]

اسلام نے عربوں کو آدمی بنایا۔ مدینۃ العلم[6] نے اُن کے حواس درست کئے اور باب مدینۃ العلم[7] نے یہ کہہ کر۔ کہ۔ رضینا قسمۃ[8] الجبار فینا۔ لنا علمٌ وللجہال، مالٌ۔ اُن میں علم ودانش

---

(۱) کلدان، عراق عرب کا وہ مقام جہاں اکثر ہادی ونبی پیدا ہوئے۔
(۲) صابیون۔ عرب کا وہ فرقہ جو موحدین کہلاتا تھا۔
(۳) آل ابراہیم۔ حضرتِ اسحاق وحضرت اسمٰعیل کی وہ اولاد جو دین ابراہیم کی علمبردار تھی۔
(۴) سبعۂ معلقہ۔ وہ مشہور عربی قصائد جو خانہ کعبہ میں آویزاں کئے گئے تھے۔
(۵) یعنی شعرا کی پیروی بہکے ہوئے کرتے ہیں۔
(۶) مدینۃ العلم۔ حضرت رسولؐ بقول۔
(۷) امیرالمومنین حضرت علیؓ۔
(۸) ہم اپنی قسمت سے خوش دل ہیں۔ ہم کو علم ملا اور ناد انوں کو دولت!

کا ذوق بھی پیدا کر دیا۔ پھر اُسی گھر نے انھیں صحیفۂ کاملہ(۱) کی سی زبور بخشی جس نے شاعری کے مفہوم کو بتا کر اُسے نوائے جاوداں دے دیا۔

ایامِ جاہلیت کی شعر گوئی گو شاعری کے اُس معراجِ کمال تک نہ پہنچ سکی جو معرضِ بحث میں ہے۔ مگر بلاشک وہ اُس کیف سے بھی خالی نہیں جو ایک پُر جوش اور آزاد قوم کا زیور ہے انھوں نے کسی غیر مستحق کا قصیدہ کبھی نہیں پڑھا اور سردارانِ وقت کی خوشامدانہ تعریف کبھی نہیں کی۔ عویر، امرء القیس کا مشہور ممدوح ہے۔ مگر اُس فصیح اللسان نے اُس (عویر) کا قصیدہ اس وقت کہا جب کہ عویر نے اُس (امرء القیس) کے کنبہ کی جان بچائی۔ وہ صلہ کا مستحق تھا اور اسے دیا گیا۔

"توہین ہوئی عربی شعر گوئی کی کہ وہ اپنی آزادی کو فراموش کر کے، اموی و عباسی خلفا کی درباری ہو گئی۔ بد قسمت تھا ابو نواس کہ امین (خلیفہ) کی مسند کا حاشیہ نشین بن کر اپنے قومی شعار و وقار کو سلام کر بیٹھا۔ بدنصیب تھا ابو تمام کہ شخصی توجہات سے اس کے حماسہ کا نام بلند ہو سکا۔ اور قابلِ افسوس ہے متنبی کہ سیف الدولہ اور اس کے لواحقین کی مدح میں اس کی خوش بیانی صرف ہوئی اور اُن کی بدولت وہ قصیدہ گو سمجھا گیا!

ایران، یونان کے ہاتھوں غارت ہوا۔ سکندر اور اُس کے لشکر نے جہان آور آثار و عناد یدِ عجم شکست کئے، وہاں افسوس کہ زردشت کے بے علم کے اُس پیراز نورِ آتشکدہ کو بھی سرد کر ڈالا جو برقِ وادئ ایمن کو چمکاتا اور دلوں کو گرماتا تھا۔ اور اس وجہ سے فارسیوں کی داستانِ پاستان کا ایک ورق بھی ایسا دستیاب نہ ہو سکا جو اُن کی شاعری کی حکایت ہوتا۔ اس باب میں تازیوں کی تاخت کے بعد کی روایت کے سوا کوئی اور تاریخ (نامہ) موجود نہیں۔ ناچار بہ اختصار اسی کا قصہ دہرایا جاتا ہے۔

عجم پر عرب کا اصل تسلط عباسیوں کے وقت میں ہوا۔ ہارون، فارس کا ولدادہ تھا۔

---

(۱) صحیفہ سجادیہ۔

اور مامون اس کا عاشق۔ اس طرف اور خصوصاً طوس و مرو[1] میں یہ مدتوں رہا۔ ان مشرقی ممالک پر سو سال سے، اسلامی نہیں اموی اور جمہوری نہیں شخصی سلطنت کا اثر غالب تھا۔ اس لئے فارسیوں اور ترکیوں کی زبان سے اُس وقت جو نکلتا وہ شامی و عراقی لب و لہجے میں ہوتا۔

قصیدہ، عربی میوہ ہے۔ اُس کا نخل زمین فارس پر بھی لگا یا گیا۔ اور یوں وہاں شخصی رطب اللسانی کی تلخ بنیاد پڑ گئی۔ عباس مروزی نے مامون کی شان میں بہ زبان فارسی جو قصیدہ خوانی کی وہ اس کی شاہد ہے۔ بنیاد غلط پڑی۔ اس لئے آدم پرستی کی عمارت یہاں بھی کھڑی ہو گئی۔ اور وہ کجی آج بھی نمایاں ہے۔ ایسی کجروی کے بعد بھی فارسی شعر گویوں میں فردوسی و سعدی قابل تعریف ہیں کہ وہ اگر اس حسن کو خاطر خواہ جلوہ نہیں دیتے تو اُس کے صفات سے بھی دور نہیں جاتے اور کسی کی تقلید کے بغیر دنیا کے آگے اپنا اصول پیش کرتے ہیں۔

فردوسی، پہلوی[2] کا وہ پہلا ناظم ہے جو اپنے صحیح جذبات کے بیان میں عجم یعنی گونگا نہیں۔ شہنامہ میں اس کی حمد استادانہ بلکہ مجتہدانہ ہے۔ اس کے بعد کے شعر گو اس کے تابعین ہیں اور تبع تابعین اور اُن میں کے بیشتر اس ضروری بیان کو تقلیداً و رسماً ادا کرنے والے۔ فردوسی حقیقی یزدان پرست ہے اس لئے اُس نے جمشید[3] کی نمرودیت و فرعونیت سے دنیا کو خوف دلایا وہ تثلیث یعنی اپنے ملک و قوم کا طرفدار اور اُن پر کسی بیرونی حملہ و حکومت کو خلاف فطرت جانتا اور اسے ایک صانع کی صنعت کی پامالی سمجھتا ہے، اس لئے وہ (فردوسی) رستم[4] کے سے

---

(۱) مرو۔ ترکستان کا ایک مشہور مقام۔
(۲) پہلوی۔ اصلی فارسی زبان جو ساسانیوں کے زوال تک ایران میں رائج تھی۔
(۳) جمشید۔ ایران و توران کا وہ مشہور بادشاہ جس نے اخیر میں دعوائے خدائی کیا۔
(۴) رستم اُن تورانیوں سے جنگ کرتا رہا جو اُس وقت ایران پر حملہ آور ہو رہے تھے۔

ملک و قوم کے فدائی کی داستان کو یوں جلوہ دیتا اور دنیا کو غلامی سے جنگ کا رستہ دکھاتا ہے۔ وہ شیدائے حقیقت ہے۔ اس لئے لہراسپ[1] و گشتاسپ کا مدح خواں ہے اور[2] زردشت کے زبردست معلم کا ثنا خواں۔ افسوس کہ اُس کا کارنامہ یعنی شہنامہ محض ایک داستانِ باستان سمجھا اور اُس کے منشا کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ بعد کے شعر گو اُس کے نقش قدم پر نہ چلے۔ اس لئے بے راہ ہوئے۔ سلاطین ایران شخصیت کے غرور میں مست تھے۔ اُن کے درباری شعر گو اُن کی اس شراب کو دو آتشہ بناتے رہے۔ آزادیٔ روح و زبان سلب ہوئی اور فارسی ادب غلامی کا مترادف ہو گیا۔

شہنامے کے سے میوہ دار درخت کے پھلنے کے بعد زمین ایران پر گلستان کے پھول بسے۔ سعدی، یثرب و بطحا کی زبان کا نمک چش، اور خم معرفتِ آلِ محمد کا جرعہ کش ہے۔ مصلح الدین واقعی مصلح دنیا تھا۔ بد اخلاقیوں کے عہد میں اُس نے اخلاق کا سبق دیا۔ خود مختار سلاطین کو بے اختیار منوایا اور سہ

رعیت چو بیخ ست سلطاں درخت	درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

کا سا اصول پیش کر کے دنیا کو حکمرانی کا راز اور راعی و رعایا کے حقوق دا متیاز کو بتلایا کہ اس کے بغیر عالم میں وہ حسن یعنی تناسب قائم نہیں رہ سکتا جو اس کائنات کی خوبصورتی و دل فریبی کے لئے لازم اور جس پر اس کارخانہ کی بنیاد نظر آتی ہے!

شیخ کے کلام اور خصوصاً اس کی گلستاں کی قدر ہوئی تو صرف اس قدر کا شعر مرا بہ مدرسہ کہ بُرد؟ کے مقولہ کو فراموش کر کے وہ مکتبوں تک پہنچائی اور بازیٔ اطفال بنائی گئی اور یوں بالغ و ناغوں تک اس کی رسائی نہ ہو سکی کہ ہماری زندگی میں کام آتی۔ اور پھر اس گلستان

---

(۱) لہراسپ اور اس کے بیٹے گشتاسپ کے زمانے میں زردشت کا ظہور ہوا اور انھوں نے زردشتی دین قبول کیا۔

(۲) زردشت ایران کا وہ معلم و ہادی جس نے دعوائے پیغمبری کیا اور جمشید وغیرہ کے اصول کو توڑ کر وحدانیت کا سبق دیا۔

فراموش قوم اور اس کے شعرگو، بعد کو، اپنے تخیلات کی وادی میں حیران و سرگردان پھرے اور منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے اور اُن میں سے کے بیشتر یتبعہم الغاوٗن کے مصداق ہو گئے!

ہند میں جس فارسی ادب نے گھر کیا وہ ترکوں کے ذریعے سے یہاں پہنچا تھا۔ اس قوم میں افراسیاب کے وقت سے لہو و لعب زیادہ پسند اور سنجیدگی ناپسند تھی۔ چنگیزیوں اور اُن کے بعد کے تورانیوں کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ وہ مسلمان ہونے پر بھی اپنے عادات و خصائل نہ بھولے۔ اور اس لئے فارس کے ادبی باغ سے اپنے ساتھ وہ میوہ چن لائے جو بہ ظاہر خوش نما ہو مگر بے مغز تھا۔ اس کا بیج، اُن کے ہاتھوں سے، یہاں بھی ڈالا گیا۔ اور وہ تین سو برس (یعنی غوریوں سے لودیوں تک) اس زمین پر پھولتا پھلتا اور ہماری زبان ہی کو مزا نہیں دیتا رہا بلکہ ہمارے خون میں سرایت کر گیا۔

مغل یا منگول اپنی قومیت و مذاق میں ان ترکوں سے بہتر نہ تھے۔ وہ چین و ماچین کے اس اثر رنگ کے آئینہ دار بھی بنے جس پر مانی(۱) کی قلمیاں زیادہ چڑھیں اور حجازی قلم جس پر کم رنگ بھر سکا تھا!

بابر تیموری اس قوم کا سردار ہے جو آخر شاہ ہند بنا۔ اپنے خاندان میں اس کی گردش و فلاکت ضرب المثل رہی۔ اور اس وجہ سے اس میں وہ فروتنی ہونا چاہئے تھی جو ایک فلک زدہ کے لئے ضرور ہے۔ مگر وہ اپنی مصیبت اور دشت نوردی کے عالم میں بھی یوں بے باکانہ کہتا ہے ؎

نوروز و نو بہار و مئے و لربا خوش ست ——— بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

---

(۱) مانی۔ یہ معلم، عراقی ہے۔ مگر اس کا اصول زیادہ تر توران و چین میں پھیلا۔ ادھر کے مسلمانوں میں دین مانی کی اکثر باتیں رائج ہیں اور اس کا اثر آج تک باقی ہے۔ مانی زیادہ تر اپنی مصوری کے باعث مشہور ہوا۔

یہ یونانی ایپیکورئین[1] کے وہ خیالات تھے جو سکندر کی نکالی ہوئی راہ سے فرغانہ پہنچے اور وہاں رہ گئے اور بعد کو ہند آئے۔ اس وجہ سے کہ ہمایوں سے شاہجہاں تک زیادہ تر بابری چال رہی اور شاہی اثرات سے اس ملک کی رفتار و گفتار بے قید ہوگئی اور یہاں کا درباری فارسی ادب اس شاعری کو جلوہ نہ دے سکا جو جن کی مدح خواں اور اس کی وکیل رہی ہے۔ عالمگیر اس معاملے میں خالی الذہن تھا۔ ورنہ اس کی توجہ سے جہاں اور بدعات دور ہوئے وہاں ہماری شاعری کی یہ بدعت بھی دماغوں سے خارج ہو کر اسے ایک عبادت منواتی اور مرقاتِ مصعدِ اعلیٰ تک اسے پہنچا دیتی!

اورنگ زیب کے بعد یہ ملک مخصوص ہیں گرفتار اور بعد کو طوائف الملوکی کا شکار ہو گیا۔ بہادر شاہ (اول) سے فرخ سیر تک عجب الجھن کا زمانہ تھا ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق که یاران فراموش کردند عشق

عشق عاشقی کیسی، یہاں تو خود فراموشی تھی۔ مگر ہماری اردو شاعری بھی عجب سخت جان ہے کہ ٹھیک اسی عالم انتشار میں وہ پیدا ہوئی اور بڑھنے لگی۔

تاتاریوں کی تاخت نے توران و ایران سے صلحاء و اصفیاء کو اخراج کر کے ہندوستان پہنچایا۔ ان کی برکت سے امید تھی کہ اب اس ملک میں بھی اس بادۂ حجاز کا دورِ عام اور علی الدوام ہو جائے گا جس کے وہ جرعہ کش رہے تھے۔ لیکن یہاں اس وقت تک ملک گیری و خانہ جنگی کا نشہ، اس طرح نہ اترا تھا کہ دماغ یکسو ہو کر اس کی طرف ہاتھ بڑھ جاتے۔ کوتاہ دست محروم اور پیرِ مغان مغموم رہے۔ ہاں، سلطان بلبن کے دور میں سلطان[2] جی کی توجہ و برکت

---

(۱) ایپیکورین۔ یونان کا وہ مشہور فرقہ جو حیات انسانی کو اسی دنیا میں ختم سمجھتا اور اسلئے کھاؤ پیو اور خوش رہو کا سبق دیا کرتا تھا۔

(۲) سلطان جی۔ حضرت نظام الدین اولیاء۔

ہے میر خسرو کا طوطیٔ زبان چہکا۔ اس نوا کا اثر ہو چلا تھا کہ سلطنت گردی کے ساتھ ادب گردی[1] و مذاق گردی بھی ہوگئی۔ اور خسرو کے ترانے قوالوں کے گلوں میں اتر کر اس طرح بلند نہ ہو سکے کہ ہماری فضا پر چھا جاتے۔ اور اس لئے فرخ سیر و محمد شاہ کی محفلوں میں خسروی سادرا[2] کی جگہ پوربی[3] گونجنے لگی۔

بیدل[4] پوربی عظیم آبادی، عالمگیری شہزادوں اعظم و معظم کے معلم تھے۔ اُن کا اور اُن کے سرود کا اثر دربار و بزار دونوں پر گو عام تھا، مگر اُن کی تعلیم عام فہم نہ تھی، اس لئے ہمارے دماغ اس کے اصلی فوائد سے خالی رہے۔ ہماری اردو شاعری وجود میں آئی تو وہ ابتداءً زیادہ تر ان اثرات میں پرورش پاتی اور فارسی کے اس ادب کا شیر بھی نوش کرتی رہی جو نہر لبن سے نہیں بلکہ سیحون و جیحون سے لایا گیا اور یہاں پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔

بدقسمتی سے اس ادب میں ہمارے ملکی یعنی وہ ویدی خیالات بھی معقولیت کے ساتھ داخل نہ ہونے پائے جو اس عالم مرصع کو جلوہ دینے والے بلکہ اس کے شارح و مفسر ہیں۔ اور اس وجہ سے ابتداءً ہماری نظم اُس حسن ہی سے معرا نہ رہی جو شاعری کی روح ہے بلکہ اُن صحیح و فطری جذبات سے بھی محروم ہوگئی جو اُس ذات حسن کے صفات ہیں!

اس میں شک نہیں کہ حافظ کے بعد سلجوقیوں بلکہ صفویوں تک ادب فارسی کے پتیلے پر وہ خرقہ بھی نظر آیا جو اس کا عیب پوش رہا۔ لیکن اس کے اس جامہ احرام کا ایک اچھا حصہ زرمم

---

(۱) ادب گردی و مذاق گردی، اُردو کے یہ نئے الفاظ ہمارے تصرفات میں سے ہیں!

(۲) سادرا۔ بھجن کی طرح بروزن دادرا، میر خسرو کا ایک ایجاد کردہ راگ جو بھجن کی دھن میں گایا جاتا تھا۔

(۳) پوربی ایک راگ ہے۔ بیدل پوربی تھے۔ اس وقت ان کا کلام بہت مقبول تھا۔ اس مناسبت سے اُن کی غزلوں کو پوربی کہا گیا!

(۴) مرزا عبدالقادر بیدل (پوربی) عظیم آبادی تھے۔

میں نہیں بلکہ دنیا کے اُن حصّوں میں بھی غوطہ کھا گیا جو بظاہر صفا ہوں مگر باطناً قلتین[۱] تھے۔ پہلی صدی ہجری سے تیسری بلکہ چوتھی صدی ہجری تک عالم اسلامی، عالمِ انتشار میں تھا۔ نقلیات کا مقابلہ عقلیات سے اور ان دونوں کی جنگ روحانیات سے شروع ہوگئی۔ معتزلہ[۲] بیچ میں آئے لیکن اُن کے اخوان الصفا کے سر پر وہ تیشۂ سخت لگا کہ اٹھ نہ سکے۔ اور بعد کو ہماری علمی جماعت صاف صاف دو گروہ (علمائے ظاہر و علمائے باطن) میں منقسم ہو کر ایک دوسرے کی دستار اچھالنے لگی۔ اِشاعرہ[۳] وحنابلہ کے آپس کے فسادات سے فائدہ اٹھا کر یہ فرقہ علمائے باطن مضبوط تر ہوگیا۔ یہی وہ گروہ ہے جو اپنی مختلف شکل وشمائل میں اور اپنی سادگی وضع کے باعث بعد کو ایک صوف کے نام سے شناخت کیا گیا۔ ابن جوزی[۴] و ابن تیمیہ کی شمشیر زبان گو اس فرقے پر بھی چلتی رہی مگر اُن گوشہ نشینوں کا قلع قمع نہ کرسکی۔ اہل ظاہر نے اگر انھیں لخت لخت کرنا چاہا تو انھوں نے بھی اپنے زور زبان سے انھیں پارہ پارہ کر دیا۔ ان اہل باطن کا واعظ انھیں اہل ظاہر میں سے ہے جس کی نسبت بہ بانگ دہل کہا گیا، کہ

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و ممبر می کنند　　　چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند!

یہ واعظ جیسے یوں بدنام ہوا کہ ہمارے ادب وشاعری کے قصائد میں وہ ایک مستعد مشبہ بہ ہی کا کام دے کر نہیں رہا تا بلکہ وہ ہماری محفلوں کا خونخوار محتسب بھی بنا اور آخر اس غریب پر دروازۂ رحمت تک بند ہوگیا!

اس وقت ہماری حکومتیں زیادہ تر اُن علمائے ظاہر کے قبضے میں تھیں جن کی تائید پر اُن (سلطنت) کی ہستی منحصر تھی اس لئے ان (علمائے ظاہر) کے اصول کے خلاف تقریر و

---

(۱) قلتین۔ اس کے اصل معنی گندے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اسوقت کا فارسی ادب منزہ نہیں بلکہ نجس ہو رہا تھا!
(۲) معتزلہ مسلمانوں کا وہ مشہور فرقہ جس کے مسلک کی بنیاد عقل پر رکھی گئی۔ اس فرقے نے بنی عباس کے شروع عہد میں فروغ پایا لیکن مسلمانوں کے اُن دوسرے فرقوں نے جن کے ہاتھوں میں بعد کو سلطنت کی باگ آگئی معتزلہ کو زندہ نہ رہنے دیا، انکی انجمن اخوان الصفا خاک میں ملائی اور انکی کتابیں تک جلائی گئیں۔ (۳) اشاعرہ مسلمانوں کا یہ بھی ایک نمایاں فرقہ تھا اور حنابلہ یعنی حنبلیوں کی ضد تھا۔ (۴) ابن جوزی و ابن تیمیہ مشہور محدثین ہیں، صوفیوں کے دشمن اور اپنے سوا اسلام کے دوسرے فرقوں کو بد کہنے میں مشاق وممتاز۔

تحریر کفر و بغاوت تھی۔ اہلِ باطن۔ رحمت و شفقت کو قہاری سے اور عشق و محبت کو جباری سے بدلا ہوا دیکھ کر منہ بناتے مگر زبان نہ ہلا سکتے تھے۔ لیکن خیالات و جذبات کیونکر اور کب تک رُکتے۔ انھوں نے اپنے بیانات کا آخر دوسرا طریقہ اختیار کیا اور اپنے تصورات کا نقشہ، مجاز کے اس پردے پر کھینچا جو حقیقت کا مظہر تھا مگر ظاہرین کی گرفت سے باہر تھا۔

فراق و وصل و گل و بلبل و بہار و خزاں — جنون و عشق و وفا و جفا و ناز و ادا
بہارِ حسن و دلِ آویزی کرشمۂ حسن — ہجوم شوق و فورِ توحش و سودا
ریا بھرے ہوئے پند و نصائح واعظ — شراب و ساقی مہرُو و ساغر و مینا
قصور و حور و جن و انس و آسمان و زمین — بہشت و دوزخ و رندی و توبہ و تقوا

یہ تشبیہات و استعارات کسی ایک قوم اور کسی ایک ملت کے خیالات کے آئینہ دار نہیں بلکہ سامیوں (Semitics) افلاطینوں (Neo-Platonists) ہرقیطیوں (Marcanatists) اور مانیوں (Manichaeism) اور ویدیوں (Vedists) اور عربوں (Saracenes) کے مخلوط دماغ کا وہ جوہر تھے جو رومن و فرنچ پراقلیت[1] (Praclete) اور جرمن پائے ٹسٹ[2] کے سے داعیانِ عشق باطنیوں کے گھروں میں کشید ہو کر دو آتشہ و سہ آتشہ بنے اور شرابِ معرفت کے نام سے پیئے اور پلائے گئے۔ ان ہی کنایات و استعارات کی بنیاد پر ہمارے روحانی ادب و شاعری کی خشتِ اول رکھی گئی اور اور اُن سے وہ محل تیار ہو گیا جہاں ہمارے مزاج پرورش پاتے رہے اور پرورش پا رہے ہیں!

---

(۱) پراقلیت۔ فرنچ لفظ ہے۔ باطنیوں اور صوفیوں کی طرح یورپ کا وہ فرقہ جو وہاں اصلی عیسوی مذہب کے پھیلانے کی کوشش کرتا رہا۔

(۲) پائے ٹسٹ (Pietists) جرمنی کا وہ مشہور فرقہ جس نے پروٹسٹ (مذہب) کے خشک و قشری رویے سے عاجز آکر، مذہب کی بنیاد عشق و محبت پر رکھی

Reasoning. بیانات وتعلیمات کا یہ مجازی و وجدانی (یعنی معرفتی) انداز یعنی عقلیات وتعینات سے گو دور نظر آئے مگر جذبات وحسیات بلکہ تنزہات سے وہ قریب تر تھا اس لئے ہمارے حواس اس سے لذت گیر رہے اور جب تک وہ ان نیچرل نہ بنا ہمارے دماغ بے زحمت عروج پاکر کیف دکھائی دئے۔ لیکن بے بصری یا بلند پروازی نے ایسی لاجواب اوریٹری (طلاقت) کے لئے فضول الفاظ اور پیچ در پیچ استعارات کے وہ طوفان اٹھائے کہ اُس کا اصلی وفطری زور ہوا بلکہ غائب ہوگیا۔ فارسی ادب وشاعری اس ساز وسامان سے اس ملک میں داخل ہوئی اور رفتہ رفتہ اتنی مضبوط ہوگئی کہ فرخ سیر کے عہد میں ہمارے ریختہ[1] کی بنیاد آخر اسی پر قائم ہوکر پختہ ہوگئی۔

ابھی کہا جاچکا ہے کہ تاتاریوں کی سفاکیوں نے ترک وفارس کے اہل صفا کو کس طرح ہندوستان پہنچایا اور کس خوشی وصلح جوئی سے وہ اپنے فرائض ووظائف میں مشغول تھے۔ شاہ بوعلی قلندر کا دائرۂ استغراق اگر میدان پانی پت کو گھیرے ہوئے ہے ورد یرو حرم جلوہ ولدادکیت کی آوازے اس زمین کو فتح کر رہا تھا تو دلی میں سلطان جی کا رواق عروج بھی ہے پروانہ چراغ حرم ودیر ندانند۔ کی صدا سے یہاں کی فضا پر قبضہ کئے ہوئے تھا۔ اہل دل کی ایسی صفائیوں نے اس ملک کے بند چشموں میں ایک طلاطم ڈالا اور یہاں کے قدیم رنگ باطنیت میں ہیجان شروع ہوگیا۔ بابا کبیرداس انھیں صداؤں سے اٹھے اور گرونانک بھی انھیں آوازوں سے چونکے اور پھر ہماری زمین پر سرمد ظاہر ہوکر منصور سمجھا گیا ہے آگاہ نئی چو شیشہ، از بوئے گلاب۔ لی خوشبو دلی کی ہوا میں جذب وتحلیل ہوکر ہمارے سروں پر نفی واثبات کا نور برسانے لگی! اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ عالمگیر کے بعد جب سلطنت میں انقلاب وزوال شروع ہوا تو سختیٔ قلب گھٹنے اور گدازیٔ دل بڑھنے لگی اور ہماری رنگین مزاجی شوب کھاکر آخر صوفیانہ ہوگئی!

فرخ سیر ومحمد شاہ کے زمانے کو یاد کرنے والے اُس عہد کی صرف اُن آزادیوں بےفکریوں

---

(۱) ریختہ۔ یعنی اُردو نظم۔

اور خصوصاً اُن رنگ[1] رلیوں کو جلوہ دیتے ہیں جو جلوخانہ دہلی میں اس وقت بظاہر آئینہ قص بلکہ اس تصویر کا دوسرا رخ مٹا دیا جاتا اور دماغ اُس سے خالی رہ کر طرح طرح کے وسوسوں کا اژدر بن جاتا ہے۔ اس دور میں علوم و فنون کی ترقی کا ذکر ہمارے موضوع سے باہر ہے لیکن اتنا سن لو کہ ان شاہوں کے جلوس میں جہاں ایک طرف عیش و نشاط کے ساز چھڑے تو دوسری طرف اخلاق و معرفت کے نعرے بھی گونجتے اور دلوں کو گرماتے اور ہلاتے رہے۔

نواب نوازش علی خاں و نواب اشرف علی خان وہاں (دلّی) کے اُسی عہد کے امرا میں سے ہیں جن کے گھر میں محفل میلا و مجالس عزا کی بنیاد پڑی۔ اور حضرت خواجہ ناصر عندلیب اور حضرت شاہ گلشن علی اُسی زمانے کے وہ صاحب باطن بزرگ ہیں جن کا مدرسہ و تکیہ، مذہب و اخلاق کے درس کے لئے مشہور اور جائے پناہ خاص و عام رہا اور اُن کی برکت و توجہ سے یہ مذہبی چرچا آخر گھر گھر پھیل گیا۔

یہ انھیں بزرگوار کا فیض تھا کہ نواب اشرف علی خاں کے خلف الرشید، نواب فضل علی خاں فضلی (۱۱۴۵ھ) نے اردو میں اپنی کربل کتھا سناکر اس زبان کو کوثر و تسنیم سے دھویا اور ہمارے دماغ کو مصفا و مطہر کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ "پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ہندی نثر نہیں ہوئی مستمع"۔ اس دعوے نے ثابت کر دیا کہ آپ کی اردو کی زبان کھلی تو اس ذکر میں جس کا اخلاق، عقلیات و جذبات دونوں کا حامل اور ممدوح فریقین ہے!

دکھن میں آپ کی زبان بہت قبل وجود میں آئی۔ عادل شاہی (ہمعصر اکبر و جہانگیر) دربار نے وہاں اس کی بنیاد نظم پر رکھوا دی۔ شجاع الدین نوری اُدھر کا وہ زردشت ہے جس کا نام کام دونوں نورٌ علیٰ نور سمجھا گیا۔ وہ اس زبان کی پہلی نظم پر فخریہ کہتا ہے ؎

---

(۱) رنگ رلیوں بھی بولتے ہیں۔ مگر ہماری زبان پر رنگ رلیوں ہے۔

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا — ولے سب تعصب دیا ہم مٹا
نہ کچھ خوف کھایا، نہ جھجکا ذرا — وُہ ہم مرثیہ سے پہل کر دیا
شروع میں کیا نظم کل واقعا — دُہم تک کا احوال پورا لکھا
میں جب اس کو لوگوں کنے گے پڑھا — عجب حال عاشورخانہ کا تھا
جن وانس کرتے تھے سب واہ وا — کہ دکھنی میں لکھا ہے کیا مرثیا
زبان اپنی میں کس نے ایسا لکھا — کبھی اس سو پہلے سنا نے پڑھا
(۱)ان سے اس کا ملے گا صلا — ہر نوری ہی موجد تو اس طرز کا

ملاحظہ ہو۔ وہاں بھی آپ کی زبان چھوٹتی اور اس کی نظم(۱) کی بسم اللہ ہوتی ہے تو اُسی ذکر میں جو عشق و معرفت کا سرچشمہ اور ہماری حیات کے لئے آبحیات ہے!

یہ تھے وہ اذکار جو دلی کی ان معرفت گاہوں میں زبانوں اور گلوں سے رسنوں سے اٹھائے اور ہند کی فضا میں پھیلائے جا رہے تھے۔ شاہ ناصر عندلیب کے بعد اُن کے خانہ باغ میں وہ بلبل درد آشنا چہکا جو خواجہ میر (درد) کے لقب سے مشہور ہے۔ موسیقی کہ رازِ فطرت کو بلند اور شاعری کو راز فطرت کو عیاں کرتی ہے، وہاں (دلی) کے اس صومعہ میں بھی مدتوں گونجی۔ ان میر کے مضامین نے دلی ہی کو نہیں سارے ہند کو کھینچا۔ کلاونت اور اتائی سب ٹوٹے اور ان آوازوں سے اپنے مزمار(۲) بھرے جو دوسری جگہ جاتی سے خالی کئے گئے۔

درد نے اپنی واردات کے بیان میں تشبیہات و استعارات کا وہ گہرا پردہ نہ ڈالا جس میں حقیقت پوشیدہ ہو کر راز کی راز رہ جاتی۔ انھوں نے اپنا رستہ الگ نکالا۔ اور پرلنے انداز میں اگر کہا بھی تو یوں کہا ؎

اے درد اس جہاں میں اگر صدائے غیب — بے پردہ ہوئے جس سے وہ پردہ ہے ساز کا

---

(۱) اس سے ثابت ہو گیا کہ اردو نظم و نثر کی بنیاد اخلاق پر ہے نہ کہ بد اخلاقی پر۔
(۲) مزمار۔ باجہ۔ ساز

یعنی لاکھ ڈھانکو مگر راز حقیقت کھول ہی دیتا اور حسن و معرفت کو عیاں کرہی دیتا ہے۔

اس نعمت خدا داد کا مزا یوں تو اس وقت کسی نے نہیں چکھا مگر میر تقی میر نے اُس سے جو لطف اٹھایا اُس کا کیف اُن کی بات بات سے عیاں ہے۔ یہ خواجہ میر کے سجادوں کے وہ دوسرے فقیر تھے جن کے قلب حزیں پر زمانے کی نیرنگیوں اور سلطنت گردیوں کا اتنا اثر پڑا کہ دلّی قفس بنی، اور سے کون رو روکے زندگی کاٹے۔ میر، دلی میں جی نہیں لگتا، فرار کر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں کے باغ میں بیٹھ کر اپنا فسانہ سناتے رہے۔ میر صاحب، ہوحق، کے بندے نہیں۔ وہ عالم حسن پر آنکھیں بند کر کے نظر ڈالتے اور اُس میں جذب ہو جانے کی بہ خموشی یوں آرزو کرتے رہتے ہیں ؂

بہ رنگِ بوئے گُل اس باغ کے ہم آشنا ہوتے
کہ ہمراہِ صبا ٹک سیر کرتے پھر ہوا ہوتے

یہ تھا وہ مذاق جو اس وقت دلی ہی تک محدود نہ رہا۔ بلکہ ملک میں عام ہوگیا۔ بنگالہ میں وہ دردؔ کے مشہور مرید و شاگرد (مرزا جان طپش کی سرگرمی سے گرم ہوا۔ اہل درد کی یہ وہی آگ تھی جو کلکتہ و مرشد آباد اور خصوصاً ڈھاکہ کی زبان و کلام میں مدتوں شعلہ بنی رہی اب بھی اس کا اثر کچھ کچھ باقی ہے اور وہاں کی راکھ کریدو تو دبی دبائی چنگاری[1] مل ہی جائے گی۔

بہار اور خصوصاً عظیم آباد (پٹنہ) نے دلی کے ساتھ ساتھ اس حسن پر جی قربان کیا۔ بیدل ہی اس کے دلدادہ نہیں۔ راسخ جو ہمعصر و ہم مرتبہ میر ہیں اس کے شیدائی رہے۔ وہ ہر طرف سے منہ پھیر کر فرماتے ہیں۔ ؂

نگراں کبھو نہ یہ جانب رخ دلفریب پری رہی
مری چشم تا نگہہ پسیں تر نی محو جلوہ گری رہی

نسفو۔

مجھے سونپ داغِ فراق سے، ہوئے یوں جدا کہ پھر
مرے دل میں تادم واپسیں وہ امانت انکی دھری رہی

(۱) جیسے استاد وحشت (خان بہادر رضا علی، کلکتوی) کی شاعری!

سنو، سنو۔

نہیں ہوش والوں سے کچھ حسد بھی رشک ہے تو انھوں سے ہے — جنھیں تیرے جلوہ کے سامنے میری طرح سے بے خبری ہی

نہ تھی چشم راسخ خستہ دل، کبھی خالی اشک سے دوستاں

شب و روز جام پر آب کی روش آنسوؤں سے بھری ہی

نادری و درانی حملوں نے دلی کے چاندنی چوک اور لال قلعہ ہی کو نہیں لوٹا بلکہ وہاں کے دماغوں کو بھی اجاڑ کر تتر بتر کر دیا۔ فیض آباد اسی وقت آباد ہوا۔ صفدر جنگی و سالار جنگی لڑا کے درجات عالی ہوں کہ انھوں نے دارالسلطنت (دتی) کے ان جواہر کو بھی سمیٹا جو دلی کے تخت و تاج کا کوہ نور[1] تھے اور انھیں اپنی شہ نشین کا کرسی نشین کر دیا۔ میر ضاحک، دلی سے اسی عہد میں فیض آباد آئے اور میر حسن اسی زمانے میں وہاں آباد ہو کر ان نوابوں (صفدر جنگی و سالار جنگی) سے وابستہ ہو گئے۔

حسن، خواجہ میر ہی کی مسند فقر کے حاشیہ نشین تھے۔ ان کا گھر نشیتوں سے خود ادب و اخلاق کا مدرسہ تھا جہاں اُن کی تربیت ہوئی۔ اس عندلیب و درد کی صحبت اور ان سے ارادت۔ اپنی اس قربت و مودت کو وہ یوں بیان کرتے ہیں: "بہ قدم دیگر بزرگان مثل خواجہ میر درد کہ در دمند یہائے او شان میان درویشاں چوں فرد فرد۔ دیگرے را بخیال خود قائم نہ کردم کہ وضع آں را پسندم و دل بہ گفتار آں با بندم"

حق ہے۔ اس صحبت سے آشنا ہونے کے بعد کدھر جاتے۔ یہ اسی مزے اور یکسوئی کا نتیجہ تھا کہ اُن کے دماغ و زبان نے ہمارے یہاں آخر وہ اعلیٰ مذاق شاعری قائم کر دیا جس کا مثل ممکن نہیں۔ اس اعلیٰ فطرت اور قدرتی شاعری کا اظہار اصل انھیں کے وقت میں ہو گیا تھا۔ مگر اس کی تکمیل ان کے پوتے میر انیس کے ذریعے سے مقدر تھی اور وہ ہو کر رہی۔

---

(۱) کوہ نور۔ وہ مشہور و معروف ہیرا جو دلی کے تخت و تاج کا زیور بنا رہا۔

حسن بچپنے سے ایک عظیم الشان کام کے سرانجام کے لئے تیار ہو رہے تھے اور قدرت نے اس کام کی خاطر انھیں منتخب کر کے ایسی تعلیم و تربیت پر لگا دیا جس کی تحصیل کے بغیر اُس امر کا خاطر خواہ انجام ممکن نہ تھا۔ یہ عظیم الشان کام اُن کی اُس بے نظیر مثنوی کا سرانجام تھا جو دنیا میں سحرالبیان کے نام سے ظاہر ہوئی اور بدر منیر بن کر چمکی۔ اس مثنوی کو جس نے بغور پڑھا وہی سمجھ سکتا ہے کہ جب تک دنیا و مافیہا کے مختلف شعبہ و مدارج میں کسی کو دخل تام نہ ہو ایسی کوئی شے اس کے دماغ و قلم سے نکل نہیں سکتی۔

اس عجیب و غریب تصنیف کے مختلف رنگ و پہلو ہیں۔ مگر ان میں سب سے اول اور پختہ رنگ اس کی اُس حمد کا ہے جس سے بسم اللہ کی گئی۔ یہی وہ شراب معرفت تھی جس کے لئے حسن کا دست سوال یوں بلند ہوا۔

اگر چاہتا ہے مرے دل کا چین ۔۔۔ نہ دیکھو وہ ساغر جو ہو قبلتین

وہ بادۂ خالص ملا جسے انھوں نے پیا اور پلایا اور اُس کے سرور میں داصل، دینے والے کی یوں ستائش کرتے ہیں ؎

کروں پہلے توحید یزداں رقم ۔۔۔ جھکا جس کے سجدے میں اول قلم
سرلوح پر رکھ بیاض جبیں ۔۔۔ کہا دوسرا کوئی تجھ سا نہیں
نہیں کوئی تیرا نہ ہوگا شریک ۔۔۔ تری ذات ہے وحدہٗ لا شریک
وہ ہے سب ہیں اس سے وہی سب سے پیش ۔۔۔ ہمیشہ سے ہے اور رہے گا ہمیش
وہی مالک الملک دنیاؤ دیں ۔۔۔ ہے قبضے میں اس کے زمان و زمیں
سدا ہے نمودوں کی اس سے نمود ۔۔۔ دل بستگاں کا ہے اس سے کشود
اسی کی نظر سے ہے ہم سب کی دید ۔۔۔ اسی کے سخن پر ہے گفت و شنید
نہیں اس سے خالی غرض کوئی شے ۔۔۔ وہ کچھ شے نہیں پر ہر اک شے میں ہے
نہ گوہر میں ہے وہ نہ ہے سنگ میں ۔۔۔ ولیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں

وہ ظاہر میں ہرچند ظاہر نہیں — بظاہر کوئی اس سے باہر نہیں
تامل سے کیجئے اگر غور کچھ — تو سب کچھ وہی ہے نہیں اور کچھ
اُسی گل کی بو سے ہے خوشبو گلاب — بھرے ہے لئے ساتھ دریا حباب
پر اس جوش میں آکے بہتا نہیں — سمجھنے کی ہے بات کہتا نہیں

سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد ہندوستان میں اور سلطنتِ صفویہ کی بنیاد ایران میں تقریباً ایک ہی وقت میں پڑی۔ حکومتِ مغلیہ کا بانی ایک رند مشرب بادشاہ، یعنی بابر اور سلطنت صفویہ کا بانی ایک صوفی مشرب عالم یعنی شاہ صفی الدین ہے۔ مگر یہ طرفہ تماشہ ہے کہ یہاں کے مغلیہ، مرتاضین ومشائخین کا ادب واحترام کرتے ہیں اور صفویہ اپنے ہم مشربوں کے عدو ہو جاتے ہیں۔

شاہ صفی الدین، حضرتِ شیخ جیلانیؒ کے مرید تھے۔ انھوں نے اخیر میں اپنا ایک جتھا قائم کیا اور اُس کی امداد سے شمال ومغرب ایران کے اکثر بلاد پر قبضہ کرکے وہاں کے حاکم بن بیٹھے۔ ان کے اخلاف نے، بعد کو، فارس پر ہاتھ مارا اور اصفہان میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ اور یہ سلطنتِ صفویہ کے نام سے مشہور ہو گئی۔

ان سلاطین کو روس وترک سے زیادہ اپنے ہم قوم وہم مشرب فرقہ وجماعت (صوفیین) کا خدشہ تھا۔ اس گروہ کی تعداد اس وقت غیر معمولی اور اُن کی طاقت مسلّم تھی اس لئے صفویوں نے تخت پر قدم رکھتے ہی اُن کے پامال کرنے کی فکر کی۔ شاہ اسمٰعیل اور شاہ سلطان حسین کا زمانہ تاریخ ایران میں مشائخ کشی کے لئے مشہور ہے۔ اس وقت ہزاروں جاسوس مقرر ہوئے۔ انھوں نے ان گوشہ نشینوں کا سراغ لگا کر انھیں گرفتار کرایا اور حکومت نے انھیں سیاست کا شکار بنایا۔

تیسری صدی ہجری کے بن جوزی وبن تیمیہ کی سنانِ زبان کا حال ابھی سن چکے۔ مگر نویں صدی ہجری کی اس تیغ صفاہانی کی صفائیوں کی روداد بھی تاریخوں میں پڑھو کہ اہل صفا کے لئے وہ کس طرح شمشیر برّاں بنی رہی اور اُن غریبوں کے لئے اپنے ملک میں، امن وامان کا رستہ کیونکر بند ہو کر کوچہ ہائے تیغ سے بھی اُن کا گذرنا محال ہو گیا۔ مشہور علامہ سید شاہ طاہر کاشانی کا واقعہ

کسی تاریخ داں پر پوشیدہ نہیں۔ اُن کا نا شیخ وقت، بہ سختی و مجبوری کسی طرح اپنی جان سے کر ایران سے ہندوستان چلا آیا۔ یہ وہی علامہ طاہر ہیں، جن کے دست پاک پر، بقول فرشتہ (تاریخ) برہان شاہ سلطان دکھن نے بیعت کی اور معہ ارکین سلطنت امامیہ مسلک اختیار کر کے اس مشرب کا خدمت گذار ہوگیا۔

ان سلاطین کے غیظ و غضب کی تلوار اس وقت کے زندہ اہل باطن ہی پر نہ چلی بلکہ اُن کے منجمد مردوں کی ہڈیوں کو بھی ریتنے میان سے نکل پڑے۔ شاہ سلطان حسین وحشت و خشونت میں آکر ایران کے صلحا و عرفا کے مزاروں کے بھی پیچھے پڑا اور گڑے مردے اکھاڑنے لگا۔ اپنے جوش غضب میں ایک دفعہ اصفہان سے شیراز پہنچا۔ اور وہاں سعدی و حافظ کی قبروں کو تہہ خاک کرنے کھڑا ہوگیا۔ مورخین کہتے ہیں کہ اس وقت کچھ امرائے سلطنت مانع ہوئے۔ آخر فیصلے کے لئے شیخ و خواجہ کے کلام سے تفاول کیا گیا۔ سعدی نے آواز دی، کہ ؎

الہی بحق بنی فاطمہ   کہ بر قول ایمان کنی خاتمہ

اور لسان الغیب نے جواب دیا کہ ؎ جوز اسحر نہاد حمائل برابرم۔ یعنی غلام شاہم و سوگند می خورم۔ اس پر بادشاہ ٹھنڈا ہوا اور وہ تربتیں سلامت رہ گئیں!

صفویوں کے عہد میں لاریب علمی ترقیاں بھی ہوئیں اور اس کے لئے وہ لائق ستائش ہیں۔ اس وقت جید علما بھی پیدا ہوئے۔ لیکن معقولات و منقولات کی تلوار اُن میں بھی چلتی رہی اور ان دونوں کے خدنگ روحانیت کی طرف ہمیشہ سیدھے رہے۔ سلطنت کبھی معقولی تھی اور کبھی منقولی اور ان کے بل پر وہ (حکومت) باطنیت کا استیصال کرتی رہی۔ اور اس کا یہ نتیجہ تھا کہ وجدان کمزور اور شاعری جو اس کا ایک زبردست آلہ کار ہے بے کار ہو جائے۔

ان حالتوں اور تزکیۂ نفس کے ایسے اداروں کی تباہیوں کو دیکھ کر شیخ وقت، ملا بہاء الدین آملی، زیادہ خموش نہ رہ سکے۔ ظاہر بینوں کو وہ گھورتے، اور معقولیوں کو معقول کرتے رہے۔ شاہ عباس (صفوی)، کے عہد میں کہ اس وقت وہ قاضی القضاۃ تھے، اپنی مشہور مثنوی

نانِ وحلوا تصنیف کی۔ اس میں ارشاد کرتے ہیں ؎

لیتَ شعری ماعلوم الفلسفہ — کم اری الاعمارَ فیہا مُتلفہ[1]
زان نگردد برتو ہرگز کشف راز — گر بود شاگرد تو صد فخر راز[2]
ایہا القوم الذی فی المدرسہ — کلما حصّلتموہ وسوسہ[3]
دل منور کن زانوار جلی — چند باشی کاسہ لیس بوعلی[4]
علم نبود غیر علم عاشقی — مابقی تلبیسِ ابلیسِ شقی

یہ وہی نان وحلوائے شیخ ہے جس کی لذت سید اکرم جناب مفتی میر محمد عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ، اپنی مثنوی من وسلوی میں نہ بھولے۔ فرماتے ہیں ؎

سید انان بہائی خوردہ — نعمت الوان شاہی خوردہ
نظم او دریا و نظم شبنم ست — ہست ایں کشکول وآں جام جم ست
بوریا با مسند جمشید چیست — نسبت ذرات با خورشید چیست

یہ نان وحلوی، من وسلوی بنا اور اس کا مزا مدتوں ہماری زبانوں پر رہا۔ شیخ کی ؎ مرحبا اے بلبل بستانِ حیّ[5] کی پکار نے لیلائے عشق کو پھر بے پردا اور قیس دل کو پھر مجنوں بنا دیا۔ یہ صدائے ناد رنے فارس سے ہند بھی پہنچی اور جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس بستانِ حی کے بلبل، درد و میر اپنی نواسنجیوں سے باغ ہند کو فردوسِ بریں بنا رہے تھے۔ لکھنؤ میں بھی

---

(۱) یعنی فلسفہ میں وہ شعور کہاں جس سے معرفت حاصل ہو۔ اس میں عمر عزیز بیکار صرف کی۔

(۲) علامہ فخرالدین رازی۔

(۳) ہلئے قوم مدرسوں میں جو تو نے سیکھا وہ حقیقت سے دور اور وسوسہ ہی وسوسہ ہے!

(۴) بو علی سینا مشہور حکیم۔

(۵) حیّ لیلی کے قبیلے کا نام ہے۔ یہاں بستان حی سے مراد گلشن عشق ہے۔ دل کو بلبل کہا اور اسے اس باغ میں چہکا دیا۔

یہ آوازیں مدتوں گونجیں اور نواب سعادت علی خاں کے وقت تک کہ صحیح تعلیم و تربیت کا وہاں رواج تھا، شیخ کی یہ کڑکتی صدا کانوں میں آرہی اور ظاہر بینوں پر بجلی گرا رہی تھی ؎

علمِ رسمی سربسر قیل ست و قال — نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال
طبع را افسردگی بخشد مدام — مولوی باور نہ دارد ایں کلام
چند ازیں فقہ و کلامِ بے اصول — مغز را خالی کنی ملے بوالفضول
صرف شد عمرت بہ بحثِ نحو و صرف — از اصولِ عشق ہم خواں یک دو حرف

لکھنؤ، دلی سے آزاد ہوتے ہی وہاں کی ہر چیز سے آزاد ہو گیا۔ غازی الدین حیدر و نصیر الدین حیدر کے دور میں وہاں کا مذاق تک بدل چکا تھا۔ حکومت آغا میر کے سے بے بصر کی گردشِ چشم پر گھوم رہی اور وہاں کی زمین و آسمان چکر میں تھے۔ شاعری کہ اہل خیر کی زبان ہے، بے خبروں کے منہ میں پڑ کر بستان حی سے نکل چکی اور نمائشی باغوں کی بھول بھلیاں میں گم ہو چکی تھی۔ خواجہ آتش۔ فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو وہاں کا یہ رنگ دیکھ کر دنگ ہو گئے۔ یہ دہلی نژاد اور اُسی دائرے کے فقیر تھے جو درد و میر کا تکیہ گاہ رہا تھا۔ انھوں نے اس قدیم لب و لہجے میں اپنی آواز بلند کرنا چاہی تو گلوگیر ہونے لگی۔ مگر وہ بے پروا، ایک سرو شدہ نظریہ زندگی کو اپنی آتش بیانی سے گرم کرتے رہے۔ اس وقت اُن کے لئے ایک نہیں ہزار در کھلے تھے اور جب چاہتے ایک آغا میر نہ سہی کسی امیر کی مسند کے حاشیہ نشین ہو جاتے۔ مگر انھوں نے اپنی آزادی زبان جو انسان کا شرف ہے، کسی قیمت پر فروخت نہ کی اور یہ فرما کر کہ ؎

طلبِ دنیا کی کرکے زن مریدی ہو نہیں سکتی — خیالِ آبروئے ہمت مردانہ آتا ہے

---

(۱) ظاہر بیں اور قشر بینین (علما) ہند اور خصوصاً لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں کے بعد عروج پا سکے۔ نواب مرحوم خود ذی علم تھے۔ اس وجہ سے ان کا ودھروں کے اثر میں آنا محال تھا۔ مگر ان کے بعد ہی علمائے ظاہر کا زور و شور شروع ہو گیا۔ اور پھر لکھنؤ کی خود مختاری و شاہی کی بدولت وہاں کی معاشرت و مذہبیت و شعریت اطراف ہند میں پھیل گئی۔

اپنے جھونپڑے میں بیٹھے آتش افروزی کرتے رہے۔

قدیم شامی و عراقی اور جدید ایرانی صفوی زمانے کی طرح اس وقت ہند میں بھی اہل علم کے دو گروہ ہو گئے تھے۔ اُن ملکوں کی تقلید میں یہ ملک بھی معقولیوں اور منقولیوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اور سے علم نبود غیر علم عاشقی۔ کو فراموش کر کے ان دونوں کا روئے سخن اُن عشاق کی طرف بھی ہو جاتا جو معرفت کے سروش سمجھے جاتے ہیں۔ آتش کا سا اہل عشق اُن کی زد سے کیونکر بچتا۔ زبانیں کھلیں، یہ سنتے اور بیٹھے جھوا کرتے!

یہ وہی وقت ہے کہ لکھنؤ کے فرنگی محل کا نام بلند ہو چکا اور بحرالعلوم (مولانا عبدالعلی) کی توجہ سے وہ ایک محیط علم مانا جا چکا ہے۔ خواجہ آتش بھی وہاں کے فضل و کمال پر نظر کرتے اور دیکھو کس جوش میں فرماتے ہیں ؎

چھائے ہوئے ہیں کوئے فرنگی محل تمام   ڈھلتی ہے عاشقانہ ہماری غزل تمام

فرنگی محل کا استعارہ علم و فضل سے ہے۔ مطلب یہ کہ علوم کا ذخیرہ ہمارے سینے میں بھی ہے اور اس لئے اس کے نتیجہ و ماحصل یعنی معرفت سے ہم بھی آشنا اور اس کے پیامبر ہیں!

خواجہ صاحب تقریباً ۱۱۸۰ھ میں پیدا ہوئے اس لئے انھوں نے ملا حسن علیہ الرحمۃ کا جنھوں نے ۱۱۹۸ھ میں وفات پائی، زمانہ بھی دیکھا اور بحرالعلوم (علیہ الرحمۃ) جن کا وصال ۱۲۲۵ھ میں ہوا، کے تو وہ ہمعصر و ہمنوا ہی ہیں۔ اس وقت وہاں منطق کا بھی بحد زور اور فرنگی محل کا میر زاہد پر حاشیہ مشہور ہو رہا تھا۔ خواجہ صاحب نے بھی سنا۔ مسکرائے اور بے تکلف فرمایا کہ ؎

عالم منطق مصور ہو تری تصویر کا   منہ کتابی قطبی ہو خط حاشیہ ہو میر کا

یعنی علوم اور سارے قضیہ کا نتیجہ تصویر یار کا کھینچنا اور عالم شہود میں اُسے لانا ہے۔ اور خطوط جو اس روئے روشن کے صفات ہیں وہ بمنزلہ حاشیہ و تفسیر ہیں اور قال اقول سے بے نیاز ہو کر ہم خود ؎ تصور میں تصویر جاں کھینچتے ہیں!

خواجہ صاحب کی آتش بیانیوں نے گو ملک میں ایک آگ لگا دی۔ مگر لکھنؤ کے دل اُن سے زیادہ گرم نہ ہوئے۔ اس سرد مہری کی اصل ذمہ دار اُس وقت کی حکومت ہی اور مولویانِ لکھنؤ کی غیر عالمانہ خشونت! مگر پھر بھی اسی شہر (لکھنؤ) کا آتش پارہ[1] ایک مقام پر اسی حسن و نور کا آتشکدہ یوں سلگا دیتا ہے۔ ؎

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری　　ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

یہ شگوفہ بھی گل بکاؤلی سے زیادہ ہماری آنکھیں روشن کر گیا!

یہ آتشی مذاق، دلی کا تحفہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب اہلِ ذوق وہاں بھی نہ رہے تو شاعری کے خوانِ نعمت پر مکھیاں بھنکنے لگیں ؎

خالِ پشتِ لبِ شیریں ہے عسل کی مکھی　　روحِ فرہاد لپٹ بن کے جبل کی مکھی

فرماکر اپنے معشوق کی صفائی طبیعت کا کیا خوب خاکہ کھینچا ہے۔ پھر خرمنِ دل پر یوں بجلی بھی گرائی جاتی ہے ؎

نصیر[2] لکھی ہے کیا غزل یہ کہ دل تڑپتا ہے سن کے جس کو　　بندھے ہے کب یوں کسی بشر سے فلک پہ بجلی نہیں یہ لا!

یہ تھا وہ مذاقِ شاعری جو آج سے سو سال قبل یعنی ۱۲۵۰ھ میں دلی و لکھنؤ اور ملک کے ایک بڑے حصے میں پھیل کر ہم کو اور ہماری شاعری کو بدنام اور رائے بھنگیڑیوں[3] کی گپ بنا رہا تھا۔

مگر پھر بھی اُسی اجڑے دیار اور دلی کے پرانے میکدے میں ایسی نجاستوں کی شستشو بھی ہو جاتی ہے۔ وہاں پھر ایک سرِ دشت[4] اٹھتا اور بادۂ حجاز کا وہ سرشار طلب جام میں یوں

---

(۱) پنڈت دیا شنکر نسیم　　(۲) شاہ نصیر مرحوم دہلوی

(۳) ظاہر ہیں اور قشری علما کی عصبیت نے جب ہمارے ادب و شاعری سے الٰہیات و تصوف کو خارج کیا اور لکھنؤ کی حکومت کے وہ شریک غالب بنے تو اردو شعرا کا بھی رنگ بدلا اس لئے کہ وہ سلطنت اور پھر قشری حکومت کے خلاف نہیں جا سکتے تھے۔ اس وجہ سے لکھنؤ کی شاعری میں انقلاب ہوا اور وہ ناگفتنی باتوں میں گرفتار ہو کر اتنی مسخ ہو گئی کہ اگر اُس شہر کے بعض شعرا اُس کی حالت پر نظر نہ کرتے تو یہ بدنامی کلنک کا ٹیکا بن جاتی! (۴) غالب۔

غفلت کرتا ہے

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

یعنی حکم ہو چکا ہے۔ عدول نہ کر۔ ہاں ابھی شے کہ یہ قطرہ سرور میں عروج پاکر دریائے حقیقت میں جلد مل جائے!

عظیم آباد (پٹنہ) ہمیشہ درد آباد رہا ہے۔ اس وجہ سے وہاں آتش نوازی نہیں، آتش پرستی ہوا کی ہے۔ اور یہ اسی کا صلہ ہے کہ لکھنؤ میں اگر اس دریائے نور کا یوں ذکر چھڑا

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

(آتش)

تو وہاں (عظیم آباد) یہ سمجھ کر کہ اس کے غمگین سننے والے کہیں بے چین سے بے چین نہ ہو جائیں اُن کی یوں تسلی کر دی گئی

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جاکر ڈوب گیا (شاد)

ہاں۔ رخ یار کی بہت شرحیں دیکھیں اور بڑی لن ترانیاں سنی گئیں۔ اچھا اس کی ایک اور تفسیر یاد کر لو

ہوا نور بار جو رخ تیرا، وہ لموع وچمک اعتلا
چمک اٹھے دشت وجبال ودر، تشعشعًا متزلزلا

کوچہ یار کا دکھڑا بھی خوب سنا گیا۔ اب اُس حقیقی کوچہ کی بھی ذرا سیر کر لو۔

ہیں نگاہ شوق میں متحد ترا کوچہ ہو کہ تپل گر
ترے جلوہ گاہ ہیں دونوں ہی جو منا ہے وہ تو یہ کہلا

تو مڑی یا تو بنی بجا بجا کر ہمارے یہاں آرزو کے سے سانپ کو خوب خوب کھلایا گیا ہے۔ اب اس مارآستیں کو مارو اور اس ہتھی (افعی) کا سر کچلو، سنو

ہمیں شاد (۱) جس کا بہت تھا ڈر وہی پیش آگیا الحذر
تمھیں کہتے تھے کہ امید سے نہ زیادہ رکھو خلا ملا!

یہ سچ ہے کہ قوموں کے عروج کے وقت یعنی جب کہ اُن کے قوائے دماغی سالم رہتے ہیں، ن میں بڑے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ اسی شاعری کو لیجئے تو والمیکی و کالیداس اور فردوسی و شیکسپیر س وقت پیدا ہوئے جبکہ اُن کی قوم کی ترقیوں کا زمانہ تھا۔ مگر یہ بہت کم دیکھا گیا ہے کہ اقوام کے زوال کے وقت یعنی جبکہ اُن کے قوائے دماغی مضمحل و پامال ہوجاتے ہیں، اُن میں بڑے لوگ پیدا ہوں۔ اس لحاظ سے میر انیس کی سی زبردست ہستی کا اس ملک میں جبکہ وہ زوال پذیر ہو رہا تھا، وجود میں آنا عجیب سمجھا گیا ہے۔ لیکن معلمین اخلاق ہمیشہ ایسے ہی وقت ظاہر ہوئے ہیں جب کہ اُن کی قوموں کے اخلاق خراب ہو کر پستی کی طرف مائل ہو رہے تھے، میر انیس بھی ایک معلم اخلاق تھے۔ اس ملک میں جب کہ وہ ہر اعتبار سے مضمحل و پست ہو رہا تھا ان کا ظہور اس لئے حیرت انگیز نہیں کہ اُن کی زبان و کلام سے یہاں بھی اُس رحمت کا نزول مقدر تھا جس کا وعدہ ہو چکا ہے

ان کے بزرگ خاندان میر امامی، ہروی ہراتی، شیخ[1] طریقت تھے۔ ان کے یہاں تعلیم

نوٹ صفحہ ۲۶) سید الشعرا خان بہادر سید علی محمد شاد (عظیم آبادی) وفات جنوری ۱۹۲۷ء بعمر ۸۰ سال۔
شاد مرحوم بھی خواجہ میر درد ہی کی خانقاہ کے مجاوروں میں سے ہیں۔ سلسلہ ملاحظہ ہو۔

خواجہ میر درد
|
میاں اشکی (عظیم آبادی)
|
شاہ الفت حسین فریاد (" ")
|
شاد

(۱) میر امامی صاحب سجادہ
(۲) میر برات اللہ
(۳) میر فیض اللہ
(۴) میر ضاحک
(۵) میر حسن
(۶) میر خلیق
(۷) میر انیس

(۱) میر امامی ہروی اس پائے کے بزرگوار تھے کہ امام و شیخ وقت کہلائے۔ ہرات میں کا سجادہ و تکیہ مشہور تھا جہاں روحانیات کا درس دیا جاتا۔ ہرات کے انقلابوں سے تنگ آکر یہ شاہجہاں کے عہد میں ہند آئے بادشاہ نے انہیں بڑی قدر و منزلت کے ساتھ اپنے تخت طاؤس کے برابر جگہ دی۔ دہلی میں بھی ان کی تعلیم شروع ہوگئی۔ ان کے بیٹے میر برات اللہ (عالمگیری) اور ان کے پوتے میر فیض اللہ (بہادر شاہی) نے بھی مناصب پائے اور اپنے خاندانی امتیاز کو سنبھالے رہے۔ ان میر فیض اللہ کے بیٹے میر ضاحک ہیں اور ان کے خلف الرشید میر حسن۔ ان میں بھی اپنے خاندان کے اثرات موجود تھے۔

و ہدایت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ یہ طریقہ نسلاً بعد نسلٍ خون میں سرایت کرتا ہوا حسن تک پہنچا اور حسن سے انیس کی رگوں میں آ گرگرم ہونے اور لہو کی طرح دوڑنے لگا۔ انیس کا زمانہ عجیب پرآشوب[1] زمانہ تھا۔ ہم زمانے سے کھیل رہے اور زمانہ شناس ہم پر ہنس رہے تھے۔ انھوں نے وہ دیکھا جو خدا دشمن کو نہ دکھائے، اور اس سے ان کے دل میں وہ ہیجان ہوا جو ایک فطری معلم و شاعر کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ وہ اپنے ملک و قوم کی ایسی پستی کے اسباب و علل پر غور اور اس کے علاج کی تدبیر کرنے لگے۔

ان کے گھر میں کئی پشت سے اخلاق پرستی یعنی[2] مرثیہ گوئی کا رواج تھا اور اس سے متاثر تھے۔ انھوں نے اس واقعہ (جس پر مرثیہ کا مدار ہے) کے راز کو سمجھا اور ایک زبردست آئیڈیل پیش کر کے ہمارے قوائے عقلی کی درستگی میں مشغول ہو گئے۔

وہ سمجھے اور خوب سمجھے کہ پوری تول تولنے کا نام اخلاق ہے اور اس کے برعکس بداخلاقی۔ انھوں نے دیکھا اور خوب دیکھا کہ آپس کے عمدہ برتاؤ اور مساوات کا نام اخلاق ہے اور

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۷) درد کی صحبت و ادارت نے اس پر جلا کی۔ اس کا ذکر اوپر آ چکا، اور ان کے رنگ شاعری کو بتایا جا چکا ہے۔

(۱) انیس کے وقت کا ہندوستان بداخلاقیوں کا نمونہ اور نکبتوں میں آپ اپنی مثال ہو رہا تھا۔ ہمارے دل پستی و انقلاب ہی کی طرف نہیں بلکہ غلامی کی جانب مائل ہو رہے تھے۔ اس وقت اگر کہیں کچھ روشنی دکھائی بھی دی تو وہ ایک مریض کا سنبھالا تھا جو اس کے پرستاروں کو غلط امید میں بہلائے رکھتا مگر اس کی شمع حیات کو جلد گل کر دیتا ہے!

(۲) انیس کے پردادا میر ضاحک سے مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا۔ پھر ان کے صاحبزادے میر حسن نے مرثیے کہے۔ میر خلیق کی مرثیہ گوئی محتاج بیان نہیں اس خاندان میں میر انیس وہ چوتھے بزرگوار ہیں جنھوں نے مرثیہ کے ذریعے سے اخلاق کا درس دیا۔ اس پر وہ فخر کرتے اور اپنے ایک صاحبزادے میر عسکری رئیس کی زبان سے فرماتے ہیں ؎ عمریں گذریں ہیں اسی دشت کی سیاحی میں ۔ پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

رئیس اس دشت کے پانچویں سیاح ہیں۔ "عمریں گذریں ہیں" اس سے مراد خاندان کی عمر ہے نہ کہ کسی ایک فرد کی یعنی اس مداحی میں ہمارے خانوادے کی عمریں صرف ہو گئیں!

س کے خلاف بداخلاقی۔ ان کی طبیعت رسا اس نکتہ تک پہنچی اور خوب پہنچی کہ اخلاق، واب و
ادیب یعنی ڈسپلن میں ہے اور بے ادبی و بد روی، بداخلاقی۔ اُن کے پر فکر دماغ نے طے کیا اور
خوب طے کیا کہ اپنے کسی اصول پر قیام و استقلال عین اخلاق ہے اور اس کا نتیجہ شریفانہ آزادی
اور اصول سے انحراف، بداخلاقی اور اس کا لازمی نتیجہ ذلت و غلامی۔ اُن پر منجلی ہو گیا اور
خوب منجلی ہوا کہ صحیح اخلاق معرفت ہے اور معرفت ؎

پیکان آبدار کہ آید ز دست دوست | بر عاشقانِ سوختہ باران رحمت است

اور ؎ گردن نہادیم، الحکم للہ اور پھر ؎ ہو عید جو قربان ہو سر راہ خدا میں۔ پر عمل کیے بغیر ناممکن
اور اس کے خلاف عمل، جہالت و بداخلاقی۔ اس ایک واقعہ کے اندر اتنی کرامتیں پا کر وہ اس
کی طرف جھک پڑے۔ اور ؎ ہر چہ گوئم از زبان شہ بود۔ پر عمل کرنے اور اس مردہ ملک میں
اپنے پاکیزہ سروں سے اخلاق کا صور پھونکنے لگے۔

انیسؔ وہ شاعر ہیں جنھوں نے اس عالم مثالی میں پریشان خواب اور اس آئینہ عالم میں
غلط تصویر کبھی نہیں دیکھی! وہ ہمیشہ ؎ تو موی بینی و من پیچش مو۔ تو ابرو من اشارتہائے ابرو۔ کو
دیکھتے، سمجھتے اور سمجھاتے رہے۔ وہ ملک و قوم کی بربادی و تباہی کو دیکھ کر بیحد متاثر ہوتے
اور اس کا چارہ نہ دیکھ کر غیبی امداد کے طالب ہوتے اور گھبرا گھبرا کر بے اختیار کہتے ہیں ؎

یا منتقم ظہور امام زماں دکھا | اب دم لبوں پہ ہے درِ امن و اماں دکھا
آنکھیں ہیں منتظر رخِ آرام جاں دکھا | پھر برق ذوالفقار کو آتش فشاں دکھا

دشمن رہے نہ ایک شہہ مشرقین کا
اُس دن غلام سوگ اتاریں حسین کا

ہماری بداطواریاں انھیں دکھ دیتی ہیں تو وہ ایک آنے والے کو پکارتے اور
شہہ مشرقین کے اصول کے توڑنے والوں کی گردنوں پر تیغ انتقام چلانا اور اس کے دشمن
یعنی بداخلاقیوں کا خرمن جمع کرنے والوں پر برق ذوالفقار گراتا اور اس جہاں میں از سرِ نو

اخلاق قائم کرنا، در رحمت کھلوانا اور اس وقت بندہ ہائے اخلاق کا غم دور کرنا اور اُن کا سوگ اتروانا چاہتے ہیں!

اس مضمون کے سننے والوں کے لئے یہ موزوں فقرہ سے شاعری جزویست از پیغمبری۔ غالباً اب چیستاں نہ رہا ہوگا! ایک شاعر (ناظم نہیں) معلم اخلاق اور صادق اللہجہ ہوتا اور اُس حسن اور صفات حسن کو جلوہ دیتا ہے جو اس عالم مرصع کو روشن کر رہا ہے اور اس لئے وہ قدرت کا پیامبر ہے! اس خصوص میں انیسؔ اپنے پیش رووں سے بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں! اپنے بیان وکلام کا جو دائرہ وہ کھینچ گئے اس سے نکلنا محال ہے۔ اور ایسی جرأت پر صاف کہہ دیا جائے گا کہ

اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے

ہند کا شرف کہ یہاں انیسؔ پیدا ہوئے۔ شاعری کی معراج کو وہ اس کی طرف مخاطب ہوئے۔ اور اُن کے زور زبان سے "پہنچی یہ زمین آسمان تک" اور اُردو کی عزت کو انھوں نے اُسے منہ لگایا اور اُن کے خیالات کا وہ بار اٹھا سکی اور اُن کے سُروں کا ارگن بن سکی!

اس بیان کے شروع میں کہا گیا ہے کہ۔ اس عالم کے ذرہ ذرہ میں ہموزنی و تقابل اور تناسب پایا جاتا ہے جس کا دوسرا نام حسن ہے۔ اصطلاح میں اس صنعت کو ترصیع کہتے ہیں۔ اس ترتیب و نظام پر نظر کر کے عقلا اُس کا خود بخود وجود میں آ جانا محال اور اس لئے کسی صناع کا ماننا فرض سمجھتے ہیں۔

اسی ترصیع نے مادہ پرستوں کو خدا پرست، حکما کو صفات پرست و قدرت پرست اور شعرا کو حسن پرست بنا دیا۔ اور ان سب نے مختلف لب و لہجہ میں اس کی ثنا کی ہے۔ مگر یہ حسن جہاں واقعی کندن کی طرح چمکا وہ کان کہیں اور ہی ہے۔ اس حسن کے ذخیرے میں سے ایک ذرہ پر نظر کرو۔ پرکھو اور دیکھو کہ وہ صنعت (ترصیع) کس طرح چمکتی اور اس صانع کے یہاں کیونکر صفت کی جاتی ہے۔

صبح کاذب کافور ہوئی اور عاشور محرم کی صبح صادق سے بے حجاب ہو چلی۔ پو پھٹ رہی،

اور سے ڈوبتے جاتے ہیں دریائے فلک کے تارے! نور برس رہا اور اُس دھندلکے میں پنہاں، آشکار اور قدرت کا تماشا ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کیفیت کا اثر پڑتا اور اُڑنی گوئے اوج طور بھی اس وقت غش سے چونک کر کلمہ پڑھتا اور سارا عالم اُس صناع کی یوں حمد کرنے لگتا ہے ؎

قربانِ صنعتِ قلمِ آفریدگار　　تھی ہر ورق پہ صنعتِ ترصیعِ آشکار
عاجز ہے فکرتِ شعرائے ہنر شعار　　ان صنعتوں کو پائے کہاں عقلِ سادہ کار

عالم تھا محو قدرتِ ربِ عباد پر
مینا کیا تھا وادئ مینو سواد پر

صا جو ؎

بدیں نامہ بر عمرہا بگذرد　　بخواند ہر آنکس کہ دارد خرد

نے متعلق ہے۔ زمین سے اوسطاً نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ اس کی روشنی زمین تک آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے۔ یہ کسی دوسرے جرم سماوی سے کسب نور و حرارت نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے ہی نور سے زمین اور دوسرے سیاروں کو منور کرتا ہے۔ جرم آفتاب کرۂ ارض سے بارہ لاکھ اکسٹھ ہزار سات سو گنا بڑا ہے۔ اس کا قطر آٹھ لاکھ بانوے ہزار پانسو اسی اور محیط چھبیس لاکھ اٹھتر ہزار پانسو ہے۔ اس کی خارج شدہ حرارت کا $\frac{1}{2281000000}$ حصہ زمین تک پہنچتا ہے اگر اس کی حرارت کو منتشر ہونے نہ دیا جائے تو یہ اتنی مقدار یخ کو بہ آسانی پگھلانے کے لئے کافی ہے جس سے ساری زمین ڈھکی ہوئی ہو۔ اور جس کی ضخامت گیارہ بارہ میل ہو۔ اس میں بھی مثل زمین کے متعدد عناصر کا وجود ہے۔ مثلاً لوہا۔ نکل۔ تانبا۔ چاندی۔ کاربن۔ ایلومینیم، پوٹاسیم وغیرہ ان کے علاوہ دیگر عناصر کا بھی گمان کیا جاتا ہے۔ مگر ہنوز ان کے وجود کا پتہ نہیں چلا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ آفتاب کے کسی ایسے گوشے میں ہوں جہاں ہماری موجودہ تحقیقات کی رسائی نہ ہو اور آئندہ پتہ لگے۔ مثلاً گندھک فاسفورس۔ نائٹروجن۔ آرسنک۔ کلورین برومین وغیرہ۔ اس میں کچھ مہیب غار بھی موجود ہیں۔

سوائے حکیم فیثاغورث کے کل فلاسفہ قدیم زمین کے گرد آفتاب کی گردش کے قائل تھے۔ چنانچہ یہ خیال ایک عرصہ دراز تک رہا یہاں تک کہ کوپرنکس[1] کا زمانہ آیا۔ یہ حکیم ۱۴۷۳ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے پیش رو حکیم کے قول کی تائید کی اور اس کے قائم کردہ نظام کی تجدید کر کے زمین کو مرکزیت سے ہٹا کر آفتاب کو مرکز تسلیم کیا اور بجائے سماوی گردش کے ارضی گردش ثابت کی۔

متاخرین نے مطالعے کو وسعت دی۔ جدید انکشافات کئے اور مندرجہ ذیل سیارے معلوم کئے جو آفتاب کے گرد گھومتے ہیں۔

عطارد۔ زہرہ۔ مریخ اور پلوٹو زمین سے باعتبار جسامت چھوٹے اور مشتری۔ زحل

---

(۱) کوپرنکس ۱۴۷۳ء میں بمقام تھارن پولینڈ میں پیدا ہوا اور ۱۵۴۳ء میں بعمر ستر سال فوت ہوا۔

یورنیس، نیپچون بڑے ہیں۔ اب ہم اسی ترتیب سے ان کے مختصر حالات لکھتے ہیں۔

عطارد | اس کا مدار، مدار ارض میں واقع ہے۔ یہ اس قدر چھوٹا ہے کہ اگر اس جیسے سولہ سترہ اجسام باہم مل جائیں تو زمین کے برابر ہوں۔ اس کا قطر صرف تین ہزار میل ہے۔ آفتاب کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس لئے بہ آسانی نظر نہیں آتا کیپلر[1] غریب کو تا دم مرگ تمنا ہی رہی کہ اس کو دیکھے۔ مگر یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

زہرہ | جسامت میں زمین سے کچھ ہی چھوٹا ہے۔ چونکہ اس کا مدار بھی مثل عطارد کے مدار ارض میں واقع ہے۔ اس لئے اثنائے گردش میں بہ نسبت دیگر سیاروں کے زمین سے زیادہ قریب چلا آتا ہے۔ اس حالت میں راصدین کو اس کے معائنۂ سطحی میں بہت آسانی ہوتی ہے۔ اس کی فضا ابر وغیرہ سے ڈھکی رہتی ہے۔ باوجود اس کے یہی سیاروں میں سب سے زیادہ روشن اور خوبصورت ہے۔ چنانچہ جب یہ آسمان پر ہوتا ہے تو پھر نہ کسی سیارے کی روشنی اس کا مقابلہ کرسکتی ہے اور نہ کسی ثابت کی۔ علما کا خیال ہے کہ اگر کبھی نقل مکانی کی ضرورت درپیش ہوئی تو سب سے پہلے زہرہ ہی اہل زمین کا مسکن بنے گا۔ واللہ اعلم۔ آفتاب سے اوسطاً چھ کروڑ ستر لاکھ میل پر گردش کرتا ہے۔

زمین | اس کا قطر آٹھ ہزار میل ہے۔ مثل دیگر سیاروں کے آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے۔ اس کی گردش سالانہ ۳۶۵ ¼ دن میں تمام ہوتی ہے۔ یہ زمانہ سال کہلاتا ہے۔ حکمائے قدیم زمین کو مسطح اور ساکن سمجھتے تھے۔ مگر دراصل یہ کروی اور متحرک ہے۔ اور قطبین پر دونوں طرف ساڑھے تیرہ میل چپٹی ہوگئی ہے۔ اس کا ایک تابع بھی ہے جسے چاند کہتے ہیں۔ یہ زمین کے گرد گردش کرتا ہے اور ستائیس دن سات گھنٹے تینتالیس منٹ میں اس کے گرد گھوم جاتا ہے۔ اس زمانے کو قمری مہینہ کہتے ہیں۔ چاند کا قطر دو ہزار ایک سو ساٹھ میل ہے۔

---

(۱) کیپلر ۱۷ دسمبر ۱۵۷۱ء میں پیدا ہوا اور ببر ۵۹ سال ۱۶۳۰ء میں فوت ہوا۔

گلیلیو[1] نے منجملہ دیگر اجرام کے اس کا معائنہ بھی اپنی دوربین سے کیا تھا۔ پہلی ہی نظر میں اس نے چاند کی ہر چیز بہ آسانی دیکھ لی۔ مثلاً پہاڑ۔ وادیاں۔ آتش فشاں پہاڑ۔ کشادہ میدان۔ سمندر اور چٹانیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اگر ہم چاند پر سے زمین کو دیکھیں تو یہ بھی مثل چاند کے چمکدار اور روشن نظر آئے گی۔ مثالاً اس نے زہرہ کے ابر آلود کرے کو پیش کیا جو باوجود بادلوں کے بھی زمین سے کہیں زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ حالانکہ بذات خود روشن نہیں ہیں بلکہ آفتاب سے اخذ نور کرتا ہے جیسے زمین اور دیگر سیارے۔ چاند بظاہر سورج کے برابر نظر آتا ہے۔ حالانکہ جرم آفتاب سے چھ کروڑ تیس لاکھ گنا چھوٹا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند کا فاصلہ زمین سے دو لاکھ اڑتالیس ہزار اور سورج کا نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔

مریخ | اس کا قطر چار ہزار میل ہے۔ گلیلیو نے اس کا معائنہ اپنی نو ایجاد دوربین سے ۱۶۱۰ء میں کیا تھا۔ اس نے قرص مریخ پر بحر و بر کی علامات دیکھیں۔ پھر وقتاً فوقتاً ہیئت داں اس کا مطالعہ کرتے رہے۔ جب اس کی رویت بہتر ہو تو اس کی سطح پر بعض بعض مقامات پر سیاہ خطوط کا جال سا بچھا معلوم ہوتا ہے۔ جس کا طول تین سے چار ہزار میل تک ہے۔ ریگستانوں کا بھی پتہ لگتا ہے قطبین پر برف پوش چوٹیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی سالانہ گردش تقریباً دو سال میں تمام ہوتی ہے۔ اس کے دو تابع قمر ہیں جن کا قطر دس سے بیس میل تک ہے۔

نجیمے۔ تین چار سو کی تعداد میں مریخ و مشتری کے درمیان گردش کر رہے ہیں۔ ان سب میں بڑا سیرس جس کا قطر چار سو اسی میل ہے اور باقی چھوٹے ہیں۔

مشتری | نظام شمسی کا سب سے بڑا سیارہ ہے۔ اس کا قطر تقریباً اٹھاسی ہزار چھ سو چالیس میل

---

(۱) گلیلیو ۱۸ فروری ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا ۱۶۰۹ء میں دوربین ایجاد کی۔ ۸ جنوری ۱۶۱۰ء کو مشتری کے اقمار معلوم کئے۔ اور اسی زمانے میں خوردبین ایجاد کی ۱۶۳۷ء میں اندھا ہو گیا اور ۸ جنوری ۱۶۴۲ء میں فوت ہوا۔

ہے۔ یہ اتنا بڑا سیارہ ہے کہ اس کے جرم میں کرۂ ارض جیسے اجرام چودہ سو سما سکتے ہیں۔ اس کے نو قمر ہیں جن کا انکشاف سنہ ۱۶۱۰ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک ہوا۔ ابھی تک ان میں مزید اضافہ نہیں ہوا۔ مشہور ہے کہ اس نے اپنی کشش سے تقریباً پچاس ومدار سیارے نظام شمسی میں داخل کر دیئے ہیں۔ یہ زہرہ کے بعد سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔

زحل | مشتری کے بعد سب سے بڑا سیارہ ہے۔ اس کا قطر تقریباً ستر ہزار میل ہے۔ سالانہ گردش ساڑھے انتیس برس میں تمام ہوتی ہے۔ اس کے آٹھ قمر ہیں مثل مشتری کے اس نے بھی چار ومدار سیارے نظام شمسی میں داخل کئے ہیں۔ اس کے دو قمر سر ولیم ہرشل[1] نے سنہ ۱۷۸۹ء میں دریافت کئے۔

یورنیس | یہ ستارہ جدید دریافت ہوا ہے۔ اس کا انکشاف سنہ ۱۷۸۱ء میں سر ولیم ہرشل نے کیا۔ اس کا سال ہمارے ۸۴ برس کے برابر ہوتا ہے۔ یہ آفتاب سے ایک ہزار آٹھ سو ملین میل پر گردش کرتا ہے۔ بوجہ بُعد آفتاب اس میں روشنی وحرارت کم پہنچتی ہے۔ اس کی وسعت بھی کافی ہے۔ یعنی چونسٹھ اجسام مثل زمین کے اس میں سما سکتے ہیں۔ اس کے چار قمر ہیں اور دو ومدار سیارے اس کے متعلق ہیں۔

نیپچون | اس کا فاصلہ آفتاب سے دو ہزار آٹھ سو ملین میل ہے۔ سنہ ۱۸۴۶ء میں اس کا انکشاف ہوا۔ اس کی گردش سالانہ ایک سو ساٹھ پینسٹھ سال میں تمام ہوتی ہے۔ اس میں بھی چونسٹھ اجسام مثل زمین کے سما سکتے ہیں۔ اس کا صرف ایک قمر ہے۔ اس کے متعلق نو ومدار سیارے ہیں۔

پلوٹو | اس کا تعارف ہم سے ابھی ابھی ہوا ہے۔ یعنی جنوری سنہ ۱۹۳۰ء میں انکشاف ہوا۔ بہ اعتبار جسامت مریخ کے برابر خیال کیا جاتا ہے۔ تین ارب بہتر کروڑ میل آفتاب سے دور ہے۔ ابن

---

(۱) سر ولیم ہرشل سنہ ۱۷۳۸ء میں پیدا ہوا۔ سنہ ۱۷۵۷ء میں انگلستان گیا۔ سنہ ۱۷۷۴ء میں اپنی دوربین بنائی اور مطالعہ آسمان شروع کیا۔ آٹھ سو چھوٹے ستارے معلوم کئے اور ستاروں کی فہرست مرتب کی۔ پانسو اسی شہاب دریافت کئے اور ثابت کیا کہ آفتاب الجاثی کے ایک نقطے کی طرف جا رہا ہے۔ سنہ ۱۸۲۲ء میں فوت ہوا۔

کی گردش آفتاب کے گرد تین سو عال میں تمام ہوتی ہے۔ جس قدر نور و حرارت آفتاب سے زمین اخذ کرتی ہے اس کا ۱/۲۲۰۰۰۰۰۰۰۰ حصہ پلوٹو آفتاب سے لیتا ہے۔ اس کی روشنی مریخ سے ۱/[illegible] کی نسبت رکھتی ہے۔

دمدار سیارے | ان کے اجسام ٹھوس نہیں ہوتے کبھی کبھی نظر آتے ہیں اور بعض بعض تو نظام شمسی کو قطع کرتے ہوئے اس طرح باہر نکل گئے ہیں کہ اب شاید واپس نہ آئیں۔ اسی طرح یہ آوارہ گرد سیارے مختلف نظاموں کی سیر کرتے پھریں گے۔ یہاں تک کہ کسی ایسے زبردست نظام میں چلے جائیں جہاں کا آفتاب اپنی قوت جاذبہ سے انھیں مقید کر کے پھر باہر نہ نکلنے دے اور یہ دلچی ہمیشہ کے لئے پا بزنجیر ہو جائیں۔ بعض دمدار سیارے کئی کئی مرتبہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک ہی سیارہ ۱۷۸۶ء، ۱۷۹۵ء، ۱۸۰۵ء اور ۱۸۱۸ء میں متواتر دیکھا گیا۔ فضا کسی وقت دمدار سیاروں سے خالی نہیں رہتی۔ ممکن ہو کہ وہ ہمیں نظر نہ آئیں۔ مگر راصدین ان کی حرکات و سکنات کا ہر وقت معائنہ کر سکتے ہیں۔

کیپلر کا قول ہے کہ آسمان میں دمدار سیاروں کی تعداد سمندر کی مچھلیوں سے بھی زیادہ ہے۔ یعنی کسی وقت فضا ان کے وجود سے خالی نہیں رہتی۔ وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں نے انھیں معلوم کیا۔ منجملہ ان لوگوں کے سر ولیم ہرشل کی بہن[1] بھی ہیں۔ جنھوں نے آٹھ دمدار سیاروں کا انکشاف کیا۔

شہاب ثاقب | عوام کی اصطلاح میں تارے ٹوٹنا مستعمل ہے۔ دراصل یہ چھوٹے چھوٹے سیارے ہیں جو آفتاب کے گرد نہایت سرعت سے چکر لگا رہے ہیں۔ کبھی منتشر ہوتے ہیں۔ اور کبھی غول کے غول نظر آتے ہیں۔ جب یہ کرۂ ہوا میں اتفاقاً داخل ہو جاتے ہیں تو تیز

---

(۱) caroline . کارولائن سر ولیم ہرشل کی بہن ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوئی ۱۷۷۲ء میں انگلستان آئی۔ اور آخر تک ولیم ہرشل کی مددگار بنی رہی۔ اس نے آٹھ دمدار سیاروں کا پتہ لگایا اور آخرکار ۱۸۴۸ء میں اٹھانوے برس کی ہو کر فوت ہوئی۔

رفتاری کے باعث ہوا جیسی لطیف شے کی مزاحمت بھی گوارا نہیں کرسکتے اور ذرا سی رگڑ سے مشتعل ہوکر شعلہ فشاں ہو جاتے ہیں عظیم الجثہ شہاب تو کرۂ ہوا کو قطع کرکے اپنی راہ لیتے ہیں مگر چھوٹے شہاب اپنی تیزی و شعلہ فشانی سے خود جل کر بخارات بن جاتے ہیں اور ایک روشن خط کچھ دیر نظر آکر غائب ہو جاتا ہے۔ بعض وقت بڑے شہاب بھی کرۂ ہوا کو قطع کرتے وقت کشش ارضی سے کھنچ کر زمین پر آ رہتے ہیں۔ ان کے گرنے اور پھٹنے کی آواز نہایت ہیبتناک ہوتی ہے۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء میں ایک نہایت زبردست شہاب باشندگان ہنگری پر بلائے آسمانی بن کر نازل ہوا۔ زمین کے قریب آتے آتے پھٹا اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ منجملہ ان ٹکڑوں کے ایک ٹکڑا جس کا وزن دس گیارہ من تھا کسی جگہ پڑا ہوا ملا۔ اور مقامات پر بھی کبھی کبھی ان کا نزول ہوا ہے۔ پارہ ہائے شہاب کا تجزیہ کرنے سے بعض عناصر کا بھی پتہ لگتا ہے مثلاً تانبا نکل۔ لوہا وغیرہ۔

ہم نظام شمسی میں داخل ہوکر اپنی منزل مقصود سے دور ہوگئے۔ ابھی ہمیں بہت راستہ طے کرنا ہے۔ لہٰذا اب ہم نظام شمسی کو چھوڑ کر نظام انجم کی راہ لیتے ہیں۔ امید ہے کہ معزز ناظرین کو اصل سلسلہ تحریر یاد ہوگا۔

ہم اول لکھ آئے ہیں کہ سلف نے قدر اول کے صرف چودہ ستارے شمار کئے تھے۔ بعد کو ان کی تعداد میں چھ کا اضافہ کیا گیا۔ چنانچہ اب قدر اول کے بیس ستارے مانے جاتے ہیں۔ اب ہم ان بیس ستاروں اور ان کے مجامع النجوم کے حالات باختصار لکھتے ہیں۔

قنطورس | اس مجمع النجوم کی ہیئت مجموعی ایک ایسے حیوان سے مشابہ ہے جس کا اوپر کا جسم آدمی سے اور نیچے کا حصہ گھوڑے سے ملتا ہو۔ اس مجمع النجوم میں دو نہایت روشن ستارے ہیں۔ اول ستارہ جو ساڑھے چار سال[1] نور کے فاصلے پر واقع ہے رجل قنطورس کہلاتا ہے۔ اور لحاظ نور تیسرا ستارہ ہے۔

---

(۱) یعنی یہ ستارہ اتنی دور واقع ہے کہ اسکی روشنی زمین تک ساڑھے چار برس میں آتی ہے جبکہ روشنی کی رفتار فی سکنڈ

جاتا ہے۔ اس کا فاصلہ زمین سے دو نیل ترسٹھ کھرب بچانوے ارب ترسٹھ کروڑ بیس لاکھ میل ہے۔ یہ ہم سے سورج کے بعد دیگر ثوابت کے مقابلے میں قریب تر ہے۔ بہ اعتبار جسامت یہ آفتاب کے برابر ہی مانا جاتا ہے۔ اس کا دوسرا ستارہ بھی قدر اول کا ہے۔

یہ مجمع النجوم جنوری و فروری میں بالکل جنوبی مشرقی افق سے طلوع ہوتا ہے اور جون اور جولائی میں جنوب مغرب میں غروب ہوجاتا ہے۔

دجاجہ | صلیب شمالی بھی کہلاتا ہے۔ اس کا روشن ستارہ قدر اول سے ذرا کم ہے۔ مگر پہلی قدر کے ستاروں ہی میں شمار ہوتا ہے۔ اس کو ذنب الدجاجہ یا الرّدف بھی کہتے ہیں۔ یہ بہ اعتبار مسافت بہ استثنیٰ سہیل رجل الجوزا تمام قدر اول کے ستاروں سے زیادہ ہے۔ یعنی زمین سے دو پدم چونتیس نیل باسٹھ کھرب اٹھتر ارب چالیس کروڑ میل دور ہے۔ اس پر بھی روشن نظر آتا ہے ہمارے آفتاب سے ہزار گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ روشن ہے۔

دجاجہ میں ایک ستارہ ۶۱ دجاجہ کہلاتا ہے جس کی رفتار پرواز دو سو میل فی ثانیہ ہے اس کو کرۂ شمالی کا نزدیک ترین ستارہ تسلیم کرتے ہیں جیسے جنوبی کرہ میں رجل قنطورس مانا جاتا ہے۔ مجمع النجوم دجاجہ اپریل و مئی میں شمال مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور نومبر، دسمبر میں شمال مغرب میں غروب ہوجاتا ہے۔ دجاجہ ۶۱ کا بعد زمین سے بیسل نے ۱۸۳۸ء میں معلوم کیا۔

النہر | اس کو دریا بھی کہتے ہیں۔ نہایت وسیع مجمع النجوم ہے۔ الجبار کے مغربی پہلو سے شروع ہوکر مغرب جنوب میں بڑھتا چلا گیا ہے۔ مگر اس کے اکثر ستارے مدہم ہیں۔ مگر ایک ستارہ قدر اول کا ہے جو آخر النہر یا الف نہر کہلاتا ہے۔ یہ برج حمل کے بالکل جنوب میں جنوبی افق پر ٹمٹماتا نظر آتا ہے مجمع النجوم نہر کا طلوع ستمبر، اکتوبر میں ہوتا ہے اور فروری، مارچ میں بالکل غروب ہوجاتا ہے۔

سفینہ | یہ بھی وسیع مجمع النجوم ہے۔ چنانچہ ولیم ہرشل نے اس کو چار حصوں میں منقسم کیا اور سب

(۱) بیسل ۱۷۸۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۴۶ء میں بعمر ۶۲ سال فوت ہوا۔

کے نام علٰحدہ علٰحدہ رکھے۔ لنگر سفینہ کا روشن ترین ستارہ سہیل کہلاتا ہے۔ بلحاظ نور آسمان پر دوسرے درجے کا ستارہ مانا جاتا ہے۔ اس کے سال نور کا اندازہ پانسو اور ہزار سال کے درمیان کیا جاتا ہے۔ اور یہ روز بروز ہم سے دور ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر سال تین سو ساڑھے اٹھتر ملین میل دور ہو جاتا ہے۔ باوجود اس کے بھی اس کی روشنی میں فرق نہیں آتا۔ ہزاروں برس سے ایسا ہی روشن نظر آتا ہے اور واللہ عالم کب تک ایسا ہی نظر آئے گا۔ اس کے متعلق عوام الناس کا خیال ہے کہ جب یہ طلوع ہوتا ہے تو تمام حشرات الارض مرجاتے یا چھپ جاتے ہیں۔ اور چمڑے میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو سہیل یمانی بھی کہتے ہیں۔ نومبر۔ دسمبر میں طلوع اور فروری میں غروب ہو جاتا ہے۔ سہیل برج جوزا کے بالکل جنوب میں جنوبی افق پر نظر آتا ہے۔ اور شعرائے یمانی سہیل کے شمال میں واقع ہے۔ لہٰذا دونوں ستاروں کی جائے وقوع بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہئے۔ تاکہ شناخت میں آسانی ہو۔

حوت جنوبی | یہ مجمع النجوم کچھ روشن نہیں۔ اس میں صرف ایک قدر اول کا ستارہ ہے جسے فم الحوت کہتے ہیں۔ زمین سے چودہ نیل چھیاسٹھ کھرب بیالیس ارب چالیس کروڑ میل ہے۔ آج کل نو دس بجے سمت الراس سے گزرتا ہے۔ یہ مجمع النجوم برج دلو کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ جون جولائی میں طلوع اور نومبر تک غروب ہو جاتا ہے۔

عسک الاعنہ | شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس میں ایک قدر اول کا ستارہ ہے جسے عیوق کہتے ہیں۔ یہ بلحاظ نور آسمان پر چھٹا ستارہ شمار کیا جاتا ہے۔ زمین سے اٹھائیس نیل چوہتر کھرب انیس ارب دس کروڑ چالیس لاکھ میل ہے اور ہر سال اٹھاون کروڑ چھتیس لاکھ سولہ ہزار میل ہم سے دور ہو جاتا ہے۔ سورج سے ایک ہزار گنے سے بھی زیادہ ہے۔ اس کو رقیب الثریا بھی کہتے ہیں۔ عیوق ستمبر میں طلوع اور اپریل تک غروب ہو جاتا ہے۔

شلیاق | شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس کے قدر اول کے ستارے کا نام نسر واقع ہے شمالی کرہ میں سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ اس کا فاصلہ زمین سے بیس نیل باون کھرب ننانوے ارب

۱۷۹۹۴

چھتیس کروڑ میل ہے۔ آفتاب سے سو گنے سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ اس کا طلوع اپریل میں ہوجاتا ہے۔ اور نومبر میں بالکل شمال مغرب میں غروب ہوجاتا ہے۔

عقاب | شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس کی ہیئت ایک ایسے عقاب سے مشابہ ہے۔ جو پر تولے ہوئے اڑنے کی کوشش کر رہا ہو اور منہ بجانب مشرق ہے۔ اس روشن قدر اول کا ستارہ نسر طائر کہلاتا ہے۔ یہ بلحاظ نور کرۂ فلکی پر گیارہواں ستارہ قرار دیا گیا ہے۔ زحل کے برابر روشن نظر آتا ہے۔ ہمارے آفتاب سے باعتبار جسامت و نور چھ سات گنا زیادہ ہوگا۔ زمین سے آٹھ نیل اکیس کھرب انیس ارب اٹھتر کروڑ چالیس لاکھ میل ہے۔ مجمع النجوم عقاب برج قوس کے شمال میں واقع ہے۔ نسر طائر کا طلوع مئی میں اور غروب نومبر میں ہوتا ہے۔ نسر طائر کے ادھر ادھر دو چھوٹے ستارے بحیثیت نمایاں واقع ہیں۔ جن سے یہ بہ آسانی شناخت کیا جاسکتا ہے

کلب اکبر | یہ جنوبی مجمع النجوم ہے۔ اس کے قدر اول کے ستارے کا نام شعرائے یمانی ہے۔ اس کو عرب عبور بھی کہتے تھے۔ اور قبیلہ قیس اس کی عبادت کیا کرتا تھا۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ نے سورۂ نجم میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ اَنَّہٗ ھُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی۔ اس کو کلب الجبار بھی کہتے ہیں۔ چونکہ عرب میں اس کا مطلع غرب بجانب یمن ہے اس لئے یمانی کہلاتا ہے۔ باعتبار نور کرۂ فلکی کے تمام قدر اول کے ستاروں سے زیادہ روشن ہے۔ اس کی روشنی ساڑھے آٹھ سال میں زمین تک پہنچتی ہے۔ اس کا بعد زمین سے پانچ نیل ستر کھرب اکانوے ارب چھبیس کروڑ چالیس لاکھ میل ہے آفتاب سے تقریباً بیس بائیس گنا بڑا ہے۔ پانچ میل فی ثانیہ ہم سے قریب ہو رہا ہے۔ اس کا ایک سیارہ بھی معلوم کیا گیا ہے۔ اس کی پیشین گوئی بیسل نے کی تھی اس کا انکشاف ۱۸۶۲ء میں بمقام امریکہ ہوا۔ خیال ہے کہ یہ سیارہ شعرائے یمانی کے گرد پچاس برس میں اپنی حرکت سالانہ تمام کرتا ہے اور یہ بھی روز بروز مثل مشتری وغیرہ کے سرد ہوتا جارہا ہے۔ یہ شعریٰ کی روشنی کا دس ہزارواں حصہ روشنی دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی کی طرح اور بھی سیارے ہوں۔ شعرائے یمانی کا طلوع نومبر میں ہوتا ہے اور مارچ یا شروع اپریل میں بالکل غروب ہوجاتا ہے۔ نہایت روشن چمکدار ستارہ ہے۔ اس

مجمع النجوم میں چار ستارے ایسے ہیں جن کا وزن مجموعی آفتاب سے نوسو چالیس گنا زیادہ ہے۔

کلب اصغر | یہ جنوبی مجمع النجوم ہے اور کلب اکبر کے شمال قدرے مشرق میں واقع ہے۔ اس مجمع النجوم کا قدر اول کا ستارہ شعرائے شامی کہلاتا ہے۔ بلحاظ نور آٹھواں شمار کیا جاتا ہے۔ عرب میں اس کا مطلع عزب بجانب شام ہے۔ اس لئے شامی مشہور ہے۔ تقریباً دس سال میں اس کی روشنی زمین تک پہنچتی ہے۔ زمین سے پانچ نیل چھیاسی کھرب چھپن ارب چھیانوے کروڑ میل ہے۔ یہ بھی مثل شعرائے یمانی کے ہم سے روز بروز قریب ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس کی رفتار ڈھائی میل فی ثانیہ ہے۔ اس کے بھی ایک سیارے کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ مگر ہنوز انکشاف نہیں ہوا۔ شعرائے شامی کا طلوع نومبر میں ہوتا اور غروب مارچ یا شروع اپریل میں۔

ثور | منطقۃ البروج میں ہے اور دوسرا برج ہے۔ اس میں ستاروں کے دو نسق واقع ہیں۔ اول ثریا۔ دوم فرددد۔ ثریا کو خوشہ پروین بھی کہتے ہیں۔ یہ بہت سے ستارے ایک جمع ہو گئے ہیں۔ نہایت خوشنما اور مشہور مجمع النجوم ہے۔ اس کا بڑا ستارہ درمیان میں واقع ہے۔ اور وسط الثریا کہلاتا ہے۔ یہ تیسری قدر کا ہے۔ رنگ سبزی مائل ہے۔ اگر دوربین سے دیکھیں تو بہت سے ستارے نظر آتے ہیں۔ خالی آنکھ سے دس تک گن سکتے ہیں۔ ثریا منازل قمر میں سے ہے اور چاند کی تیسری منزل ہے۔

دوسرا نسق فرددد ہے۔ اس کی شکل بالکل وی (V) سے مشابہ ہے۔ اس مجمع کا روشن قدر اول کا ستارہ الدبران کہلاتا ہے۔ چونکہ یہ ثور مذکور کی آنکھ پر واقع ہے۔ اس لئے اسے عین الثور بھی کہتے ہیں۔ دو ہزار چالیس میل فی منٹ ہم سے دور ہو رہا ہے۔ زمین سے چھبیس نیل انتالیس کھرب چھپن ارب تئیس کروڑ میل ہے۔ الدبران چاند کی چوتھی منزل ہے۔ عرب اس کو منحوس خیال کرتے تھے۔ قبیلۂ بنی تمیم دبران کی پرستش کیا کرتا تھا۔ شروع اکتوبر میں طلوع اور آخر مارچ میں غروب ہوتا ہے۔

الجبار | جنوبی مجمع النجوم ہے۔ نہایت روشن ستاروں سے مزین ہے۔ اس کے سات روشن تارے خالی آنکھ سے جگ مگ جگ مگ کرتے نظر آتے ہیں کیونکہ خط معدل النہار پر واقع ہے۔ اس لئے شمالی وجنوبی دونوں نیم کرہ کے لوگ اسے خوب پہچانتے ہیں۔

اس مجمع النجوم میں دو قدر اول کے ستارے ہیں۔ پہلا ابط الجوزا اور دوسرا رجل الجوزا کہلاتا ہے۔ ابط الجوزا بلحاظ نور نواں ستارہ ماناجاتا ہے اور زمین سے اٹھاون نیل پینسٹھ کھرب انہتر ارب ساٹھ کروڑ میل ہے۔ اور رجل الجوزا زمین سے دو پدم تریسٹھ نیل بچانوے کھرب ترسٹھ ارب بیس کروڑ میل ہے۔ اور یہ سہیل کے بعد قدر اول کے تمام ستاروں سے زیادہ مسافت رکھتا ہے۔ جبار کا سر حن ستاروں سے بنتا ہے۔ وہ منازل قمر میں سے ہیں اور چاند کی پانچویں منزل مانے جاتے ہیں۔ جبار کا طلوع اکتوبر میں اور غروب شروع اپریل میں ہوتا ہے۔

جوزا یا توامین | یہ تیسرا برج ہے۔ اس کی برج کی ہیئت ایسے دو آدمیوں سے مشابہ ہے جو توام ہوں۔ اسی وجہ سے اس کو توامین کہتے ہیں۔ اس میں بھی مثل جبار کے دو قدر اول کے تارے ہیں پہلے کا نام مقدم التوامین یا الف توامین ہے۔ اور دوسرے کا نام موخر التوامین یا ب توامین ہے۔ مگر مقدم التوامین بہ نسبت موخر التوامین کے مدہم ہے۔ یہ دن بدن ہم سے دور ہوتا جارہا ہے۔ اور موخر التوامین روز بروز نزدیک آرہا ہے۔ یہی وجہ مقدم کے موخر ہونے کی ہے۔ چنانچہ مقدم التوامین کا فاصلہ زمین سے اڑسٹھ نیل چار کھرب بیس ارب تہتر کرور ساٹھ لاکھ میل ہے اور موخر کا فاصلہ انیس نیل اکاسی کھرب پچاس ارب انچاس کرور ساٹھ لاکھ میل ہے۔ اس مجمع میں توام ثانی کے پستان پر ایک ستارہ ہے۔ جسے الہنعہ کہتے ہیں۔ یہ چاند کی چھٹی منزل ہے۔ وہ تین ستارے جوزا کے سر پر واقع ہیں جنھیں عرب الذراع المبسوط کہتے ہیں۔ یہ چاند کی ساتویں منزل مانے جاتے ہیں۔ برج جوزا کا طلوع اواخر اکتوبر میں ہوتا ہے، اور غروب اواخر اپریل میں۔

اسد | پانچواں برج ہے۔ اس کے قدر اول کے ستارے کا نام قلب الاسد ہے۔ اس کی روشنی زمین تک ایک سو پچاس برس میں پہنچتی ہے۔ یہ زمین سے تاسی نیل اٹھانوے کھرب چون ارب چالیس کروڑ میل ہے۔ ہمارے آفتاب سے ہزار گنا ضرور جسیم و روشن ہوگا۔

برج اسد میں الجبہہ ایک ثنائی ستارہ ہے۔ یہ چاند کی دسویں منزل مانا جاتا ہے۔ مگر مسلمان ہیئت داں الجبہہ سے مراد اسد کی پیشانی کے تین چار ستارے لیتے ہیں۔ الجبہہ کو ہندو نجومی منحوس خیال کرتے ہیں۔

ذنب الاسد | اس کو زبرہ بھی کہتے ہیں اور یہ چاند کی گیارھویں منزل ہے۔ اسد میں ایک ستارہ قدر دوم کا ہے۔ اسے صرفہ کہتے ہیں وہ چاند کی بارھویں منزل ہے۔ اہل عرب کا خیال تھا کہ جب صرفہ طلوع ہوتا ہے تو گرمی رخصت ہوجاتی ہے اور جب یہ غروب ہوتا ہے تو سردی۔ چونکہ اسد نہایت وسیع برج ہے اس لئے اس میں ایک نہ ایک سیارہ ضرور رہتا ہے۔ اسد کا طلوع شروع دسمبر میں اور غروب آخری یا شروع جون میں ہوتا ہے۔

عوا | یہ شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس کے قدر اول کے روشن ستارے کو سماک رامح یا حارس شمالی کہتے ہیں۔ بلحاظ نور چھٹا ہے اور سوا تین میل فی منٹ کی رفتار سے برج سنبلہ کی طرف جا رہا ہے۔ زمین سے اناسی نیل اٹھارہ کھرب۔ اڑسٹھ ارب چھیانوے کروڑ میل ہے۔ ہمارے آفتاب سے بلحاظ نور و جسامت ہزار گنا سے بھی زیادہ ہوگا۔ اس مجمع النجوم میں پانچ ستارے جن کی شکل ایل (L) کی سی ہے۔ چاند کی تیرھویں منزل شمار کئے جاتے ہیں۔ عوا کا طلوع شروع فروری اور غروب وسط ستمبر تک ہوتا ہے۔

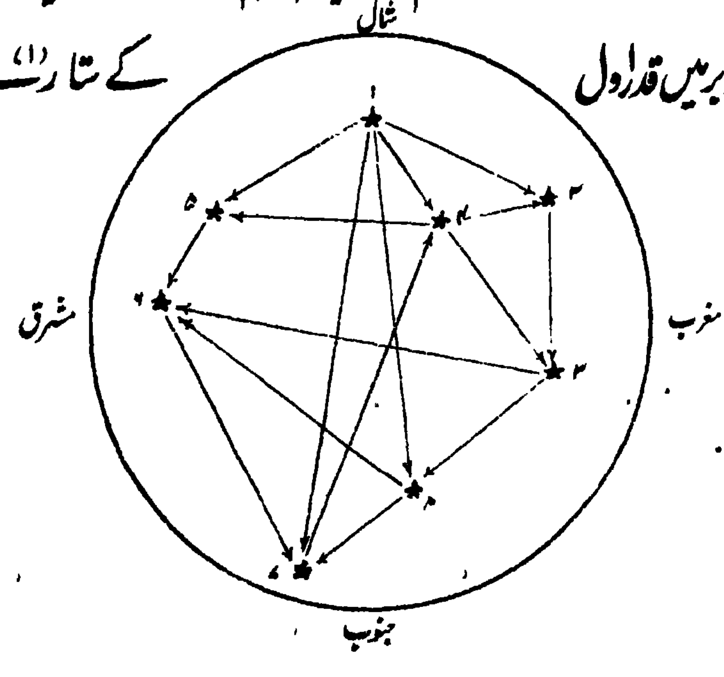
عذرا یا سنبلہ | منطقۃ البروج میں سے ہے اور چھٹا برج ہے۔ اس کے قدر اول کے ستارے کو سماک الاعزل کہتے ہیں۔ یہ السماک اور ساق اور سرخی کہلاتا ہے۔ یہ بلحاظ نور سولھواں ستارہ ہے۔ اور چاند کی چودھویں منزل ہے۔ ہمارے آفتاب سے ہزار گنا ضرور جسیم اور روشن ہوگا۔

برج سنبلہ کی ہیئت ایک ایسی لڑکی سے مشابہ ہے جس کا دامن لٹکا ہوا ہے۔ الٹا ہاتھ نیچے کی طرف اور سیدھا ہاتھ کندھے کی طرف اٹھا ہوا ہے۔ ہاتھ میں گیہوں کی بال ہے۔ یہی سنبلہ کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس کا طلوع شروع فروری اور غروب اگست تک ہوتا ہے۔

عقرب | آٹھواں برج ہے منجمین اسے نحس جانتے ہیں۔ اس کے قدر اول کے ستارے کو قلب العقرب کہتے ہیں۔ یہ سرخ رنگ ستارہ مریخ سے مشابہ ہے۔ مبتدی اس پر مریخ کا گمان کرتے ہیں۔ برج عقرب میں چاند کی تین منزلیں ہیں۔ اس کا سر جسے اکلیل کہتے ہیں۔ چاند کی سترھویں منزل ہے۔ قلب اٹھارھویں اور دم کے دو تین ستارے انیسویں منزل شمار ہوتے ہیں۔ اس کا طلوع اپریل میں اور غروب اگست دسمبر تک ہوجاتا ہے۔

اب ہم اکتوبر میں دس گیارہ بجے نظر آنے والے صرف قدر اول کے ستاروں کا ایک نقشہ پیش کرتے۔ امید ہے کہ اس سے یہ چند ستارے بہ آسانی پہچانے جاسکیں گے۔ اختر شناسی کے لئے ہمیں سب سے زیادہ موزوں قطب تارہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ہمیں ساکن نظر آتا ہے اور باقی ستاروں کے مقامات بدلتے معلوم ہوتے ہیں۔ لہذا ہم اس کو مرکز قرار دیتے ہیں تاکہ آسانی ہو۔

اکتوبر میں قدر اول کے ستارے(۱)



(۱) قطب تارا

(۲) نسر واقع

(۳) نسر طائر

(۴) ذنب الدجاجہ

(۵) عیوق

(۶) الدبران

(۷) آخر النہر

(۸) فم الحوت

ہم بخوف طوالت مضمون ختم کرتے ہیں۔ اس عظیم الشان کارخانے کا ایک شمہ بھی ابھی بیان نہیں ہوا۔ ربنا ماخلقت ہذا باطلا۔

(نوٹ صفحہ ۴۶) ارض البلد کی کمی بیشی کے لحاظ سے اگر ہمارے نقشہ میں کچھ اختلاف واقع ہو تو اس کو اپنے ذوق تحقیقی سے صحیح کر لینا چاہیئے؟

تدوین علوم

"حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے اپنے بعض شاگردوں کے کہنے سے علوم کی تالیف اور ان کی موجودہ شکل کے متعلق ایک مختصر سا رسالہ "السر المکتوم" کے نام سے تصنیف فرمایا تھا۔ اس رسالے میں علوم کی تقسیم اس طور پر کی گئی ہے۔ عربیہ۔ شرعیہ۔ فلسفیہ۔ محاضریہ۔ یہ رسالہ اگرچہ بہت مختصر ہے۔ مگر پوری جامعیت کے ساتھ تمام جزئیات کو حاوی ہے۔ اس رسالہ کا پہلے بھی ترجمہ ہو چکا ہے جس کا بالاستیعاب تو میں نے مطالعہ نہیں کیا مگر کہیں کہیں سے دیکھا ضرور ہے۔ لیکن خود میں نے ترجمے کے وقت اسے پیش نظر نہیں رکھا بلکہ اپنے طور پر حتی الامکان بہت آسان الفاظ اور ترکیبوں کے ساتھ نیز ہر مفہوم کو الگ الگ پیراگراف میں ترتیب دیا ہے۔ اور آخر میں تمام علوم کی فہرست اجمالی طور پر اپنی طرف سے بڑھا دی ہے"

علوم عربیہ علوم عربیہ کو اس لئے مرتب کیا گیا کہ ان کے ذریعے سے کلام عرب کو سمجھا جائے۔ کلام عرب کی چند حالتیں ہیں، یا تو مفردات سے بحث کی جائے گی۔ اس کی چند صورتیں ہیں۔

(۱) مفرد سے بحث کی جائے اس کے معنی کے لحاظ سے اسے علم اللغۃ کہتے ہیں۔

(۲) مفرد سے بحث کی جائے اس طور پر کہ لفظ کس طریقہ سے ادا کیا جائے اسے علم المخارج کہتے ہیں۔

(۳) مفرد سے بحث کی جائے اس لحاظ سے کہ وہ کس ہیئت اور شکل پر ہے اسے علم الصرف کہتے ہیں۔

(۴) مفرد سے بحث کی جائے اس حیثیت سے کہ ایک کو دوسرے کے ساتھ کیا نسبت ہے یعنی کون اصل ہے اور کون فرع اسے علم الاشتقاق کہتے ہیں یا مرکبات سے بحث کی جائے گی اس کی بھی چند صورتیں ہیں۔

۱۔ مرکب سے بحث کی جائے اس حیثیت سے کہ کلموں کی آخر کی حالت ترکیب کے وقت کیا ہونا چاہئے۔ اسے علم الاعراب کہتے ہیں۔
۲۔ مرکب سے اس حیثیت سے بحث کی جائے کہ کلموں کو آپس میں کس طور پر مرکب ہونا چاہئے اسے علم التالیف کہتے ہیں۔
۳۔ مرکب سے بحث کی جائے کلام کی خوبی اور عمدگی کے لحاظ سے تو اسے علم البدیع کہتے ہیں یا اشعار کے حالات سے بحث کی جائے گی اس کی بھی چند صورتیں ہیں۔
۱۔ حالت شعر سے بحث کی جائے باعتبار وزن شعر کے تو اسے علم عروض کہتے ہیں۔
۲۔ حالت شعر سے بحث کی جائے شعر کے آخری کلموں کو پیش نظر رکھ کر تو اسے علم القافیہ کہتے ہیں۔

اسی کے ساتھ وہ علوم بھی شامل ہیں جن میں اصطلاح عرب کے مطابق نقوش و کتابت سے بحث کی جائے اسے علم الخط کہتے ہیں۔

آنحضرت صلعم سے پہلے یہ علوم ترقی یافتہ صورت میں نہ تھے۔ سب سے پہلے جس شخص نے نقوشِ کتابت کی تشکیل کی ابوالاسود ہے۔ اس نے اشعار اور ان کے علاوہ دوسری کتابوں پر زیر زبر اور پیش کی علامتیں بنائیں۔

پھر خلیل بن احمد نے لغت میں کتاب العین تصنیف کی اور عروض وقافیہ کو مکمل صورت میں بنایا اس کے بعد سیبویہ کا زمانہ آیا اس نے اپنی مشہور کتاب علم نحو میں لکھی اسی کے ساتھ اس نے علم مخارج۔ صرف۔ علم التالیف، اور تھوڑا سا معانی کا حصہ شامل کر دیا۔ کچھ دنوں بادشاہوں کے مصاحبوں اور دوسرے ادیبوں نے قصوں اور فصیح و بلیغ شعرا کے کلام کی باریکیوں کو ایک جا اکٹھا کرنا شروع کر دیا اور یہی چیزیں علوم معانی۔ بیان اور بدیع کے استنباط کا سبب بنیں۔

علوم شرعیہ | وہ علوم جن کے ذریعے سے ایسی باتیں معلوم ہوں جنھیں آنحضرت صلعم نے خدا کی طرف سے لوگوں تک پہنچایا۔ ایسی باتوں کا سرچشمہ کتاب (قرآن) اور سنت (حدیث) ہے یا جو کچھ قرآن

وحدیث سے عقل کے ذریعے حاصل کیا گیا ہو۔ علما نے علوم شرعیہ کو چار پر تقسیم کیا ہے۔

(۱) فقہ جس میں عبادات لین دین۔ میراث۔ گھر کا انتظام۔ ملکی انتظام اور آداب زندگی کا ذکر ہوتا تھا۔

(۲) تفسیر جس میں قرآن کے نادر الفاظ کی شرح۔ اسباب نزول۔ تعارض کا حل۔ مشکل کی توجیہ، ناسخ و منسوخ کا بیان وغیرہ وغیرہ۔

(۳) سیر۔ جس میں رسول مقبول کی عادات شریفہ۔ آمد و رفت، جنگوں اور شواہد وغیرہ کا بیان۔

(۴) رقائق۔ جس میں رقت آمیز وعظ۔ دعائیں جنت دوزخ کا ذکر۔ عمل کی فضیلت صحابہ کرام کے اوصاف اور پرہیزگاری کا ذکر ہو۔

ان علوم کے حاصل کرنے والے علماء کی تقسیم اس طور پر کی گئی ہے۔

(۱) بعض ایسے علما تھے جنھوں نے ایک ہی فن میں مہارت پیدا کی۔

(۲) بعضوں نے دو میں۔

(۳) اور بعضوں نے تمام فنون میں۔

ضحاک بن مزاحم نے تفسیر، امام ابوحنیفہ۔ مالک اور شافعی نے فقہ۔ ابن اسحاق اور واقدی نے غزوات (جنگ نامے)، واعظوں اور صوفیوں نے رقت آمیز مواعظ تصنیف کئے۔ ابن عباس رض بہت سے علوں کے جامع تھے۔

صحابہ کرام میں عبداللہ بن عباس رض امام تفسیر۔ عمر رض۔ علی رض۔ ابن مسعود رض۔ ابن عباس رض امام فقہ تھے

اس زمانے کے بعد اور علما نے ان علوم پر غور و فکر کی نظر ڈالی لیکن ان کے پیش نظر صرف دو ہی چیزیں تھیں۔ قرآن اور حدیث۔ لہذا انھوں نے قرأت قرآن کے مختلف طریقوں پر کتابیں تصنیف کیں (جسے علم قرأت سبعہ۔ عشرہ وغیرہ کہتے ہیں)، ان میں سات یا اس سے زائد مذہب پیدا ہو گئے۔ چند مذاہب تو روایۃً حاصل کئے گئے اور بعض کا علم کلام عرب اور علم المخارج کے ذریعے سے ہوا۔ مصحف عثمانی کو سامنے رکھ کر انھوں نے قرآن کا رسم الخط ایجاد کیا۔

پہلے پہل ان علما نے بلا امداد غیرے احادیث کی جمع و ترتیب کا کام شروع کر دیا پھر ان کی گہری نظر نے دوسرے فنوں کی طرح ڈالی۔ (دوسرے فنون یہ ہیں)

(۱) وہ جو حدیث صحیح کو سقیم سے۔ مشہور کو غیر مشہور سے۔ معلول کو اس کے غیر سے ممتاز کر دے جیسے بخاری۔ مسلم۔ مستدرک حاکم۔ مسند احمد۔ ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی اور دار قطنی۔

(۲) وہ جو حدیثوں کو فقہ اور اس کے ابواب پر تقسیم کر دے۔ جیسے کتب شافعی۔ ابن ماجہ بیہقی۔ شرح سنہ وغیرہ۔

(۳) وہ جو حدیثوں کی تقسیم صحابہ کے لحاظ سے کرے اور یہ کتب مسانید کہلاتی ہیں۔ جیسے مسند ابی یعلی۔ مسند بزار وغیرہ۔

(۴) ایک فن اسماء الرجال کا ہے۔ (راویانِ حدیث کے ناموں کی تشریح) اس کے متعلق ضعیف و عادل کی بحث اور حدیث کے نادر الفاظ کی تشریح و توضیح۔

(۵) کتب احادیث کی ترتیب دوسری کتابوں کے نمونے پر جیسے احیاء العلوم کی ترتیب۔

(۶) کتب صحاح کے نمونے پر جیسے صحیح ابی عوانہ اور اسماعیلی۔

(۷) مشکل حدیثوں کی یادداشت۔ دو مختلف حدیثوں میں تطبیق۔ اور اصول حدیث کا بیان۔

(۸) متن حدیث کی شرح جیسے ابن حجر کی شرح بخاری پر۔ نووی کی مسلم پر اور اس کے علاوہ بہت سی شروح جو حد شمار سے باہر ہیں۔

(شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ " خدا کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے اسرار حدیث کی مجمل اور مفصل طور پر بیان کرنے کی توفیق عنایت کی۔ میں نے ان اسرار کو اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں جمع کر دیا ہے ")

پھر یہ علما مذکورہ چاروں علموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ خاص طور پر تفسیر کی طرف زیادہ توجہ کی اور ہر فن کے عالم نے تفسیر لکھی لیکن اس طرح پر کہ نحوی نے نحو کو۔ لغوی نے لغت کو۔ مؤرخ نے مناسب قصوں کو۔ قاری نے قرأت کو فقیہ نے فقہ کو۔ معانی جاننے والے نے معانی کو۔

کلام جاننے والے نے کلام کو۔ اور صوفی نے تصوف کو زیادہ دخل دیا۔ اس وجہ سے تصانیف کی کثرت ہوگئی اور ہر جگہ پھیل گئیں۔

اس کے بعد ان تمام فنون کو علما نے ایک جا جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ رازی، بیضاوی اور نیشاپوری نے ایسا ہی کیا۔

علم فقہ میں غور و فکر نے انھیں اس نتیجے پہ پہنچایا کہ اصول فقہ اور علم جدل یا معرفۃ خلاف کو مستقل علم کی صورت دے دی۔ لیکن ہونے والے واقعات چونکہ کسی خاص حد پہ پہنچ کر رک نہیں جاتے اس لئے متقدمین کی تصانیف کافی نہ ہوسکیں۔ لہذا نصوص کے ذریعے استنباط کیا فتاویٰ اور واقعات جمع کئے۔ پھر اقوال و اسباب کی باہمی ترجیح و اولیت کو پیش نظر رکھا۔ پھر علم المذاہب کی تحریر اور حکایت اقوال و اسباب کے یقینی ہونے کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر ہر فرقہ کی تائید میں عقلیات و نقلیات کے پیش نظر تصنیفات کیں۔

وہ مذاہب جن میں تخریج و ترجیح کو بکثرت استعمال کیا گیا تھا چار تھے۔

(۱) لوگوں کے دلوں کو پاکیزہ بنانے کے لئے دو طریقے اختیار کئے۔

(الف) وعظ و نصیحت اور رقت آمیز قصوں کو کتابی صورت میں مرتب کیا۔ منبروں پہ بیٹھ کر پر اثر وعظ کہنا شروع کیا۔

(ب) آخرت کو درست کرنے کے لئے چند قواعد کی بنا ڈالی اور انھیں (عام کتابوں کی طرح) فصلوں اور بابوں کی شکل میں مرتب کیا۔ جیسے احیاء العلوم (غزالی) صحابہ کرام تابعین، علما اور صوفیا کی تاریخ کی طرف توجہ کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے یا تو ہر ایک شیخ کی سیرت اور اس کے اقوال کو الگ الگ لکھا۔ ایسی کتابوں کو مقامات اور ملفوظات کہتے ہیں۔ یا سب کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ جیسے مشائخ چشتیہ۔ علما احناف یا ایک زمانہ اور ملک کے لوگوں کے حالات یکجا کئے۔ ایسی کتابوں کو طبقات کہتے ہیں۔ اس میں کچھ تو تاریخ اور کچھ حصہ اسماء الرجال کا شامل کر دیا گیا۔
اس خاکسار (شاہ صاحب) نے بھی اپنے محترم باپ۔ چچا اور بعض اور اہل حرمین کے چند حالات

کو اپنی کتاب انفاس العارفین میں جمع کیا ہے۔

(۲) بعض لوگوں نے اوراد وظائف میں۔

(۳) بعض نے حالات وکیفیات میں۔

(۴) بعض نے صوفیا کرام کے رموز (جو تغیر حالات کی صورت میں ہوتے ہیں) کے بیان میں کتابیں لکھیں۔

پھر خود صوفیا کرام ہی کے طریقت میں مختلف گروہ ہوگئے۔ اور ہر مسلک پر رسائل لکھے گئے۔

(الف) بعض نے آنحضرت صلعم پر درود شریف پڑھنے کے بابت کتابیں تصنیف کیں۔ جیسے دلائل الخیرات۔

(ب) بعض نے حزب اور مناجات لکھیں۔

جب مذہبی تشتت وانتشار ہوا۔ ٹکڑیاں الگ الگ بن گئیں اور انجام بحث ومباحثہ تک پہنچا۔ یہ مباحثہ معتزلہ۔ شیعہ۔ فلاسفہ اور اہل کتاب سب ہی کے درمیان ہوتا تھا۔ ان مباحثوں کی ضرورت کبھی نصرت دین کے خیال سے بھی ہوتی تھی۔ اس کے لئے باقاعدہ سوسائٹیاں قائم ہوئیں۔ لیکن (چونکہ یہ کوئی معمولی کام نہ تھا اس لئے) قطعی اصول وفروع۔ خوش بیانی اور خوش فکری کی بھی ضرورت تھی۔ اور اس کمال کا بغیر تعلیم وتعلم حاصل ہونا بظاہر ناممکن ہی سا ہے۔ لہذا علم کلام (اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے) مرتب کیا گیا۔

علم کلام کی ایجاد کی طرف سب سے پہلے معتزلہ نے توجہ کی۔ اس طرح پر کہ فلسفہ سے حدورسم۔ قیاس ومقولات عشرا اور الہیات سے امور عامہ کی بحثوں کو لے لیا اور اس کے ساتھ صفات۔ نبوت اور معاد کی شرعی بحثوں کو شامل کردیا۔ پس فلاسفہ کے وہ اصول جو شرعی قواعد کے خلاف نہ تھے انھیں باقی رکھا۔ اور جو ایسے نہ تھے انھیں نکال کر دوسرے اصول ان کی جگہ قائم کر دئے۔ علم کلام کو فلسفہ سے مستنبط کرنے کے یہی معنی ہیں۔

اہل سنت والجماعت میں سب سے پہلے جس شخص نے علم کلام کے بارے میں غور کیا وہ ابوالحسن اشعریؒ ہیں۔ مذہب اعتزال سے آپ کے رجوع کرنے کا قصہ مشہور ہے۔ نیز آپ جانتے تھے کہ اصول کس طرح بنائے جاتے ہیں اور پھر ان سے فروعات کس طرح اخذ کی جاتی ہیں۔ آپ اسی طریقے پر چلتے رہے۔

پھر ابونصر اور ابوعلی وغیرہ نے ان اصولوں کی جو اسلام کے مخالف تھے تاویل کر کے اسلامی قواعد کی صورت میں فلسفہ سے مطابقت دی۔ اس لئے مسلمانوں کو ان کے کلام کی نقل و تردید کی ضرورت ہوئی۔ علم کلام اسی طرح بڑھتا گیا۔ اس کی وسعت روز افزوں تھی۔ لیکن متکلمین کا قلبی تذبذب دور نہیں ہوا۔ وہ اسی کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے۔ نوبت بایں جا رسید کہ وہ علم کلام "حق صریح" سمجھنے لگے۔

جب اصحاب حدیث نے یہ دیکھا تو اہل سنت کے عقیدے کے موافق بہت سے رسائل لکھے اور ان میں صرف وہی حدیثیں لیں جن سے یہی مسائل استنباط ہوتے ہوں۔

صوفیائے کرام نے ابتداءً انھیں رموز و اشارات کی طرف توجہ کی جن کو حالات سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر حالات سے معارف کی طرف پیش قدمی ابن عربی اور آپ کے شاگرد صدرالدین (رحمہما اللہ) نے کی۔ اور اس وقت سے اس علم کی بہت سی شاخیں ہوگئیں جن کا تعلق علوم اشراقیہ سے ہے۔ اس لئے مثال۔ ناسوت اور لاہوت وغیرہ کا استعمال ان کی اصطلاح میں بہ کثرت ہوتا ہے۔ (شاہ صاحب فرماتے ہیں) کہ صوفیائے کرام کے نزدیک جس شخص نے سب سے پہلے لوح۔ قلم۔ امر اور خلق کا ان مذکورہ معانی پر اطلاق کیا ہے وہ فارابی ہے۔

پھر ان کے متبعین نے حسب ضرورت ہر باب کی طرف توجہ کی۔ باہم مناظرے بھی ہوئے

یہاں تک علوم شرعیہ کی تقسیم کا ذکر ہے

علوم حکمت | علوم حکمیہ کی حقیقت یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی اولاد جب زمین پر پھیلی اور متفرق گروہ ہو کر جدا جدا مقامات کو اپنا وطن بنایا۔ ہر خطہ میں ایک جماعت آباد ہوئی۔ ذہانت، تجربہ

اور اُن باتوں کی شناسائی کے اعتبار سے جن کا تعلق شہری اور خانگی انتظامات سے ہو اور ان کو بھی جن کا تعلق شائستگی نفس سے ہے نیز اُن نکات کو جن کا تعلق طب۔ ادویہ اور بیماریوں سے ہو اور ان کو بھی جو نجوم۔ کہانت۔ قیافہ اور حساب سے متعلق ہیں۔ نیز وہ نکات بھی جو جسمانی اور نفسی ریاضتوں کے سلسلے میں آتے ہیں۔

ان لوگوں میں جو صنعتیں بھی موجود تھیں وہ اجتماعی طور پر پائی جاتی تھیں۔ اسی لئے اگلے اور پچھلے گروہوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کا ان فنون کی طرف میلان نہ ہو بلکہ جن اطراف نے حکومت کی شکل اختیار کر لی اور وہاں ان علوم کے حاصل کرنے کا رواج بھی پڑ گیا۔ تو پھر ان علوم میں اُن کو اوروں سے زیادہ مہارت ہو جاتی تھی۔

فریدوں کے زمانے سے لے کر آنحضرت صلعم تک حکومت، فارس اور روم ہی میں پائی جاتی تھی اور وہاں کے حکما تمام باتوں سے زیادہ ان علوم کے حاصل کرنے کے جذبات اپنے اندر رکھتے تھے۔

اس امر پر اتفاق ہے کہ اسکندر سے تقریباً تین سو سال پہلے یونان میں لوگ بڑے عقلمند اور تحصیل علم کی خاطر بڑے صابر اور اس کے دلدادہ تھے۔ ان علوم میں خوب خوب داد فکر دی آخر علم طب کے ذریعے انھیں معدنی۔ نباتاتی اور حیوانی اشیاء۔ ان کے خواص اور ان کے افعال طبعی کا علم ہوا نیز اس علم نے ان کو اس طرف بھی متوجہ کیا کہ موالید ثلاثہ کے معجون مرکب جسم میں غذائیت اور نمو کے لحاظ سے طبیعت کیا کیا تصرفات کرتی ہے پھر انھوں نے فضائی اور معدنیاتی اشیاء وغیرہ کی تفتیش کی۔ آخر انھوں نے ان تحقیقات سے چند نکتے اور حکایتیں حاصل کریں جنھیں سمجھدار لوگوں نے محفوظ کر لیا اور پھر رسالوں کی شکل دے دی۔ علم نجوم نے انھیں سیارات کی تحقیق کی طرف متوجہ کیا اور چونکہ بغیر حسابی قاعدوں کے جانے اس کا یاد کرنا مشکل تھا۔ لہذا ان قواعد کو ترتیب دیا گیا تاکہ تحصیل علم نجوم کے لئے وسیلہ بن سکیں سلسلۂ تحقیق جاری رہا تا آنکہ ہیئت۔ ہندسہ اور حساب کا بھی فنون میں شمار ہونے لگا۔ مزید برآں ریاضت و عبادت نے جو انبیاء سابقین

سے حاصل ہوئی تھی ثمرات نفس کے معلوم کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ تدریجاً اس ادراک نے ترک دنیا اور معرفت تک پہنچایا۔ پھر ان حقائق کی لوگوں کو خبر دی نیز رسائل تصنیف کے جن کا ذکر کنایۃً ہو چکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی دلچسپیاں بڑھ گئیں۔ بحث و مباحثہ شروع ہو گئے یہاں تک کہ فن مناظرہ کے تمام حربوں کو استعمال کرنا پڑا۔

ارسطو جو کہ بہت ہی صائب الرائے متین۔ سنجیدہ اور جنگ وجدل سے متنفر تھا۔ جب اس کا زمانہ آیا تو اس نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ مباحث حد و برہان کی تشریح کر دی جائے۔ نیز شر وجدل اور برہان کا باہمی فرق بتلا دیا جائے۔ آخر اس نے قواعد کی وہ ترتیب رکھی جسے عقل باچون وچرا تسلیم کرے۔ اس کا یہ طریق عمل خلیل نحوی سے ملتا جلتا تھا جس نے عروض کو ایجاد کیا تھا۔

ارسطو نے کیا یہ کہ مذکورہ تینوں علموں کو علم طبعی سے الگ کر دیا۔ اور اس میں کچھ اور اضافہ کر کے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ترتیب دی۔

اس نے اشراقیوں کے کلام کو دیکھا جو مناقضہ۔ تعقید اور اضطراب سے ملو تھا۔ دیکھنے والے کو صاف معلوم ہو جاتا تھا کہ حد و برہان کی رعایت نہیں کی گئی ہے۔ تو اس نے ایک بہت کھلی اور مختصر بات کہہ ڈالی جس نے ترددات کا خاتمہ کر دیا۔ اگر اسکندر نہ ہوتا تو تصانیف کی یہ کثرت نہ ہوتی اور نہ لوگوں ہی کو اس طرف توجہ کا شوق ہوتا۔

بطلیموس علم ہیئت و نجوم کا بڑا ماہر تھا ان علوم میں اس کی تصنیفات بہترین ہیں۔

اقلیدس نے اپنے زمانے کے ایک بادشاہ کے لئے اصول ہندسہ میں ایک کتاب لکھی۔

بقراط طب کا ماہر تھا اس نے اسی فن میں بہت کچھ لکھا۔ جالینوس نے اس کی تشریح کی اور انتہائی حدود تک پہنچا دیا۔

دورِ جاہلیت اس حالت میں ختم ہوا کہ ان کے پاس یہ کتابیں اور رسائل تھے اور مصنفین کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ وہ ان کی تحصیل میں مشغول تھے۔ اور ان کے مباحث

میں اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔

موسیقی کے متعلق یہ خیال ہے کہ صناعات کے زمرے میں داخل ہے علوم میں نہیں۔ ہاں ایک جماعت نے جب دیکھا کہ مسائل کے منتشر ہونے کے باعث موسیقی کی تحصیل دشوار ہے تو انہیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک رسالے میں ان قواعد کو جمع کر دیا جائے لہٰذا اس فن میں کتابیں اور رسالے تصنیف کئے گئے۔

اس کے بعد حکما میں اس بات پر بحث و مباحثہ شروع ہو گیا کہ یہ کیا وجہ ہے کہ بعض نغموں سے سرور حاصل ہوتا ہے اور بعضوں سے نہیں۔ اسی طرح کی اور بہت سی باتوں کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ چونکہ اس قسم کی بحث کا تعلق حکمت سے ہے۔ لہٰذا یہ قرار پایا کہ موسیقی کو علوم حکمیہ میں داخل کر دیا جائے۔ جب اسلام کا دور آیا اور حنین نے کتب فلسفہ کو یونانی سے عربی میں منتقل کیا تو مسلمانوں نے اس کے انتشار و پراگندگی پر غور کیا جب ابو علی کا زمانہ آیا تو اس نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ اور بعض باتوں پر دونوں کا از خود اجماع ہو گیا۔ لیکن بعض باتوں میں شارع علیہ السلام کی مصلحتوں پر آگاہی نہ ہوئی۔ نہ سلسلۂ کلام کے مقصد پر۔ آخر اپنے اپنے طریقے پر جو سمجھ میں آیا بیان کرنا شروع کر دیا۔ ابو علی نے کتاب الشفا میں ان علوم کی ترتیب و تالیف پر بڑی خوبی کے ساتھ بحث کی۔ نیز حکمت نظری کو چار پر تقسیم کیا۔

(۱) منطق۔ اس میں نو ابحاث رکھیں۔

کلیات خمس۔ مقولات عشر۔ قضایا۔ قیاس۔ مباحث حد و برہان۔ خطابت۔ جدل۔ شعر اور مغالطہ۔

(۲) طبیعات۔ اس میں آٹھ ابحاث رکھیں۔

سماع الطبعی۔ کون و فساد۔ کائنات جو معادن۔ نباتات۔ حیوانات اور نفس۔

(۳) ریاضیات۔ اس میں چار بحثیں۔

ہیئت۔ حساب۔ ہندسہ اور موسیقی۔

(۴) الٰہیات۔ اس میں دو بحثیں۔

امور عامہ اور معرفت باری تعالیٰ و عقول۔

ختم کتاب پر اسرار شریعت کو بیان کیا جیسے جزا سزا۔ نبوت۔ عبادت۔ تدبیر منزل اور سیاست مدن۔

اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ابو علی سنے ذات باری۔ صفات اور کلام باری کے متعلق جو کچھ بحث کی ہے وہ بہت پھس پھسی ہے۔ اس لئے کہ محض ظن و تخمین سے کام لیا گیا ہے۔ طبعیات میں فلاسفہ کے کلام کا منشا عناصر و موالید میں اکثر حادثات کے اسباب کی تشریح ہوتی ہے۔ جن کا ظہور حد ہی ہوتا ہے

علوم محاضریہ | ضرورتاً یا رسماً انسانوں کے لئے یا اس لئے کہ انسانوں کا ایک گروہ ان سے دلچسپی لیتا ہے۔ جو قواعد کلیہ۔ مفید صنعتیں اور دلچسپ مکاتیب مرتب کی گئی ہیں۔ ان کا نام علوم محاضریہ ہے۔ انھیں میں سے بعض میں سے بعض علوم ایسے بھی ہیں جن سے اشیار کی پیشگی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ حوادثاتِ دنیا مثلاً فتح شکست۔ ارزانی و قحط وغیرہ کو ان کے آنے سے پہلے جاننے کے متمنی ہوتے ہیں۔ یہ علوم نجوم۔ کہانت۔ فال۔ خواب کی تعبیر رمل اور جفر وغیرہ ہیں۔

کچھ ایسے علوم بھی ہیں جن سے مزاج میں اعتدال اور بیماریوں کا دفعیہ ہوتا ہے اور اور ان کی ضرورت بالکل عیاں ہے۔ مثلاً طب۔ تعویذ اور پالو جانوروں جیسے گھوڑا۔ اونٹ بکری۔ گائے۔ گدھا۔ ہاتھی اور کبوتروں کا علاج۔

انھیں میں نادر صنعتوں کا شمار ہے جیسے تیراندازی۔ خوش خطی۔ کیمیا۔ موسیقی۔ طباخی اور کیسانی فنون حکمت بھی انھیں میں داخل ہیں۔

حکمت ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے عمدہ اخلاق۔ تدبیر منزل اور ریاست مدینہ کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ قدیم حکما واقعی اور فرضی حکایتیں و جنیوں اور پرندوں اور درندوں کی زبانی

اسی غرض سے مرتب کرتے تھے۔ پھر ان کی کوشش ان حکایتوں سے عجیب عجیب نکتے ہم پہنچاتی تھی۔

علوم محاضریہ میں . . . بادشاہوں راہبوں کے قصے عجیب وغریب حکایتیں۔ شہروں کے حالات۔ پہاڑوں اور درختوں کی کیفیات داخل ہیں۔

لغات کی معرفت یعنی ترکی۔ عربی۔ فارسی اور ہندی وغیرہ اور مختلف خطوں کی پہچان یہ بھی علوم محاضریہ کا ایک جزو ہے۔

قومی اشعار۔ ان کا طریقۂ تحریر۔ اشعار کی ترتیب اور خطوں کا طریقۂ تحریر۔ مذاہب اقوام ان کی کتابوں کی روایت۔ اور ان کے تراجم (جیسے یہودی۔ نصرانی۔ مجوسی اور ہندو) کا جاننا۔ ان سب کا شمار علوم محاضریہ میں کیا گیا ہے۔

ان اوراق میں جن امور کے تذکرہ کا ہم نے ارادہ کیا تھا یہ ان کا خاتمہ ہے۔ اول وآخر خدا ہی کے لئے تمام اوصاف لائق وزیبا ہیں۔

(فہرست ان علوم کی جن کو علماء عرب نے مرتب کیا یا ان میں اضافہ وتشریح کی۔)

علم لغت۔ علم مخارج۔ علم صرف۔ علم اشتقاق۔ علم الاعراب۔ علم تالیف۔ علم بدیع۔ علم عروض۔ علم قافیہ۔ علم خط۔ فقہ۔ تفسیر۔ سیر۔ رقائق (نصائح ومواعظ) تمیز صحیح۔ تقسیم حدیث فقہ وترجیح کے لحاظ سے۔ تقسیم حدیث صحابہ کے لحاظ سے۔ علم اسماء الرجال۔ جرح وتعدیل۔ تخریج۔ کتب احادیث۔ تخریج احادیث بطرز صحاح۔ ضبط احادیث مشکلہ۔ جمع احادیث مشکلہ۔ اصول حدیث۔ شروح کتب۔ اصول فقہ۔ علم جدل۔ معرفۃ الخلاف۔ علم الترجیح۔ فتاوی۔ علم المذاہب۔ علم الکلام۔ علم اخلاق۔ تدبیر منزل۔ سیاست مدن۔ طب۔ معرفت ادویہ۔ نجوم کہانت۔ قیافہ۔ حساب۔ ہیئت۔ موسیقی۔ علم القرأت۔ علوم محاضریہ (ان کے علاوہ اور بہت سے علوم عقلیہ ونقلیہ جن کی ایجاد یا ترقی وتجدید میں عربوں کو دخل ہے)۔ ۱۴۴۔

حکیم مولوی سیّد سعید احمد صاحب اسعدؔ ٹونکی مرحوم

حکیم صاحب سلف صالحین کی یادگار اور آخری عہد اسلامی کے تمدن کے علم بردار تھے۔ خاندانی علم وفضل کے ساتھ ذاتی فضل وکمال سے آراستہ، مروجہ علوم وفنون عربی وفارسی کے علاوہ فن طب اور اردو فارسی شاعری کے مسلم استاد تھے۔

آپ کے والد ماجد مولوی حکیم سید احمد علی صاحب سیمابؔ بن مولنا سید محمد علی صاحب واعظ رامپوری المتوفی ۱۲۰۵ھ خلیفہ تھے حضرت سید احمد صاحب بریلوی کے اور برادر خورد مولنا حکیم سید حیدر علی صاحب رامپوری کے آپ کا خاندان سادات بخاری سے تھا۔

ولادت ۱۲۷۰ھ ٹونک میں ہوئی، اپنے والد بزرگوار و دیگر اہل فضل وکمال سے جو ان دنوں ٹونک میں تھے علم وفضل حاصل کیا، ۱۳۰۰ھ میں بھوپال گئے۔ وہاں بڑے بڑے فضلاء سے تحصیل علوم وفنون کی۔ مثلاً قاضی شیخ محمد صاحب مچھلی شہری، شیخ حسین عرب صاحب یمانی وغیرہ فن طب میں کمال پیدا کیا، نباضی وتشخیص میں فرید عصر تھے۔ ذہانت، قوت حافظہ، طباعی اور ذکاء میں نظیر نہ رکھتے تھے۔ حواس کی ذکاوت وتیزی میں ضرب المثل تھے۔ علاج وطب میں وہ کمال تھا کہ دور دور کے لاعلاج مریض آتے، ایک مرتبہ ہاتھ رکھ کر پوری کیفیت بیان کردیتے تھے، اکثر امراض میں سول سرجن ان کی رائے ومشورے سے کام کرتا تھا۔ جرّاحی کے مشکلات میں خصوصاً ان کا مشورہ قابل قدر خیال کیا جاتا تھا۔ بہت سے معرکے کے علاج ایسے کئے اور مایوسوں کو ان کے ذریعے وہ شفا حاصل ہوئی جو زبان زد عوام وخاص ہے۔ برص ودیگر لاعلاج بیماریوں میں انگریز ان کے پاس آتے یا باہر بلواکر علاج کراتے اور اکثر کامیاب ہوتے تھے۔

۱۳۱۰ھ میں حج بیت اللہ کے لئے گئے اور ایک سال تک وہاں رہے جس میں اہل علم وفضل سے خوب صحبت رہی۔ شیخ احمد مغربی اور علامہ شیخ محمد سہارنپوری وغیرہ سے خاص اتحاد

والفت تھی۔ عرب کے قبائل سے بھی آمد و رفت اور تعلقات و روابط پیدا کئے، وہاں طب کی وہ خواہش و قدر دیکھی کہ حد بیان سے باہر۔

اخلاق و عادات میں نہایت منکسر المزاج، سادہ اور رحم دل تھے۔ خلق خدا کی نفع رسانی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرتے، غریب و امیر سب کو ایک نظر سے دیکھتے۔ بلکہ غربا کا زیادہ خیال کرتے تھے، مریض کو دیکھ کر اگر قابل علاج ہوتا علاج کرتے اور غریبوں سے کبھی فیس نہ لیا کرتے۔ بلکہ اپنے پاس سے کچھ خدمت کر دیتے تھے۔ اگر لا علاج مریض آتا تو صاف طور پر اس کے علاج سے دست بردار ہو جاتے اور اکیلے میں کہہ دیتے کہ اس میں کچھ حالت نہیں، اتنی مدت کا یہ مہمان ہے۔ اسے فلاں نسخہ استعمال کراؤ۔

ریاست سے جاگیر و تنخواہ تھی مگر دربار میں زیادہ آمد و رفت نہ رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں سادگی کے ساتھ خودداری استغنا اور سچائی بہت تھی۔ مال و زر کی طمع مطلق نہ تھی، اس لئے ایسے تمام مقامات سے جہاں دین کو دنیا پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ بہت پرہیز کرتے تھے ہمیشہ اہل علم و فضل سے محبت و مودت کا سلسلہ قائم تھا۔ مولانا سید عرفان صاحب مرحوم اور ان کے بھائی مصطفیٰ میاں مرحوم نبیرگان سید احمد صاحب بریلوی سے خاص اخلاص تھا، اتباع سنت میں خاص کوشش کرتے اور اہل توحید سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اکابر و فضلا کے حال ہر مجلس میں اس طرح بیساختہ بیان کرتے تھے کہ گویا کوئی محفوظ چیز دہرائی جاتی ہے۔ ایسا خوش بیان قوی الحافظہ بہت کم دیکھا گیا۔

۱۳۲۲ھ سے ایک آنکھ میں پانی اتر آیا تھا، پھر دوسری میں بھی۔ ۱۳۲۵ھ میں ایک آنکھ بنوائی جو کچھ دنوں کے بعد خراب ہو گئی، دوسری آنکھ ۱۳۲۸ھ میں بنوائی مگر وہ تیار نہ تھی۔ اس کے بنوانے میں بیحد تکلیف ہوئی اور جو کچھ بصارت تھی وہ بھی جاتی رہی، اس سے سخت صدمہ پہنچا اور زندگی سے دل تنگ ہو گیا، خصوصاً نماز کے اوقات کی معرفت نہ ہونے پر سخت افسوس کیا کرتے تھے!

فارسی۔ طب وغیرہ میں بہت سے شاگرد چھوڑے۔ جن میں حکیم سید یحییٰ میاں خلف اکبر اور سید احمد میاں نواسہ طب و فارسی میں اور مولوی سید شرف الدین صاحب، مولوی عبدالرحمٰن صاحب فارسی میں۔ سید عیسیٰ بسمل منجھلے صاحبزادے شعر و شاعری میں خاص کر قابل ذکر ہیں۔ تاریخ نکالنے میں خاص مہارت رکھتے تھے، بہت لوگ اس فن میں بھی ان سے تلمذ رکھتے ہیں، حافظ عبیداللہ البصیر کو خاص کمال حاصل ہوا ہے۔ جناب حکیم صاحب کی پہلی اہلیہ سے دو یادگار ایک لڑکا ایک لڑکی باقی ہیں اور دوسری زوجہ سے پانچ اولاد تین لڑکے اور دو لڑکیاں زندہ و آباد ہیں

تالیف کی طرف بہت کم توجہ تھی بعض کتب تاریخ وسیر کا ترجمہ کیا ہے، اصحاب بدر کے حالات میں ایک کتاب تیار کی تھی جو اب تک شائع نہ ہوسکی، فارسی، اردو کی نظموں کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے جن کی بابت کوشش ہو رہی ہے کہ یکجا جمع کر دی جائیں۔

وفات سے عرصہ قبل اطلاع دیتے تھے کہ اب میں پانچ چھ ماہ کا مہمان ہوں، اور ایسا ہی ہوا۔ گذشتہ سال ذوالقعدہ ۱۳۹۵ھ میں جب میں نے عبداللہ میاں کی والدہ کو بلانا چاہا تو ان سے فرمایا "بیٹا میں چاہتا تھا تم یہاں رہو، تو مولوی میاں میری وفات کے وقت یہاں آجائیں گے، اور میری نماز جنازہ پڑھائیں گے، مگر اب تم جاتی ہو اللہ حافظ! انشاءاللہ حشر کے میدان میں ملیں گے۔ میں اب پانچ چھ ماہ کا مہمان ہوں"۔ ایسا ہی ہوا۔ ۲۹ ربیع الآخر ۱۳۹۶ھ اتوار کے روز عصر کے وقت دار فانی سے دار باقی کی طرف رحلت کر گئے اور ام عبداللہ بیماری کی وجہ سے ٹونک نہ پہنچ سکیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وفات سے قبل خود اپنی تاریخ اس طرح لکھ گئے گویا غیب سے اطلاع مل چکی تھی، اور اور اس کا پورا یقین ہو چکا تھا۔

تاریخ ہے سرّی میری رحلت کی بجا ۔۔۔ بھولے سے الف سر لکھ دیکھو تحیا دلجما خاتم تسبیل

ایک صوری دعائیہ بیابد غفراں ۔۔۔ اک اور ہے۔ ربی بادر ضواں بجا

علی حزیں کے قطعہ پر فارسی میں یہ قطعہ بھی لکھوایا ملاحظہ ہو۔

بود ایں جائے یا رب قطعۂ از روضۂ رضواں سعید خستہ ہشتاد و سالہ آرمید اینجا
بشوق قرب مولیٰ از قلق دارہ می گشتم سرم بر آستاں بارگاہ او رسید اینجا

قطعہ تاریخ وفات از جناب مولوی حکیم سید میر حسن صاحب سہا نقوی دہلی

طبع سہا ز کثرت رنج و ملال و غم تاریخ گفت طوطی فضل و ہنر نماند
تاریخ انتقال بگوشم سروش گفت آں منبع عطا شجر بارور نماند

قطعہ تاریخ وفات از صاحبزادہ یٰسین محمد خاں صاحب طالب

تھی جو تاریخ ولادت مصدر فیض ولی ۱۲۷۰ اس لئے ہر فیض میں ہر خیر میں تھا نیکنام
خاتم فیض؛ اس کا پایا عیسوی سال وفات ۱۹۳۱ دفتر فیض و سخا کا مٹ گیا عالم سے نام
تھا ربیع الثانی اور تاریخ تھی انتیسویں ۲۹ چھپ گیا زیر زمیں وہ علم کا ماہ تمام
یک ہزار و سہ صد و پنجاہ سن ہجری تھے اور روز یکشنبہ تھا وقت عصر جب آیا پیام

بیداری کا انعام

(۱)

بھیجا مائی اللہ کے نام پر!

یہ تھی وہ آواز جو فضا پر رات کی تاریکی مسلط ہوئی ہو" گلی قاسم جان " کے ایک بلند مکان کی ڈیوڑھی پر محمود کے منہ سے پہلی مرتبہ نکلی، جب اس کی بھوک اور ضمیر میں زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ بھوک کا تقاضہ تھا کہ جس طرح بھی میسر آئے " تنور شکم " کو پر کرو، غیرت کہتی تھی کہ دوسرے کے آگے دست سوال دراز کرنے کے مقابلے میں مرجانا بہتر ہے۔ آخر پیٹ کی آگ کے شعلوں نے دامن غیرت کو داغدار کر دیا۔ اور محمود اندھیری رات کا سیاہ نقاب چہرے پر ڈال کر ایک شاندار مکان کے سامنے سے گذرا جس کے برآمدے میں چند خوش باش احباب اپنے لمحاتِ فرصت سے اطمینان کے ساتھ فائدہ اٹھا رہے تھے۔

درمیان میں خوبصورت بیضوی میز پڑی ہوئی تھی جس کے چاروں طرف کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میز پر " سوڈا واٹر " کی چند بوتلیں اور بادۂ ناب سے بھرے ہوئے متعدد کانچ کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ قہقہے کی مسلسل صدائیں دروازوں کی چقوں کو چیر کر سڑک پر آرہی تھیں اور بجلی کے قمقمے اپنی پرنور شعاعوں سے راستے کو روشن کر رہے تھے۔ محمود آہستہ آہستہ برآمدے کے سامنے آیا، اس نے یہ منظرہ دیکھا اور اپنی گذشتہ زندگی پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر سر سے پیر تک لرز گیا: .... کاش نوجوانوں کا بے پرواگروہ جو آئندہ چل کر سیکڑوں نفوس کی بربادی کا باعث ہوگا۔ مجھے دیکھ کر عبرت حاصل کرتا اور سمجھتا کہ زہر کے یہ خوش رنگ پیالے انسان کو دنیا میں کسی کام کا نہیں رکھتے۔

اس نے چاہا کہ ان کو اپنی شکستہ حالی پر متوجہ کرے اس کے لبوں میں حرکت کے آثار

پیدا ہوئے۔ زبان نے جنبش کرنے کا ارادہ کیا لیکن الفاظ نے ساتھ نہ دیا اور اس کا وہ سوال جو حمیت کے خون کو کھولا تا ہوا لب تک آنا چاہتا تھا دل کا دل میں رہ گیا۔ وہ تیزی سے چلنے لگا اور عجلت کے ساتھ پچاس ساٹھ قدم چلنے کے بعد پھر ہمت کر کے وہ ایک دروازے پر رُکا اور چاہتا کہ سوال کرے لیکن خاندانی وجاہت، باپ دادا کی عزت و شہرت نے اس کے دامن کو جھٹکا دے کر کہا۔ محمود کیا محض ایک روٹی کے لئے یا تانبے کے چند سکوں کے معاوضے میں اپنی خاندانی نام و نمود کو فروخت کرے گا! پیٹ نے کہا ضرورت میں سب کچھ جائز ہے حاجتمندی گناہ کو بھی ثواب کر دیتی ہے لیکن ضمیر نے کہا غیرت مند اشخاص کے لئے "موت" دنیا کے تمام آلام کا بہترین علاج ہے۔ مگر زندگی آہ سب سے زیادہ عزیز اور قیمتی چیز! کیا ممکن ہے کہ میں اس کو اپنے ہی ہاتھوں تباہ کر دوں۔ دو منٹ توقف کرنے کے بعد وہ اس دروازے سے بھی گزر گیا جو خطرہ بار بار پیش آتا ہے انسان اس کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ اس سے کوئی اندیشہ محسوس نہیں کرتا۔ محمود کے سامنے دو مرتبہ غیرت و ضرورت کی کشمکش ہو چکی تھی، ضرورت بڑھ رہی تھی اور غیرت اسی اعتبار سے مغلوب ہو کر کمزور ہو رہی تھی۔ جس طرح آگ کی معمولی سی چنگاری پر بہت سی لکڑیاں ڈال دی جاتی ہیں اور وہ ان کے وزن سے دب کر خود ہی بجھ جاتی ہے۔ اسی طرح ضرورت کے بوجھ سے محمود کی غیرت دب گئی تھی اب اس میں تاب نہ تھی کہ وہ ضرورت کے مقابلے میں صف آرا رہ سکے۔

محمود پھر ایک دروازے پر رُکا اور ڈیوڑھی میں منہ ڈال کر پوری قوت سے آواز بلند کی "بھیجنا بائی اللہ کے نام پر!"

گھر میں سے آدمیوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں برتنوں کی جھنکار محمود کے کانوں میں پیام امید پہنچا رہی تھی مگر اس کی پہلی صدا بیکار ثابت ہوئی اس نے چاہا کہ اب اس دروازے کو چھوڑ کر آگے بڑھ جائے، لیکن پھر بھی اسی ناگوار فرض کو انجام دینا تھا پھر یہیں کیوں نہ اس کی تکمیل کر لی جائے۔ اس نے پھر اپنے لہجے میں سائلانہ لوچ پیدا کر کے وہی "صدائے طلب"

بلند کی چونکہ اس مرتبہ وہ ذرا دلیر بھی ہو گیا تھا، غیرت کا نشہ پہلی آواز کے بعد کچھ کم ہو چکا تھا اس لئے اس مرتبہ اس کے حلق نے خوب کام دیا، اگرچہ آواز میں فن سوال کی پوری مہارتیں مجتمع نہ تھیں ــــ وہ سوال کرنے کے بعد تھوڑی دیر تک منتظر رہا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا، اس نے ہمت کر کے تیسری مرتبہ پوری قوت سے اسی سوال کو دہرایا مگر اس کا جواب پھر نہایت تلخ اور دل شکن تھا اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا "چلو ــ آگے بڑھو کیوں کان کھاتے ہو!"

محمود کی غیرت و حمیت پر یہ ایسی کاری ضرب تھی کہ اگر امید اس کا ساتھ نہ دیتی تو وہ اس سے زیادہ بے غیرتی پر آمادہ نہ ہوتا۔ وہ دروازے کی سیڑھیوں کو طے کر کے سڑک پر آیا اور اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ اب کیا کرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ دنیا میں جہاں تنگ نظر اور کم ظرف لوگوں کی کثرت ہے وہاں ارباب خیر اور صاحبان ہمت کی بھی کمی نہیں، بدقسمتی سے مجھے پہلی مرتبہ نہایت ناپاک نفوس سے واسطہ پڑا کہ انھوں نے مجھے عام سائلوں کی طرح جھڑک دیا اور اُن کے بے درد قلوب میری درد بھری آواز سے متاثر نہ ہوئے جو بہت حد تک میری قلبی کشمکش اور دماغی کوفت کی آئینہ دار تھی لیکن بہت ممکن ہے کہ آئندہ اس کی تلافی ہو جائے۔ جب یہ حرکت کی ہے تو مقصد حاصل ہونے سے پہلے اس کو چھوڑ دینا دانشمندی نہیں، پھر بھوک بھی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھی اور اب یہ عالم تھا کہ شدت گرسنگی سے پاؤں اٹھانا بھی مشکل تھا۔

جہاں تک اس کے پیروں کی قوت نے اجازت دی وہ چلتا رہا دس پندرہ منٹ گزر جانے پر وہ ایک موڑ پر کھڑا ہوا چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ قریب کے دروازے میں کسی شخص کے داخل ہونے کی آہٹ ہوئی وہ اس دروازے کے پاس پہنچا اور اس نے پھر ایک مرتبہ وہی آواز بلند کی، تقریباً دو منٹ کے بعد ادھیڑ عمر کا ایک آدمی جس کے چہرے سے شرافت و نرم دلی نمایاں تھی ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں گرم گرم پلاؤ کی پلیٹ لئے ہوئے باہر آیا اس نے سر سے پیر تک محمود کو دیکھا اور ایک خاص شفقت کے ساتھ پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے

کہا: یہ لو اس کو یہیں بیٹھ کر کھا لو۔

محمود کا سر چکرانے لگا۔ اس کا دماغ معطل ہو گیا۔ سارے بدن میں آگ سی جلتی ہوئی معلوم ہونے لگی اور اسی حالت میں اس کا ہاتھ پہلی بار اس کھانے کو لینے کی غرض سے اٹھا جو دو گھنٹے کی گداگری کے بعد حاصل ہوا تھا اگرچہ اس کا ضمیر اب بھی اس بزدلی پر ملامت کر رہا تھا مگر اس وقت اس نعمت غیر مترقبہ کو ٹھکرا دینا ویسا ہی تھا جیسے گلا کٹ جانے کے بعد جینے کی آرزو کرنا اس واسطے چارو ناچار اس نے رکابی لے لی اور کھانا شروع کر دیا ــــ چار وقت کا فاقہ اور اس پر مزیدار پلاؤ کے بڑے بڑے لقمے ــ تھوڑی ہی دیر میں اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ صاحب خانہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا دفعۃً پلیٹ اس کے ہاتھ سے گرتی دیکھ کر اس کے حواس پریشان ہو گئے۔

محمود کی گردن ڈھیلی ہو کر ایک طرف کو لٹک گئی اگر وہ چوکھٹ کے سہارے نہ بیٹھا ہوتا تو اس کے گر جانے میں کوئی شک نہیں۔

ارے کیا تم بیمار تھے! صاحب خانہ نے نبض پر ہاتھ رکھا، کمزوری چہرے ہی سے ظاہر تھی۔ پھر بیہوشی میں نبض کا ساقط ہو جانا کوئی تعجب خیز امر نہ تھا، ذرا سی دیر میں محمود کے چاروں طرف گھر کے آدمیوں کا ہجوم ہو گیا۔ کوئی منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا، کوئی چائے کی پیالی لئے کھڑا تھا کسی کے ہاتھ میں پنکھا تھا کوئی شانہ جھنجوڑ کر اسے ہوشیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سب کو یہی خیال تھا کہ اس طرح ان کے دروازے پر دم توڑ دینا قیامت سے کم نہیں۔ نہ معلوم کیا الزام لگایا جائے۔

محمود کے منہ سے نحیف سی آواز نکلی "پانی" ــــ فوراً پانی حلق میں ڈالا گیا۔ خدا خدا کر کے محمود اٹھ کر بیٹھا، اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

صاحب خانہ کے سخت اصرار پر اس نے صرف اتنا کہا کہ میں چار وقت کا بھوکا ہوں اس سے زیادہ اپنا کوئی حال ظاہر نہیں کیا۔ یہ معلوم ہو جانے پر کہ محمود کی غشی نتیجہ تھی سخت بھوک میں

دفعتہً ثقیل غذا کے معدے میں پہنچ جانے کا، اس کے واسطے چائے اور انڈوں کا انتظام کیا گیا۔

(۲)

میرٹھ کے مشہور رئیس اور ممتاز دولتمند "قاضی اشفاق حسین" کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، ان کی پاک طینتی، ان کا بے ریا اخلاق، اور ان کی مخلصانہ قومی خدمات ایسی نہ تھیں کہ ہندوستان کا کوئی آدمی ان کے نام کے ساتھ لفظ "مولانا" کا اضافہ نہ کرتا ہو۔ وہ شہر کے سب سے بڑے تاجر اور سربرآوردہ بزرگ تھے۔ ان کا عالیشان محل شاہ پیر دروازے میں مرجع انام تھا۔ روزانہ شام کے وقت ان کے دروازے پر سائلوں کا ہجوم ہوتا اور قاضی اشفاق حسین اپنی نورانی داڑھی میں کنگھا کرتے ہوئے گھر سے برآمد ہوئے، ہر طرف سے دعاؤں کا شور پیدا ہوتا اور ہر ضرورت مند قاضی صاحب کی فیاضی سے فائز المرام ہو کر واپس جاتا۔

عام طور پر مشہور تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا نصف حصہ غربا پر تقسیم کر دیتے ہیں ممکن ہے کہ اس میں تھوڑا بہت مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کے سینے میں ایک ایسا درد مند دل تھا جو ابنائے جنس کی غربت و افلاس اور بیکسی و بیچارگی پر ہر وقت تڑپتا رہتا تھا اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ نہایت مخیر، کریم النفس اور پاک خصلت آدمی تھے۔

قاضی اشفاق حسین کے بہت دن تک کوئی اولاد نہ ہوئی اور دولتمند ہو کر بھی وہ اگر کسی چیز کے لئے بے چین رہتے تھے تو صرف اولاد کے لئے ان کے احباب نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ عقد ثانی کر کے اپنے دامن آرزو کو گوہر مقصود سے پر کر لیں لیکن بیوی سے انھیں غیر معمولی محبت تھی وہ ہرگز یہ نہ چاہتے تھے کہ اپنی دہ سالہ رفیق زندگی کو صدمہ پہنچا کر اپنی تمنا حاصل کریں وہ اس قسم کے مشوروں پر باوجود بیحد خلیق اور متحمل مزاج ہونے کے چیں بر جبیں ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ اولاد کی آرزو اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب دوسری شادی کی جائے تو وہ چہرہ پر غصے کے آثار نمایاں کر کے کہتے، یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ میں اپنا دل خوش کرنے کی غرض سے اس غریب کو ایک دائمی اذیت میں مبتلا کر دوں۔ جو میری ذات پر سب

سے زیادہ اعتماد رکھتی ہو اور پھر اس کی کیا ضمانت ہو کہ عقد ثانی کے بعد میں صاحب اولاد ہو جاؤنگا اگر اس وقت بھی قسمت نے ساتھ نہ دیا تو میرے لئے تو دنیا جہنم ہو جائے گی۔

واقعہ یہ ہو کہ قاضی صاحب میں جملہ اوصاف انسانی بدرجہ کمال موجود تھے اور سب خوبیوں کے ساتھ قدرت نے انھیں مستقل مزاجی بھی غضب کی عطا فرمائی تھی اگر ان کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس کا متزلزل ہو جانا یقینی تھا لیکن یہ قاضی صاحب ہی کا دل گردہ تھا کہ انھوں نے اس طرف ذرا توجہ نہ کی اور موجودہ بیوی کے ساتھ اپنے "پیمان وفا" کو کبھی سست نہ ہونے دیا۔

دنیا میں صرف استقلال ایسی چیز ہے جس سے ہر نوع کی تکالیف کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص حقیقی مسرتیں حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس کو پہلے مستقل مزاج بننا چاہئے، قاضی صاحب کا اصولِ زندگی ہی یہ تھا کہ وہ ہر معاملے میں مستقل اور ثابت قدم رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی زندگی میں ناکامی سے وہ ہمیشہ ناواقف رہے۔ چنانچہ اس معاملہ خاص میں بھی قدرت نے ان کا ساتھ دیا۔ اور شادی کے پورے چودہ سال بعد ان کی بیوی کے بطن سے ایک نہایت خوبصورت اور تندرست بچہ پیدا ہوا جس کو "محمود حسن" کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اگرچہ قاضی صاحب نے محمود کی تربیت میں نہایت بیدار مغزی اور احتیاط سے کام لیا اور اور اس میں شک نہیں کہ اگر ان کا سایہ محمود کے سر سے نہ اٹھتا تو وہ دنیا میں بہترین اوصاف کا انسان ہوتا لیکن خدا کو منظور نہ تھا کہ محمود کی زندگی "حیات پدر" کا جواب ہو اور اس طرح ایک بے نظیر چیز کی مثال اس کی قیمت کو کم کر دے۔

محمود ابھی آٹھ سال ہی کا تھا کہ قاضی صاحب کا انتقال ہو گیا، اولاد سب سے زیادہ جس عمر میں ماں باپ کے التفات کی محتاج ہوتی ہے حقیقتاً وہی عمر ہے اس عمر میں بچہ کے اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے اور اس کا سنگ بنیاد ماں باپ ہی کے ہاتھ سے رکھا جاتا ہے اگر بنیاد کو کافی مستحکم نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ عمارت پائدار نہ ہوگی جس طرح باغ کا سر سبز پودا جس کی جڑیں زمین میں اچھی طرح پیوست نہیں ہوئیں، اور جو اپنی غذا جذب کرنے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا، مالی

کی معمولی سی غفلت سخت شک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ہونہار بچہ کی اخلاقی حیثیت بالکل تباہ ہو جاتی ہے اگر اس کی ابتدائی تربیت پر کافی توجہ نہ کی جائے۔

قاضی صاحب کے مرتے ہی ان کے گھر کا رنگ بدل گیا۔ گھر میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو ان کی مسند پر بیٹھتا اور ان کا صحیح جانشین ہوتا۔ اس لئے محمود کی ماں نے اپنے بھائی کے لڑکے "بشیر حسن" کو بلا کر اپنے یہاں رکھ لیا اور کاروبار کی نگرانی اس کے سپرد کر دی۔

بشیر ابھی نوجوان تھا اگرچہ اس کی تعلیم بہت اعلیٰ نہ تھی تاہم جس اہلیت کا آدمی اس کام کے واسطے موزوں ہو سکتا تھا وہ قریب قریب اس میں موجود تھی اس نے آتے ہی تمام کاروبار تجارت پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اور نہایت دانشمندی سے جملہ امور کی نگرانی کرتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آمدنی میں کسی قسم کی کمی نہ ہوئی بلکہ بحیثیت مجموعی بشیر کی موجودگی سے قاضی صاحب کی تجارت کو فروغ ہو گیا۔

قاضی صاحب زیادہ تر چمڑے کی تجارت کرتے تھے چمڑے کی شناخت اور اس کی خرید فروخت میں بشیر کو پہلے سے کافی مہارت حاصل تھی چنانچہ میرٹھ ایسے شہر میں جہاں یہ کاروبار کسی فن کے نقطۂ نگاہ سے نہیں کیا جاتا۔ بشیر بہت زیادہ کامیاب ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ بشیر قاضی صاحب کی تجارتی حیثیت کے لحاظ سے ان کا بہترین جانشین تھا لیکن دوسرے اوصاف اس میں بالکل مفقود تھے۔

خصوصاً محمود کی تربیت سے وہ مجرمانہ تغافل روا رکھتا تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بشیر نے شروع ہی سے محمود کو ایک زبردست حریف سمجھا اس لئے ابتدا ہی سے یہ انتظام کیا کہ اس کی دماغی قابلیتوں پر جہالت کا پردہ پڑ جائے تاکہ وہ جوان ہو کر بھی بشیر سے بے نیاز نہ ہو چنانچہ اس نے محمود کو لہو و لعب میں مشغول کر دیا۔ تھیٹر۔ سینما رقص و سرود کی طرف اسے متوجہ کیا۔ یہ چیزیں محمود کے لئے بے انتہا جذب و کشش کا سامان رکھتی تھیں، اس کی نگاہوں میں یہ قوت نہ تھی کہ وہ ان کے تاریک پہلو تک پہنچ سکیں۔ وہ صرف ظاہری سطح کو دیکھتا تھا جو ایک زبردست قوت تسخیر کی حامل تھی۔

تھوڑے ہی دنوں میں محمود میرٹھ کی اوباش جماعت کا ایک سرگرم رکن بن گیا۔ اس کی ماں نے بہت کوشش کی کہ محمود کی اصلاح ہو جائے۔ لیکن اس کی ہر کوشش بشیر کی تائید و

امداد کی محتاج تھی اور اس کا یہ عالم تھا کہ وہ دانستہ اس معاملۂ خاص میں کوتاہی کرتا تھا اور محمود کی گم کردہ راہی کو اپنے لئے نشانِ منزل سمجھتا تھا۔ محمود کی ماں جب زیادہ پریشان ہوتی تو وہ کہہ دیتا کہ محمود قاضی صاحب کی تنہا نشانی ہے۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں اس پر سختی کر دوں۔ اور تکلیف پہنچا کر اس کے اخلاق کو درست کر دوں، یہ وہ حربہ تھا جو مخصوص طور پر ایک عورت کے جذباتِ محبت کو برانگیختہ کرنے کی غرض سے استعمال کیا جاتا تھا اور اس کی کامیابی یقینی تھی۔

تمام کاروبار پر بشیر حاوی تھا۔ محمود کو مہینے میں بلا کسی محنت و کاوش کے اتنی رقم مل جاتی تھی جو اس کے دلچسپ مشاغل کے لئے کافی ہوتی تھی۔ پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ محمود مفت میں یہ دردِ سر مول لیتا اس نے اس طرف کبھی توجہ ہی نہ کی۔

محمود کی عمر کے ساتھ ساتھ بشیر کی حرص بھی بڑھ رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ محمود کا شباب اس کے لئے مایوسی و نامرادی کا وہ پیام لا رہا ہے جو ایک دن اس کو دولتمندی کی اس بلند مسند سے نیچے اتار دے گا۔ اگرچہ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ محمود کو اتنا ہوش کبھی نہ آئے گا کہ وہ اس کی عیارانہ چالوں سے آگاہ ہو۔ لیکن یہ بھی مقتضائے عقل و دانش کے خلاف تھا کہ بشیر محض اسی خیال کی بنا پر اپنے مستقبل سے غافل رہے۔

بشیر نے دور بینی کے لحاظ سے اپنا سرمایہ محفوظ کرنا شروع کیا۔ تمام نقد روپیہ اس کی تحویل میں رہتا تھا اور مہینے میں دو چار ہزار کی رقم الگ کر لینا کوئی مشکل کام نہ تھا، بشیر کی طمع اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس نے اعتدال سے کام لینا بھی چھوڑ دیا اور وہ بڑی بڑی رقموں پر غاصبانہ نگاہیں ڈالنے لگا جس کا انجام یہ ہوا کہ سرمایہ کم ہونے لگا جس کے باعث تجارت میں بھی انحطاط کے آثار نمایاں ہوئے۔ رفتہ رفتہ بشیر کی تجارت بالکل گر گئی اور وہ اپنی ساکھ قائم نہ رکھ سکا۔ بعض مطالبوں میں قاضی صاحب کے چند مکانات بھی قرق ہو گئے۔ آخر میں مجبوراً بشیر نے ایک دیوالئے کی حیثیت سے اپنا کاروبار بند کر دیا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ بشیر اپنا دامن بچا کر محمود سے جدا ہو جائے چنانچہ اس نے محمود کی ماں سے کہا کہ یہ کام اب میرے بس کا نہیں جب تک ہو سکا میں نے

آپ کی خدمت میں کوتاہی نہیں کی۔ اب میں قطعاً مجبور ہوں، روپیہ پیسہ میرے پاس بالکل نہیں ہے اور قرض خواہ ہر طرف سے مجھ پر زغہ کر رہے ہیں۔ دوکان کو بند ہوئے آج ایک ہفتہ ہوگیا۔ میں کسی صورت سے آپ کے یہاں قیام نہیں کر سکتا۔ میری رائے میں آپ کے پاس جس قدر نقد سرمایہ ہو اس کو محفوظ کر لیجئے اور غیر منقولہ جائداد کو فروخت کر کے قرض ادا کرنے کی تدبیر کیجئے۔ اس بعد جو کچھ بچے اس کو اپنے مصارف اور گذر اوقات کی غرض سے اپنے قبضے میں رکھئے تاکہ محمود کو اس پر دست درازی کا موقعہ نہ ملے۔

محمود کی شادی ہو چکی تھی، مگر اس سے اس کی زندگی میں کوئی خوشگوار انقلاب نہ ہوا تھا۔ بلکہ ناپاک صحبتوں کے اثر سے وہ "بادۂ ناب" کے جرعۂ تلخ کو بھی سرمایۂ نشاط تصور کرنے لگا تھا۔ اس سلسلے میں اس کی فضول خرچیاں حد سے تجاوز ہو چکی تھیں، آتش سیال کی پرستش کے واسطے جس ماحول کی ضرورت ہے وہ محمود نے پیدا کر لیا تھا۔ اس کے گھر میں ہر وقت ایک ہنگامۂ رقص و سرود اور محشر نائے و نوش بپا رہتا تھا۔ اس کی ماں نے بہت سعی کی کہ محمود کے سر سے یہ سودا نکل جائے اور وہ اس خطرناک وادی سے نکل کر منزل حیات کے جادۂ مستقیم پر گامزن ہو لیکن جس دماغ میں بیابان کا مفہوم "جنستان عشرت" اور بربادی کا ترجمہ "نشاط زندگی" ہو اس پیکر جنون و جہالت کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔ اگرچہ وہ غریب اپنے مقصد اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن اپنی جان اس نے اس کے نذر کر دی۔

ماں کے مرنے پر گھر کے سب اختیارات محمود کو حاصل ہو گئے۔ اس کی بیوی "ربیعہ" میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ شوہر کی کجروی پر زبان اعتراض دراز کر سکے۔ اس کو اب نہ موعظت کی تلخ گفتاریوں کا اندیشہ تھا نہ ناصحانہ جھڑکیوں کا خوف۔ وہ گھر میں بھی آزاد تھا باہر بھی آزاد ربیعہ چونکہ بالکل تنہا رہ گئی تھی اس کی غمگسار ساس باقی نہ تھی کہ اپنی مشفقانہ باتوں سے اس کا غم غلط کرتی رہے اس لئے وہ محمود سے اجازت لے کر اپنے بھائی کے پاس چلی گئی۔ جو پنجاب میں کسی جگہ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ ربیعہ کے جاتے ہی محمود اور زیادہ بے لگام ہو گیا اگرچہ

اس پر بظاہر ربیعہ کا کوئی اثر نہ تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کی موجودگی میں وہ بعض چیزوں کو خاص اس کی ملک سمجھتا تھا۔ اب ان سب پر وہ قابض ہو گیا۔ اس میں کچھ چیزیں ایسی تھیں جو اس کے مقصد میں خاص طور پر مفید ثابت ہوئیں، رفتہ رفتہ وہ وقت آیا کہ محمود نے باپ دادا کی ہر چیز کو قربانگاہ عشق پر بھینٹ چڑھا دیا پہلے غیر منقولہ جائداد، پھر گھر کا قیمتی اسباب، اس کے بعد سکونتی مکان، اور سب سے آخر میں محمود نے اپنی غیرت و حمیت ان تباہ کاریوں کی نذر کی۔ قرض کی وہ معمولی معمولی رقمیں جو اس نے شراب کے خالی پیالوں کو پُر کرنے اور آغوش تہی کو کامیاب مدعا بنانے کی غرض سے ساہوکاروں سے حاصل کی تھیں۔ بتدریج بڑھتے بڑھتے ہزاروں اور لاکھوں تک پہنچ گئیں، نتیجہ یہ ہوا کہ محمود گھر سے بے گھر ہوا اور اس کے پاس پہننے کے کپڑے تک نہ رہے۔

ربیعہ جس دن سے گئی تھی، محمود نے اس کو پوچھا تک نہ تھا گو کہ وہ محمود کے لئے تڑپ رہی تھی، مگر اس کے شبستان عیش میں ربیعہ کے واسطے کوئی گنجائش نہ تھی۔

جب محمود کی جائداد نیلام ہو گئی، اس کا سارا سامان فروخت ہو گیا تو اس کے حواس درست ہوئے اور آنکھیں کھل گئیں لیکن اب سوائے منہ چھپا کر فرار ہو جانے کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ممکن تھا کہ ربیعہ سے اس کو کچھ امداد مل جاتی، لیکن جس بیوی کو کبھی محبت کی نظر سے نہ دیکھا تھا ضرورت کے وقت اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا اُسے گوارا نہ تھا۔

عرصۂ حیات محمود پر تنگ تھا مگر موت کو اس کے وجود سے نفرت تھی، وہ ہفتوں تک دیوانہ وار جنگلوں میں پھرتا رہا۔ مگر یہاں بھی اس کی سوزش قلب کا کوئی علاج نہ تھا بالآخر مجبور ہو کر اس نے ترک وطن کا ارادہ کر لیا۔ اس نے دہلی کے راستے پر پیدل چلنا شروع کیا اور جس دن وہ دہلی کی آبادی میں داخل ہوا ہے دو وقت کا بھوکا تھا۔

وہ صبح چار بجے دہلی پہنچ گیا تھا یہ وہ وقت تھا جب محمود دہلی کے دوران قیام میں پارسی تھیٹریکل کمپنی" میں رات بھر دل بہلانے کے بعد قیمتی موٹر میں سوار ہو کر امپیریل ہوٹل کی طرف روانہ ہوا کرتا تھا، جس شہر میں وہ پوری شان امارت کے ساتھ داخل ہونے کا عادی تھا اور جس کے اسٹیشن

پر متعدد موٹریں بیسیوں احباب اس کے خیر مقدم کی رسم ادا کرنے جمع ہوا کرتے تھے آج وہ پھٹے پُرانے لباس میں نہایت بیکسی کے ساتھ اس میں داخل ہو رہا تھا اور کتوں کی خوفناک آوازیں اس کے استقبال میں بلند ہو رہی تھیں۔

وہ دن بھر شہر کے کم آباد محلوں میں پھرتا رہا شام کو بھوک سے اس کا بُرا حال ہو گیا، پورے چار وقت سے اس کے پیٹ میں کوئی چیز غذا کی قسم سے نہ پہنچی تھی اس کے ہاتھ پیروں کی رگیں کھنچ رہی تھیں، معدے سے شعلے بلند ہو رہے تھے جن کی حدت سے زبان بالکل سوکھ گئی تھی۔ انسان ہر تکلیف میں تھوڑا بہت صبر کر لیتا ہے مگر بھوک سے خدا پناہ میں رکھے جو زبردست سے زبردست آدمی کو نہایت ذلیل کارروائیوں پر آمادہ کر دیتی ہے۔

مزدوری سے محمود کو عار نہ تھا، کیونکہ اس مشغلے کو وہ اپنی آئندہ زندگی کا سہارا بنا چکا تھا لیکن اس کا وقت تھا نہ طاقت! مجبوراً صرف ایک وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے اس نے دنیا کے ذلیل ترین پیشے "گداگری" پر اعتماد کیا۔

(۴)

محمود نے صاحب خانہ کے کہنے سننے پر وہ رات وہیں بسر کی لیکن یہ طے کر لیا کہ بہت سویرے کسی کو اطلاع کئے بغیر ہی چلا جاؤں گا۔ اس کا میزبان نفسیات انسانی سے باخبر تھا۔ وہ محمود کی صورت دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ آدمی شریف مگر مصیبت زدہ معلوم ہوتا ہے اب اس کی باتیں سن کر یقین ہو گیا کہ اس کی غیرت اجازت نہیں دیتی کہ وہ دن کی روشنی میں اپنے آپ کو ایک معمولی گداگر کی صورت میں ظاہر کرے، چنانچہ اس نے محمود کو زیادہ مجبور نہ کیا۔

محمود صبح چار بجے کے قریب بیدار ہوا تو دیکھا کہ پلنگ کی برابر میں ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی ہے جس پر کشتی میں کھانا اور چائے رکھی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں میزبان کا شکریہ ادا کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ چلنے پر آمادہ ہوا لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے اپنی جیب میں غیر معمولی وزن کا احساس کیا۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ پچاس روپے کا غذ

کی ایک پڑیہ میں بندھے ہوئے جیب میں پڑے ہیں۔ اب اس کا ارادہ ہوا کہ اپنے مخیر میزبان کا شکریہ ادا کرکے یہ روپیہ اس کو واپس کردے۔ مگر جس کاغذ میں روپیہ لپٹا ہوا تھا اس پر لکھا تھا۔

"امید ہے آپ یہ روپئے قبول کرلیں گے اور اب تو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں کیونکہ اتفاقاً آج میں بھی بارہ بجے شب کو رنگون روانہ ہو رہا ہوں، اب میری روانگی کا وقت آگیا اور میں جا رہا ہوں۔ گھر پر ایک فراش کے علاوہ کوئی نہیں ہو یہی آپ کے ناشتے کا انتظام کرے گا۔ اس کو روپیہ واپس کرنا ایسا ہی ہے جیسے کنویں میں ڈال دینا۔ بہرحال آپ کسی صورت سے روپیہ مجھ تک نہیں بھیج سکتے، ایسی حالت میں بہتر ہے کہ آپ اس کو بلا پس و پیش قبول کرلیں۔"

اگرچہ محمود نے صرف ایک وقت کی روٹی کے لئے فقیرانہ ہیئت اختیار کی تھی اس کی نیت یہ تھی کہ وہ اس پیشے کا پھر کبھی نام نہ لے لیکن اب یہ روپیہ بھی چار و ناچار اس کو لینا ہی پڑا۔ اس مکان سے نکلتے ہی اس نے اپنے ارادے میں بلندی محسوس کی اور قلب میں جوش عمل کا امنڈتا ہوا دریا اسے نظر آیا۔ وہ پہلے تو دن نکلنے کے انتظار میں ادھر اُدھر پھرتا رہا پھر بازار پہنچ کر اس نے چالیس روپئے کے جوتے خرید کئے اور وہاں سے سیدھا اسٹیشن گیا۔ جہاں دو گھنٹے قیام کرکے اس نے اپنے لئے ایک مقصد زندگی اور ایک شاہ راہ عمل تجویز کی۔

چالیس روپیہ کا سرمایہ بظاہر کچھ بھی نہ تھا مگر قوی ارادہ اور ولولۂ عمل ایک ایسی چیز ہے جو ذرے کو پہاڑ بنا دینے کی زبردست طاقت رکھتی ہے، محمود نشۂ عمل سے سرشار تھا، ارادے کی شراب کا خمار اس کے دماغ میں قوت پیدا کر رہا تھا۔ اور وہ ان حالات میں کامیابی کے بہت قریب ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے طے کرلیا کہ میں یہاں سے بمبئی جاؤں گا اور وہاں پہنچ کر اپنی تجارت کو فروغ دوں گا، ہرچند سرمایہ میرے پاس نہیں لیکن جو ارادے بے سر و سامانی کے عالم میں قائم کئے جاتے ہیں وہ اکثر کامیاب ہوئے ہیں، میں کیوں برگ و نوا سے فائدہ نہ اٹھا سکا یقیناً بے نوائی

اور بے سروسامانی مجھے راس آئے گی۔

بمبئی میں ایک ہفتے کے اندر ہی اس کے سب جوتے فروخت ہوگئے جس کے بعد اس کو نوٹ روپئے حاصل ہوئے دہلی میں جس دوکان سے محمود نے جوتے خرید کئے تھے اس سے یہ قرارداد ہوگئی تھی کہ آئندہ اگر ضرورت ہوئی تو اسی نرخ پر وہ جس جگہ سے چاہے گا مال طلب کرسکے گا چنانچہ اس نے یہ روپیہ اس دوکان کو بھیج کر استدعا کی کہ مال فوراً بھیج دیا جائے۔ اب اس نے بمبئی کی ایک دوکان پر ۸ روپیہ پر مزدوری شروع کر دی۔ بارہ دن کے بعد جب پارسل وصول ہوا تو وہ مزدوری سے چھ روپئے پیدا کرچکا تھا جس میں سے چار روپئے نقد اس کی جیب میں موجود تھے۔ اس نے مزدوری برابر جاری رکھی، صرف شام کو تین چار گھنٹے کے لئے وہ کسی اچھی جگہ اپنی دوکان لے کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ اتنے وقت میں جو کچھ فروخت ہوتا تھا اس کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھتا تھا اور مزدوری کے سلسلے میں اپنے کھانے پینے کے مصارف پورے کرتا تھا۔

چونکہ بمبئی میں دہلی کے جوتوں کی یہ پہلی دوکان تھی لہذا کوئی وجہ نہ تھی کہ محمود کا یہ کاروبار اتنے بڑے شہر میں فروغ نہ پاتا۔ ایک سال کے ہیر پھیر میں محمود نے ہزاروں روپئے پیدا کرلئے اس نے شہر کے ایک بڑے بازار میں ایک شاندار دوکان کھولدی، اور اب کثرت سے دہلی کے جوتے اس کے یہاں موجود رہتے ہیں جن کو وہ ہندوستان کے باہر بھی مصر، سوڈان، افریقہ وغیرہ بھیجتا رہتا ہے، اس نے اسی کے ساتھ کپڑے کی تجارت بھی شروع کر دی ہے جس میں اس کو کافی منافع ہوتا ہے۔

اگرچہ محمود بظاہر بہت مطمئن ہے اور اس کی حیثیت اب اس قدر مضبوط ہوگئی ہے کہ اس کو اس طرف سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ ہر وقت کسی خیال میں محو رہتا ہے وہ اقتصادی جنگ میں جتنا کامیاب ہو رہا ہے دماغی کشمکش میں اتنا ہی مغلوب ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ربیعہ کی مفارقت کو اپنے لئے نہایت تکلیف دہ خیال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے میزبان کا قرض ادا کرنے کی اُسے سب سے زیادہ فکر ہے۔

حقیقتاً ان ہی وجوہ سے وہ ہر وقت پریشان اور مضطرب رہتا ہے بظاہر اس کو جس قدر اطمینان ہے اتنا ہی وہ دل میں بے چین ہے۔

(۴)

محمود کے لئے ربیعہ کا بلا لینا کچھ دشوار نہ تھا، وہ اگر معمولی طور پر بھی اُسے یاد کرتا تو ربیعہ ایسی عورت نہ تھی کہ محمود کی بدسلوکی کا انتقام لیتی، وہ بوئے گل کی طرح اگر محمود کی زندگی کے چمن سے جدا ہوگئی تھی تو "عروس بہار" بن کر واپس بھی آسکتی تھی۔

ہر چند پانی کی گستاخ موجیں "کنول کے پھول" کو ایک لمحہ چین لینے نہیں دیتیں، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ موجوں کے ان تھپیڑوں سے متاثر ہو کر تالاب سے بے وفائی کرے، وہ جھیل ہی میں کھلتا ہے اور وہ ہیں مرجھا کر اپنی شگفتگی سے خوش ہونے والے پانی میں فنا ہو جاتا ہے۔

ربیعہ بھی محمود ہی کو اپنی کشتی حیات کا ناخدا سمجھتی تھی اور محمود کی بے التفاتی کو اپنی موت سے تعبیر کرتی تھی، لیکن محمود کے لئے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ وہ ربیعہ سے بے انتہا شرمندہ تھا۔ لئے اس کے بلانے کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی، جس زمانے میں محمود میرٹھ میں مقیم تھا اور اس کے پاس کافی سرمایہ تھا اس کو اطلاع دی گئی تھی کہ ربیعہ کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا ہے آکر دیکھ جاؤ۔ مگر اس نے ادھر کوئی توجہ نہ کی تھی، اس کے بعد بیماری کے حیلے سے بھی اُسے بلایا گیا مگر محمود نہ گیا۔

ان حالات میں اُسے ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ اپنی اُس بیوی کو جس کا قلب اس کی بے اعتنائی سے مجروح ہے دعوت التفات دے۔ مگر یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہ بیوی اور بچے کو بھول جائے۔

اس نے ایک دن ربیعہ کو اپنے تمام حالات قلمبند کرکے بھیج دیئے یہ بھی لکھ دیا کہ میں نے محض شرم کی وجہ سے تمہیں نہیں بلایا اگر تمہیں باوجود میری بداخلاقی کے مجھ پر رحم آسکتا ہو تو پچھلی باتوں کو ایک بدمست انسان کی بکواس اور بیمار آدمی کا ہذیان سمجھ کر بھلا دو۔ اور خدا کے لئے میرے نورالعین کو لے کر چلی آؤ۔ میرے کاشانہ حیات کا دروازہ تمہارے لئے ہر وقت کھلا ہوا ہے اور صرف تمہاری میرے گھر میں کمی ہے۔ خط لکھنے کے دسویں روز محمود کو تار سے اطلاع دی گئی کہ ربیعہ بمبئی روانہ ہو چکی ہے۔ اسٹیشن پہ

سواری کا انتظام کر دو۔

محمود وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی اٹیشن پہنچ گیا، پنجاب میل کے بمبئی اسٹیشن پر رکتے ہی ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کھڑکی سے سر نکال کر زور سے کہا "مسٹر محمود"۔ اس آواز کی صدائے بازگشت ابھی فضا میں گونج رہی تھی کہ محمود دوڑ کر زنانے ڈبے کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے ربیعہ کے ساتھ آنے والے آدمی کو غور سے دیکھ کر معلوم کیا کہ یہ اس کا وہ مخیر میزبان ہے جس کے دروازے پر اس نے اپنا طویل روزہ افطار کیا تھا۔

یہ بھی ایک اتفاقی بات تھی کہ عارف نے معمولی توقف کے بعد محمود کو پہچان لیا۔ ربیعہ نے محمود کو دیکھتے ہی عارف کو اشارے سے بتایا کہ یہی محمود ہیں تو عارف پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی، ان کے حافظے میں محمود کی دو سال قبل کی ہیئت اس طرح محفوظ تھی جیسے کوئی ہوشیار مصور آئینے پر تصویر بنا دیتا ہے ممکن تھا کہ عارف اس کو اپنے ذہن ودماغ کا ایک مغالطہ سمجھے لیکن جب محمود نے بھی ان کو متعارفانہ نگاہوں سے دیکھ کر ان کا خیر مقدم کیا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اپنے خیال کو غلط سمجھتے۔

عارف محمود کے کاروبار کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس قدر جلد ترقی کرنے پر انھوں نے بہت تحسین کی جس کا محمود نے ادب کے ساتھ شکریہ ادا کیا اور پھر پچاس روپیہ کا نوٹ پیش کر کے عارف سے کہا کہ اب اپنا یہ عطیہ واپس کر لیجئے۔

عارف نے کہا میں اس معاملے میں ربیعہ کی اجازت کا پابند ہوں کیونکہ جس رقم سے یہ روپیہ آپ کو دیا گیا تھا اس میں میرے علاوہ ربیعہ اور ان کے بھائی بھی شریک تھے۔ ہم تینوں کے مشترک سرمایہ سے تجارت ہوتی تھی اور جس روز آپ کی مجھ سے ملاقات ہوئی ہے۔ اسی دن مجھے بھی "نمک" کی تجارت میں پندرہ ہزار کا نفع ہوا تھا۔ اسی منافعے سے میں نے اپنی ذمہ داری پر پچاس روپئے تم کو دیئے تھے لیکن اب یہ روپیہ خیرات کی مد میں درج ہو چکا ہے۔ میں اس کو کسی طرح اپنے اختیار سے واپس نہیں لے سکتا۔ اور نہ ایک سائل کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ دو سال کے بعد کسی

تنقید و تبصرہ

کتب:

تفصیل البیان فی مقاصد القرآن۔ مانی الاسلام نقش و نگار۔ کامیاب مطالعہ

تفصیل البیان فی مقاصد القرآن | مؤلفہ مولوی سید ممتاز علی صاحب دیوبندی۔ بڑی تقطیع کاغذ دبیز۔ ہر حصہ مجلد، لکھائی چھپائی اعلیٰ درجے کی۔ قیمت حصہ اول ہے، دوم للعہ، سوم ہے، چہارم للعہ
ملنے کا پتہ: دارالاشاعت پنجاب لاہور۔

اس کتاب کے اب تک چار حصے بغرض تنقید موصول ہوئے ہیں، پوری کتاب آٹھ حصوں میں ہو جن میں سے دو زیر طبع ہیں اور دو زیر تالیف۔

مؤلف نے اس کتاب میں قرآن کریم کی آیات کو بہ ترتیب موضوع وعنوان فراہم کیا ہے۔ اس طرح پر کہ قرآن کو اول سے پڑھنا شروع کیا۔ ہر ہر آیت جس جس موضوع کے تحت میں آسکتی ہے یا جس جس موضوع کے تحت میں آنی مناسب ہو اُس اُس کے تحت میں لکھی گئی۔ جو اُن موضوعوں کے تحت میں نہیں آسکی اس کے لئے ایک نیا موضوع یا عنوان قائم کیا گیا اور اس کے ذیل میں لکھی گئی۔ یہ انتخاب قرآن مجید کی ہر آیت کے متعلق کیا گیا۔ یہانتک کہ جملہ آیات بعنوان وار مرتب ہوگئیں۔ اس مجموعے کی ضخامت قرآن مجید سے زیادہ ہوگئی اور ہونی بھی چاہئے تھی کیونکہ ہر آیت کم سے کم ایک بار تو ضرور کسی موضوع کے تحت میں آئی اور بہت سی آیتیں جن میں مختلف پہلو نکلتے ہیں مختلف عنوانوں کے تحت میں دو دو یا تین تین بار آئیں۔

یہ چاروں حصے ہم نے مطالعہ کئے۔ اس سے قبل مولوی عبیداللہ صاحب کی اقتباس الانوار اور مولانا وحیدالزمان کی تبویب القرآن بھی ہماری نظر سے گزر چکی ہیں لیکن ان کے مقابلے میں یہ کتاب بہت زیادہ مفید اور کارآمد اور اپنے مقصد کو پورا کرنے والی ہے۔

درحقیقت ایک عرصے سے طالبان قرآن اس ضرورت کو نہایت شدت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں کہ آیات قرآنی بترتیب مضامین مرتب کی جائیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں خواہ وہ عربی میں ہوں یا فارسی یا اردو میں حقائق قرآنی سمجھانے سے قاطبۃً قاصر ہیں کیونکہ وہ ایک ایک آیت

کی تشریح کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں اور بہت کم ان حقائق سے بحث کرتی ہیں جن کا وہ آیت ایک حصہ ہوتی ہے۔ صورت یہ ہے کہ قرآن میں ایک حقیقت کی تعلیم ایک آیت میں شروع ہوتی ہے دوسری جگہ کسی سورۃ میں اس پر کچھ اضافہ ہوتا ہے۔ پھر تیسرے مقام پر کوئی استثنا یا قید یا شرط بڑھائی جاتی ہے پھر کہیں تکمیل یا تتمہ ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مسئلہ قرآن کے مختلف مقامات میں پھیلا ہوتا ہے۔ اس کی پوری حقیقت سمجھنے کے لئے ان جملہ آیات کو ایک جگہ فراہم کرنا ضروری ہے تاکہ مکمل حقیقت ذہن میں آسکے۔ اس لئے علوم قرآن تفاسیر میں نہیں ہیں بلکہ خود قرآن میں ہیں اور آیات کو آیات کے ساتھ ملانے سے وہ سمجھ میں آتے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اسی ضرورت سے قرآنی آیات کی تبویب شروع کی جن میں سے اب تک سب سے بڑی اور بکار آمد کوشش یہ کتاب ہے جو زیر تنقید ہے۔ اس کا پہلا حصہ کتاب العقائد ہے جس میں اللہ کی ذات و صفات اور اس کے افعال کے متعلق آیات ہیں۔ دوسرا حصہ کتاب الاحکام ہے جس میں فقہی احکام کی آیات جمع کی گئی ہیں۔

تیسرا حصہ کتاب الرسالۃ ہے جس میں قرآن اور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے متعلق جملہ آیات فراہم کی گئی ہیں۔ چوتھے حصے میں جس کا نام کتاب المعاد ہے قیامت اور اس کے متعلقات کی آیات ہیں۔

کتاب میں پہلے ہر موضوع بطور عنوان کے اوپر لکھا گیا ہے۔ پھر اس کے تحت میں متعدد ضمنی سرخیاں حاشیے میں قائم کی گئی ہیں۔ پھر اس کے ذیل میں آیات نقل کی گئی ہیں جن کا شمار اوپر اور سورۃ کا شمار نیچے دیا گیا ہے۔ اس کا حوالہ دیکھنے کے لئے وہ قرآن درکار ہے جس میں ہر آیت کا شمار لکھا ہوا ہو۔

یہاں ضمناً مجھے یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ ارباب مطابع جو قرآن چھاپتے ہیں ان کو چاہئے کہ آیات کے اندر ان کے شمار بھی ضرور لکھا دیا کریں۔ اس میں ان کے لئے کوئی دقت نہیں ہے اور بڑی آسانی سے وہ اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں کیونکہ صرف ہندسہ ہی لکھنا تو ہے۔

مؤلف کی محنت جانکاہی اور ان کے خلوص کی قدر کرتے ہوئے میں اس کتاب کے نقائص اور خامیوں کی طرف بھی ایک نظر ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ کتاب ابھی زیر ترتیب ہے اور مؤلف نے لکھا بھی ہے کہ احباب جو مشورہ دیں گے ان پر میں کاربند ہوں گا۔ اس لئے ممکن ہے کہ میرے مشورے کچھ مفید ثابت ہو سکیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مؤلف نے عنوانات کی ترتیب کسی علمی اصول پر نہیں رکھی۔ پہلے حصے کا نام انھوں نے کتاب العقائد رکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جملہ عقائد کے متعلق آیات

ہوں گی مگر صرف اللہ کی وجود کے اثبات اور اس کے صفات ہی پر یہ حصہ ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا حصہ احکام فقہیہ کے متعلق شروع ہو جاتا ہے۔ پھر تیسرا حصہ کتاب الرسالۃ ہے یعنی رسول اور کتاب جو عقائد میں سے ہیں احکام کے بعد آتے ہیں علیٰ ہذا چوتھا حصہ معاد بھی عقائد ہی کا حصہ ہے۔ ملائکہ کا کوئی عنوان نہیں قائم کیا گیا ہے۔

پہلے حصے میں ایک باب آخر میں قضاء وقدر کے متعلق ہے اور پھر وہی باب بجنسہ کتاب الاحکام یعنی دوسرے حصے میں دہرایا گیا ہے۔ یہ بہت بڑی غفلت ہے۔

ذات الٰہی کے متعلق کوئی عنوان نہیں قائم کیا گیا حالانکہ قرآن میں اس کے متعلق جملہ آسمانی کتب سے زیادہ تعلیمات موجود ہیں۔ علم جو صفات الٰہی میں سے ایک نہایت ممتاز صفت ہے اس کو ذیلی سرخیوں میں لکھا گیا ہے اور علم غیب جو علم مطلق کی ایک فرع ہے زیب عنوان ہے۔ نعمتوں کے بیان میں آیات کے استیعاب کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں شرک کے ذیل میں ہے۔ "مشرکوں کے اعمال اکارت ہیں" اور ارتداد کے تحت میں ہے "مرتدوں کے اعمال رائگاں ہیں" لیکن کفر کے تحت میں اس سرخی کو چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ آیات موجود ہیں۔ سورۂ ابراہیم میں ہے الذین کفروا اعمالہم کرماد الآیہ سورۂ نور میں ہے الذین کفروا اعمالہم کسراب الآیہ معلوم نہیں یہ آیات کس ذیل میں لکھی گئی ہیں۔

تیسرے حصے میں کتب سماوی میں سے قرآن۔ تورات اور انجیل کے ذکر کے ساتھ زبور اور صحف ابراہیم وغیرہ کا بھی ذکر لازم تھا۔

شق القمر والی آیت پیش گوئیوں میں بھی درج ہے اور علامات قیامت میں بھی۔ ایسی صورت میں ایک ہی معنی کا تعین لازمی تھا۔ کوئی آیت قرآن کی دو مختلف معنوں میں لینا صحیح نہیں۔ یہی معاملہ الذین آتیناہم الکتاب یعرفونہ الآیہ کے متعلق کیا گیا ہے حصہ دوم صفحہ ۱۳۱ میں یہی آیت کعبے کے بارے میں ہے اور حصہ سوم صفحہ ۲۷ میں یہی آیت رسول کے متعلق ہے۔ حالانکہ اس کا مفہوم ایک ہی ہو سکتا ہے علاوہ بریں اسی مضمون کی دوسری آیت جو سورہ انعام میں ہے یعنی الذین آتیناہم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءہم الذین خسروا انفسہم فہم لا یومنون۔ یہ نہ کعبے کے متعلق ہے نہ رسول کے ذیل میں ہے نہ قرآن کے۔

سورۂ ص کی آیت "کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ ولیتذکر اولوا الالباب" قرآن مبارک کتاب ہے" کی سرخی میں درج کی گئی ہے حالانکہ اس کو مقاصد قرآن کے تحت میں بھی درج کرنا لازم تھا۔

رسول اللہ کی شان میں سورہ والضحیٰ کو نقل کرنا اور اس میں آیت ووجدک ضالاً فہدیٰ کو حذف کردینا
ت مجرمانہ ہو کیونکہ اس میں اللہ نے ایک حقیقت بیان کی ہو جو کسی دوسری آیت سے نہیں مل سکتی۔

چوتھا حصہ کتاب المعاد ہو۔ اس سے پہلے عالم برزخ ہونا چاہئے تھا جس کے متعلق قرآن میں تعلیمات
ی پڑی ہیں۔ معاد میں نفخ صور بار اول اور نفخ صور بار دوم کے الگ الگ عنوانات قائم کئے ہیں۔
، پہلے کی آیات دوسرے میں اور دوسرے کی آیات پہلے میں خلط ملط کردی ہیں۔ نفخ صور بار اول
، آیت ۶۹/۳۹ یعنی واشرقت الارض بنور ربہا درج کی ہو حالانکہ خود قرآن میں اس آیت کی پیشانی پر
ہوا ہو کہ یہ نفخ صور دوم کے تحت میں ہو۔ اسی طرح صفحہ ۴۶ کی ساتوں آیتیں نیز آیت ۵۱/۳۶ جو نفخ
میں درج ہوئی ہیں نفخ اول کی ہیں حقیقت یہ ہو کہ الساعہ اور القیامہ دونوں کی آیتوں میں لوگوں
ہت غلطیاں کی ہیں۔ خاصکر اس وجہ سے بھی کہ الساعہ کہیں کہیں القیامہ کے معنی میں بھی آگیا ہے جس
ہ تمیز نہیں کر سکے۔ اس لئے اس میں نہایت غائر نظر ڈال کر امتیاز کرنا چاہئے تھا۔

یہ نقائص اس لئے میں نے دکھلانے کی کوشش کی ہو کہ آئندہ حصوں نیز آئندہ اشاعت میں
کی اصلاح کی جائے تاکہ یہ کتاب زیادہ مفید ہو سکے۔ ورنہ اس کتاب کی خوبی اور مؤلف کی
ت کو میں نہایت قابل قدر سمجھتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ اس خدمت قرآن کے صلہ میں اللہ
کو دین اور دنیا دونوں میں کامیاب کرے گا۔

الاسلام | مصنفہ مولنا اصغر علی صاحب روحی پروفیسر دیانات و ادبیات اسلامیہ کالج لاہور۔
تقطیع ۲۰×۲۲ حصہ اول ضخامت ۱۱۲ صفحے قیمت حصہ دوم ضخامت ۴۸۴ صفحے قیمت
لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی۔ غالباً مصنف سے مل سکے گی۔

مولانا روحی صاحب نے اس کتاب میں مذہب کے جملہ مہمات عقائد و اعمال پر بسط و تفصیل کے ساتھ
ث کی ہو اور نہایت شستہ عبارت میں فلسفیانہ طریق پر مذہب جمہور یعنی اہل سنت کی حمایت
ہو بلکہ حمایت کا حق ادا کردیا ہو۔ چونکہ ایک مدت سے وہ عقائد و دیانات اسلامی کے معلم رہے ہیں
سے اُن کی بحثیں نہایت غور و خوض اور کافی عرصے کے مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے اپنے پیش نظر
جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو رکھا ہے جو مذہب سے ناواقفی کی وجہ سے اس کی تعلیمات پر اعتراض
ں سے اعراض کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ انھوں نے عقائد و مسائل کے اثبات میں فلسفیانہ استدلال
یقہ اختیار کیا ہے۔ جابجا اسلامی مسائل میں انھوں نے سرسید کی غلطیاں دکھائی ہیں اور بالخصوص

"بااعتقاد نیا پوہ" کو جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

اس سے پہلے اسی قسم کی ایک کتاب مولوی عبدالقیوم صاحب وکیل جالندھر نے "دین کامل" کے نام سے لکھی ہے جس کے اوپر جامعہ کے صفحات میں تنقید ہو چکی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ طریقہ دین حق کو سمجھانے کا نظری ہے جو اس کو فلسفیانہ بحثوں میں الجھا کر بہت کچھ شکوک پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ علماء سلف نے اس استدلالی طریق کو عقیم اور بے نتیجہ اسی وجہ سے قرار دیا ہے کہ اس سے نہ کسی کو مسلمان بنایا جا سکتا ہے نہ اذعان اور یقین پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً معجزہ انبیاء کی تصدیق کی حجت ہوتا ہے مگر جب معجزہ خود ہی اپنے ثبوت میں مولانا روحی کے پچاس صفحوں کے استدلال کا محتاج ہو تو وہ کیونکر دلیل نبوت کہا جا سکتا ہے۔

مولانا نے اس کتاب کے سرورق پر یہ آیت لکھی ہے " افلا یتدبرون القرآن " اس سے مجھے یہ خیال ہوا تھا کہ اپنی اس کتاب میں وہ غالباً قرآن کی تعلیمات بیان کریں گے مگر کتاب پڑھنے سے معلوم ہوا کہ عوام مسلمانوں کے عقائد فلسفیانہ لباس میں جلوہ گر کئے گئے ہیں۔ جہاں فلسفہ ساتھ چھوڑ دیتا ہے وہاں بزرگوں، صوفیوں اور بالخصوص شعراء کے اقوال سے اس کی تلافی کی جاتی ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ آپ کا حریف مخاطب ان لوگوں کو حجت تسلیم کرے۔

سوال قبر روح اور بدن ہر دو سے پھر سماع میت وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن پر علماء اور بزرگوں کے اقوال سے مولانا نے شہادتیں پیش کی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ سماع میت پر حضرت عائشہ ام المومنین رضؓ کے استدلال قرآنی کی انھوں نے تردید کی ہے کہ آیت میں اسماع کی نفی ہے نہ کہ سماع کی۔ حالانکہ اگر وہ غور کرتے تو قرآن میں بہت سی آیتیں سماع کی نفی پر صراحتاً دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً

والذین تدعون من دونہ مایملکون من قطمیر ان تدعوہم لایسمعوا دعائکم الآیہ

جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں اگر تم ان کو پکاروگے تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے۔

اہل شرک اللہ کے ماسوا جن لوگوں کو پکارتے تھے ان میں مردہ بزرگ اولیاء بلکہ انبیاء وغیرہ سبھی ہیں۔ ان کی نسبت تصریح ہے کہ وہ نہیں سنتے۔ ایسی صورت میں اگر قرآن اور حدیث میں تعارض ہے تو محفوظ طریقہ یہ ہے کہ حدیث میں تاویل کی جائے نہ کہ قرآن میں۔

اسی طرح ایصال ثواب کے مسئلے میں بھی انھوں نے قرآن کے خلاف فیصلہ کیا ہے جو یہ تصریح کر رہا ہے کہ "لیس للانسان الا ماسعیٰ" اور "ہل تجزون الا ما کنتم تعملون"

مہدی کی آمد کا عقیدہ جس کا اشارہ بھی قرآن میں نہیں ہے اور جو حدیثیں اس کے متعلق ہیں وہ

بہ تحقیق اکثر اہل سنت مجہول ہیں انکو نزدیک دینی ہے اور تعجب یہ ہو کہ اس کے نسب اور نام تک کو اہل سنت سے تسلیم کرانے پر مصر ہیں۔

تصوف کے ثبوت میں بھی جس کے نام تک سے قرآن یا حدیث آشنا نہیں ہیں انھوں نے تین جزو صرف کئے ہیں اور اس کو اسلامی تعلیمات کی حقیقت قرار دیا ہو۔ مکاشفہ کے اثبات میں سر سید پر لعن طعن کرکے بزرگوں کے اقوال سے سندیں پیش کی ہیں۔ مگر کشف تو ہر ایک ماہر فن کو اپنے فن کے متعلق ہوتا ہو۔ اس کو دین کے ساتھ کیا خصوصیت ہو۔

ان کے نزدیک ہر مسلمان کو شیخ کی بھی ضرورت ہو حالانکہ قرآن اس کو نہایت خطرناک بتاتا ہے۔ "ان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ" (دنیا کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر تو ان کی اطاعت کرے تو وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے) دوسری آیت میں یہ تصریح اس کی ممانعت ہو۔ "اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء" (اسی کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تمھارے اوپر نازل کیا گیا اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو) حقیقت یہ ہو کہ قرآن کے ہوتے ہوئے شیخ کی تلاش کرنا بعینہ ایسا ہی ہے جیسے آفتاب کے ہوتے ہوئے چراغ ڈھونڈھنا۔ رسول پاک نے جو بیعت لی تھی وہ امامت کی حیثیت سے تھی چنانچہ ان کے بعد صحابہ کرام میں سے صرف وہی لوگ بیعت لیتے تھے جو خلافت یا امارت کا منصب رکھتے تھے۔ دیگر صحابہ سے بیعت لینا مطلقاً ثابت نہیں ہو۔ پیری اور مریدی کی بیعت مسلمانوں میں اس وقت شروع ہوئی ہو جب تاتار کے غلبہ کے بعد ان کی دینی صلاحیت فوت ہوگئی اور ارشاد و ہدایت کا منصب دنیا کمانے کا ذریعہ بن گیا۔

غرض یہ ہو کہ جو عقائد جو اعمال اور جو رسوم مسلمانوں میں مذہب کے نام سے پھیلے ہوئے ہیں مولانا روحی نے اپنے فلسفے سے انھیں کی حمایت کی کوشش کی ہو۔ اور مخالفین کو نہایت سخت بلکہ بعض مقامات پر کرخت لہجے میں مخاطب فرمایا ہے۔

حقیقت یہ ہو کہ قرآن کریم نے پانچ ہی اجزا، ایمان قرار دئے ہیں۔ اللہ۔ رسول۔ ملائکہ۔ کتاب اور یوم آخر ان کے سوا کوئی چھٹا عقیدہ قرآن میں نہیں۔ مسلمانوں نے ان کے اوپر سیکڑوں عقائد اضافہ کرلئے لیکن نتیجہ سوائے ہلاکت اور غضب الٰہی کے اور کچھ نہ ہوا۔ کیونکہ یہ سب الگ الگ فرقوں کے خیالات تھے جن سے امت کی وحدت فنا ہوگئی۔ تعجب ہو اگر مولانا روحی جیسا شخص بھی اسی سے عبرت نہ لے اور اسی لکیر کا فقیر بنا رہے جو ترکستان کو جاتی ہے۔

(ا۔ س۔ ج)

نقش و نگار | جناب جلیل احمد صاحب جلیل قدوائی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔ حجم ۱۸۰ صفحہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی اوسط درجے کی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس۔ قیمت ۱۲/ مصنف سے کاشانۂ اماؤ کے پتے سے مل سکتی ہے۔

اردو داں پبلک جلیل قدوائی صاحب سے فسانہ نگار کی حیثیت سے واقف ہے۔ ان کی چند متفرق نظمیں بھی اردو کے ممتاز رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان کی نظموں کا مجموعہ اب تک نہیں چھپا تھا اس لئے ان کے شاعرانہ جوہر لوگوں پر اچھی طرح نہیں کھلے تھے۔ اس مجموعے کو پڑھ کر اہل ذوق کو بیحد خوشی ہوگی کہ نئی نسل میں ایک ایسا شاعر موجود ہے جس کی زبان میں حسرت کی زبان کی سی سادگی اور شادابی اور خیالات میں وہ درد اور اثر ہے جو غزل کی جان اور سچی شاعری کی پہچان ہے۔

کتاب کے ساتھ حضرت احسن مارہروی کا تعارف اور عبدالشکور صاحب سابق پروفیسر انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ کا مقدمہ بھی ہے جس میں جلیل صاحب کے کلام پر بہت حسن ذوق کے ساتھ تنقید کی گئی ہے۔ اسے پڑھ کر اصل کلام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

ہم نمونے کے طور پر چند اشعار درج کرتے ہیں جنھیں حضرت احسن اور عبدالشکور صاحب کی نظر انتخاب نے چھانٹا ہے۔

باغ میں چاندنی چھٹکتی ہے — آنکھ بے اختیار روتی ہے
بے قراری ہمارے دل کی حیف — نام عشاق کا ڈبوتی ہے

فکر پوشیدگی راز میں ہیں دیوانے — سی رہا ہے کوئی دامن تو گریباں کوئی

خوشی کے چند دن تھے جو خوشی میں کٹ گئے لیکن — حیات غم حیات جاوداں معلوم ہوتی ہے
بھرے آتے ہیں آنسو سن کے حال گریۂ بلبل — ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

شب چلے ہیں دل سے کچھ کچھ داغ ہائے آرزو — پھر چمک اٹھیں نہ اس ظالم کو ہنستا دیکھ کر

جلوہ دکھلاتی ہے اپنا زیر دامان سحاب — نوعروس برق یعنی دختر ابر بہار
آج ہوتی ہے دل میں ایک خلش — آج کھلتا ہے راز راحت کا

کیسا ویرانہ، کیسی آبادی؟ اقتضا اور کچھ ہے وحشت کا
عمر ساری ملال میں گزری اللہ اللہ فریب راحت کا
تسکین ہے وجہ راحت دل تسکین کا اعتبار کب تک
دل مرحوم کی اٹھان کی شان ہائے اس ہونہار کی باتیں
ڈرایا اس قدر طوفان بحر زندگانی نے کہ ہم ساحل کو بھی موج لب ساحل سمجھتے ہیں
مایوسیوں نے پیہم دل سرد کر دیا ہے اب آرزو کے بدلے اک داغ آرزو ہے
منزل کا ہوش کچھ ہے نہ ہے راہ کی خبر لے جائے کس طرف دل دیوانہ دیکھئے

ایک نظم "برکھارت" کے چند اشعار۔

باغ میں پریاں جھول رہی ہیں حسن پہ اپنے پھول رہی ہیں
دھانی ساڑھی اونچا دامن ترچھی نظریں تیکھی چتون
نین رسیلے چھب متوالی ہنسی انوکھی بات نرالی
سر سے وہ آنچل کا ڈھل جانا شرما کر وہ سر کو جھکانا

کامیاب مطالعہ از سید تجمل حسین صاحب ایم اے، بی ٹی لکچرر ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔ حجم ۱۲۷ صفحے قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ میراماں منزل، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ یا مکتبہ جامعہ ملیہ۔ قرولباغ۔ دہلی۔

اس رسالے میں مصنف نے جو اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور ٹریننگ کالج کے لکچرر کی حیثیت سے طالب علموں اور معلموں دونوں کی تعلیم کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ مطالعے کے نفسیاتی اصولوں کو بہت سلیس شگفتہ عام فہم زبان اور دلنشیں انداز میں سمجھایا ہے اور ایسے گر بتائے ہیں جن سے کام لے کر طالب علم کم سے کم محنت کا زیادہ سے زیادہ نتیجہ حاصل کر سکتا ہے۔ ہندوستانی طالب علم عموماً طلب علم میں بہت بے تکے طریقے سے محنت کرتے ہیں۔ سارا بار حافظے پر ڈال دیتے ہیں اور وہ بھی اس طرح سے کہ نفسی قوانین کی صریحی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ حافظے کا ٹٹو اناڑی سوار کے ہاتھ سے لگام کے جھٹکے اور چابک کھاتے کھاتے اَنتا اڑیل ہو جاتا ہے کہ کسی طرح نہیں چلتا۔ اس کتاب کے مطالعے سے طالب علموں کو اس مرکب پر پورا قابو حاصل ہو سکتا ہے اور وہ ایک اشارے سے اسے جدھر چاہیں موڑ سکتے ہیں۔ ہم ذیل میں اس کی فہرست درج کرتے ہیں جس سے کتاب کے مضامین کا پورا اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) طالب علم کی جسمانی صحت (۲) مطالعے کے لئے جگہ اور وقت کا تعین (۳) مطالعے کی مختلف قسمیں۔ (۴) مطالعے کو کامیاب بنانے کے طریقے (۵) حافظہ اور اس کی ترتیب (۶) حفظ کرنے کے صحیح طریقے (۷) امتحان اور اس کی تیاری۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

جرمنی کا قرضہ | ڈاکٹر برونگ وزیر اعظم جرمنی کا جو اعلان حال میں جرمنی کے قرضے کے متعلق شائع کیا ہے اس سے دنیا میں ہلچل پیدا ہوگئی ہے۔ ہماری درخواست پر ڈاکٹر زومر نے جو جرمنی کے مشہور "ایشورنس بنک ہ الائنس واشٹ گارڈ" کی ہندوستانی شاخ کے جنرل منیجر ہیں یہ نوٹ جرمن قرضے کے مسئلے پر لکھ کر رسالہ جامعہ کو عنایت کیا ہے)

جرمنی کے ذمے بیرونی قرضے دو قسم کے ہیں

(الف) سیاسی قرضے (تاوان جنگ)

(ب) تجارتی قرضے (بیرونی بنکوں کے قرضے جرمن کارخانوں پر)

سیاسی قرضوں کا تصفیہ پہلی بار ۱۹۲۴ء میں ڈا ایس (Dawes) کمیٹی نے کیا۔ پھر ۱۹۲۹ء میں ایک اور تصفیہ ہوا جو "تجویز ینگ" (Young Plan) کے نام سے مشہور ہے۔

تاوان جنگ کا مطالبہ اس بے بنیاد دعوے پر مبنی تھا کہ لڑائی جرمنی نے شروع کی اور اس میں سراسر اسی کا قصور تھا۔ صلحنامۂ ورسائی (Treaty of Versailles) کے بعد سے اب تک متعدد فرانسیسی اور انگریز سیاست داں اس دعوے کی تردید کر چکے ہیں۔ مگر فرانس ہنوز ان مطالبات پر مصر ہے۔ "تجویز ینگ" کی رو سے جرمنی ۱۹۶۶ء تک تقریباً دس کروڑ پاؤنڈ (ڈیڑھ کرور روپیہ) سالانہ دینے کا پابند کر دیا گیا۔

۱۹۲۴ء میں دنیا کے ماہرین تجارت پر یہ بات روشن ہوگئی کہ جرمنی کے لئے اس خطیر رقم کے ادا کرنے کی سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں کہ اسے سالانہ قسط تاوان کے مساوی رقم کا مال باہر بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ بجائے اس کے ہوا یہ کہ یورپ، امریکا اور ایشیا کے ملکوں نے بھاری تامینی محصول لگا کر جرمن مال کی درآمد کو روک دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب جرمنی غیر ملکی بازاروں میں اتنا مال نہیں بھیج سکتا، جتنا فرانس، انگلستان، امریکا کے سیاسی مطالبات ادا کرنے کے لیے بھیجنا ضروری ہے۔ مجبوراً اسے یہ رقم غیر ملکوں سے اور زیادہ تر خود انگلستان اور امریکا سے قرض لینا پڑی۔

اس طرح ایک چکر سا بن گیا جس میں سے نکلنے کی کوئی جگہ نہیں۔ جرمن حکومت نے اپنے ملک کے لوگوں پر خصوصاً صنعت وحرفت اور تجارت پر بھاری ٹیکس لگائے۔ صنعتی کارخانے اور تاجر باہر کے

ملکوں میں اتنا مال بھیج نہیں سکتے تھے کہ حکومت کو محصول ادا کریں۔ اس لئے انھوں نے انگلستان اور امریکا کے بنکوں سے اپنے ملکیت اراضی کی ضمانت پر اور جرمن قوم کی محنت اور جفاکشی کی ساکھ پر روپیہ قرض لینا شروع کر دیا۔

عموماً غیر سرکاری قرضے انگلستان اور امریکا سے لئے گئے۔ یہ قرض کی رقم ٹیکس کی صورت میں جرمن حکومت کو ادا کی جاتی تھی اور وہاں سے تاوان کی صورت میں پھر غیر ملکوں میں چلی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۱ء میں منقطع ہوگیا کیونکہ اب دنیا کی عام اقتصادی مشکلات کی وجہ سے بین الاقوامی قرضوں کا ملنا ناممکن تھا جولائی ۱۹۳۱ء سے اب تک بین الاقوامی ماہرین کے کم سے کم تین کمیشن مقرر کئے جا چکے ہیں جنھوں نے اس مسئلے پر اچھی طرح غور کرکے یہ فیصلہ کیا اور مختلف حکومتوں کو اس سے آگاہ کر دیا کہ جرمنی یا تو اپنا سیاسی قرض ادا کرسکتا ہے یا تجارتی قرضہ۔ دونوں قرضے ساتھ ساتھ نہیں دے سکتا۔

سب سے زیادہ سیاسی پیچیدگیاں سیاسی قرضے میں پڑتی ہیں کیونکہ تاوان جنگ میں سے ۵۲ فیصدی فرانس کو دیا جاتا ہے۔ مگر تجارتی قرضہ قریب قریب سو فیصدی ایسا ہے جو جرمنی کے تاجروں اور کارخانوں نے انگلستان اور امریکا کے بنکوں سے لیا ہے۔ چنانچہ صرف انگلستان کے بنکوں کا (غیر سرکاری) قرضہ بیس کرور پاؤنڈ (تین ارب روپیہ) تک پہنچ گیا ہے۔

غرض اب صورت حال یہ ہے۔ اگر جرمنی سیاسی قرضہ (تاوان جنگ) ادا نہ کرے تو حکومت فرانس کا بجٹ خطرے میں پڑ جائے گا لیکن فرانس کے لئے ان مشکلات کا برداشت کرنا ممکن ہے۔ وہ آج کل دنیا کا سب سے دولتمند ملک ہے لیکن اگر جرمنی اپنا تجارتی قرضہ نہ دے تو انگلستان اور امریکا کے بنک بیٹھ جائیں گے یعنی ان دونوں ملکوں کا پورا مالیاتی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

جیسا ڈاکٹر برونگ نے اپنے اعلان میں کہا جرمنی سیاسی قرضے کے ادا کرنے سے بالکل معذور ہے مگر وہ تجارتی قرضہ ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔ جرمنی کے اس رویئے سے انگلستان اور امریکا کی تجارت محفوظ رہ سکتی ہے گو اس میں فرانس کا نقصان ہے۔ اسی لئے انگلستان اور امریکا مل کر فرانس کی مخالفت کر رہے ہیں اور فرانس کی ہمت نہیں کہ جرمنی سے جنگ کا اعلان کرے کیونکہ یہ گویا انگلستان اور امریکا سے یعنی تقریباً کل مہذب دنیا سے کھلم کھلا دشمنی مول لینا ہے۔

اس صورت حال میں جو زبردست خطرہ پنہاں ہے اس کا تجربہ فرانس کو ابھی سے ہونے لگا ہے۔ چنانچہ آج ہی خبر آئی ہے کہ فرانس کی حکومت کو ایک ایسی متحدہ قومی مجلس وزرا ترتیب دینے میں کامیابی نہیں ہوئی جو روز افزوں

مشکلات کا مقابلہ کر سکے خصوصاً تاوان جنگ کی اُس کانفرنس میں جو لوزان میں ہونے والی ہے حصہ سکے اس نے استعفاء دیا۔

ان امور سے صاف ظاہر ہے کہ اگر اب یورپ میں کوئی جنگ ہوئی تو انگلستان جرمنی کے خلاف نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوگا۔

ہندوستان

صوبہ متحدہ میں عدم ادائیگی لگان کی تحریک | کچھ عرصہ ہوا صوبہ متحدہ کے بعض اضلاع میں کانگریس کی طرف سے عدم ادائیگی لگان کی تحریک اٹھائی گئی ہے جس سے ہندوستان کے سیاسی حالات میں ایک نئی صورت حال کا اضافہ ہو گیا ہے۔ صوبہ متحدہ مثل دوسرے صوبوں کے نہیں ہے کہ جہاں معاملہ کاشتکاروں اور حکومت کے درمیان ہو بلکہ یہاں پر دونو کے درمیان زمینداروں کا ایک طبقہ ہے کہ جس سے اصل کشمکش پیدا ہونے کا اندیشہ ہے زمینداروں کا یہ طبقہ انگریزی حکومت کا پیدا کردہ ہے یا یہاں کے زراعتی حالات کا لازمی نتیجہ ہے؟ یہ ایک تاریخی مسئلہ ہے جس سے سر دست بحث نہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ اس صوبے کی زراعتی زندگی کے تین خاص عناصر ہیں: (۱) کاشتکار (۲) زمیندار اور (۳) حکومت۔ ان ہر سہ عناصر کے باہمی اشتراک عمل اور توازن پر اس صوبے کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ ان عناصر کو باہم ایک دوسرے کی نسبت سے جو درجہ حاصل ہونا چاہیئے وہ اس وقت نہیں ہے لیکن اس باہمی امتزاج کی کشمکش میں کسی عنصر کو سرے سے خارج کر دینے کی کوشش کرنا اس صوبے کی زندگی کو شدید نقصان پہنچائے بغیر ممکن نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ گزشتہ کچھ عرصے سے دنیا کا عام معاشی نظام بہت کچھ بگڑا ہوا ہے اور ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی نے ہندوستان کی عام تجارتی حالات اور اس کی وجہ سے اجناس کی ارزانی نرخ نے صوبۂ متحدہ کی اقتصادی حالت کو اور بھی خراب کر دیا ہے۔ بیرون ہند اور ہندوستان کی عام کساد بازاری کی وجہ سے گزشتہ فصل ربیع کی پیداوار کاشتکاروں کے ہاں جوں کی توں پڑی رہ گئی اور ان کے فروخت نہ ہو سکنے کی وجہ سے روپیہ ان کے لئے عنقا ہو گیا ایسی صورت میں جب ادائیگی لگان کا وقت آیا تو کاشتکار بجائے نقدی ادا کرنے کے اجناس کے سوا کچھ نہ پیش کر سکے۔ لیکن غلے کے دانے سکے تو بن نہیں سکتے تھے، تھوڑی بہت جو کچھ بھی اجناس نقدی کی صورت میں تبدیل کی جا سکیں وہ ارزانی نرخ کے باعث بہت کم قیمت ثابت ہوئیں اور اس لئے تخفیف اور عدم ادائیگی لگان کا سوال پیدا ہوا۔

۔ صوبہ متحدہ میں مخصوص اس نوعیت کا سوال پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ یہ ایک تمام تر زراعتی صوبہ ہے یہاں کی آبادی کا ۷۶ فیصدی حصہ ایسا ہے جو تمام تر زراعت و کاشتکاری زندگی بسر کرتا ہے اور ۹ فیصدی ایسا جو جزوی طور پر گزران کرتا ہے۔ اس صوبے کی زراعت سے متعلق کل آبادی تین طبقوں پر مشتمل ہے۔ (۱) زمیندار جن کی تعداد کوئی بارہ لاکھ ہے اور جن میں بیشتر ایسے ہیں جو خود بھی کاشتکاری کرتے ہیں۔ (۲) کاشتکار جن کی تعداد ۵۵ لاکھ ہے، جو بذات خود کاشتکاری کرتے ہیں اور اپنی پیداوار کا ایک حصہ (خواہ بصورت جنس یا بصورت نقد) زمیندار کو بطور لگان دیتے ہیں (۳) مزدور جن کی تعداد ۱۰ لاکھ ہے جو صرف اجرت پر کھیتوں میں کام کرتے ہیں اور اپنی کوئی ملک یا حق کاشت نہیں رکھتے۔

صوبے کی یہ زراعتی مشکلات کچھ آج نئی نہیں بلکہ ایک زمانے سے چلی آتی ہیں۔ سماوی دشواریوں کے علاوہ کہ جن کا کلی انسداد یا امکان ارضی آج تک نہیں کر سکے، ایک بہت بڑا مسئلہ اس صوبے کی اضافہ آبادی کا ہے۔ زیادہ سے زیادہ قدیم اعداد جو یہاں کی آبادی کے ملے ہیں وہ اکبر بادشاہ کے زمانے کے ہیں اور اس وقت اس صوبے کی آبادی ۲ کروڑ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ پھر انگریزی عہد کی ابتدا یعنی ۱۸۵۱ء میں یہی تعداد بڑھ کر ۳ ½ کروڑ ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اب ۱۹۳۱ء کی تازہ مردم شماری سے یہ تعداد ۴ کروڑ ۹۵ لاکھ ہو جاتی ہے، گویا ہر دسویں سال یہاں کی آبادی میں ۶ر۲ فیصدی کا اضافہ ہوتا رہا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہاں کی مزروعہ زمین کا رقبہ بھی بڑھتا رہا ہے، لیکن وہ آج تک کبھی ۴ فیصدی سے آگے نہیں بڑھا۔

یہ کمی حکومت کی طرف سے ذرائع آبپاشی میں توسیع اور طریقۂ کاشت کی ترقی سے پوری کی جاتی رہی ہے اور کچھ عرصے سے حکومت کے تمام میلانات مزارعین اور کاشتکاروں کی حمایت اور تائید میں رہے ہیں۔ اب تک زمینداروں کو اپنے کاشتکاروں کو بے دخل کرنے کا جو حق حاصل تھا ان کے اس حق میں بہت کمی کر دی گئی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس وقت ۷۱ فیصدی کاشتکار موروثی کاشتکار ہیں، یعنی وہ اپنا حق کاشت اپنے بعد اپنی اولاد کو منتقل کر سکتے ہیں۔ ۲۹ فیصدی ایسے ہیں جنہیں حق حیات حاصل ہے یعنی زمیندار ان کی زندگی میں انھیں اس زمین کا حق کاشت سے محروم نہیں کر سکتا جس پر وہ کاشت کرتے چلے آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت کم تعداد ایسی رہ جاتی ہے جنھیں بہ ضرورت بے دخل کیا جا سکتا ہے۔ رسد و بیگار کا ایک نہایت تکلیف دہ حق جو ایک عرصے سے چلا آتا تھا وہ بھی بجز کسی خاص علاقے کے عام طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اور کوئی زمیندار اپنے اسامیوں سے بلا اجرت خدمت یا بلا قیمت غلہ نہیں لے سکتا۔

ابھی حال میں ایک بڑی چیز جو مزارعین کے حقوق کو محفوظ کرنے اور زمینداروں کی دست درازیوں کو روکنے کے لئے کی گئی ہے، وہ "قانون لگان اراضیات صوبۂ آگرہ" ہے جو ۱۹۲۶ء میں زمینداروں کے متفقہ مخالفت کے باوجود سوراجی اور سرکاری ممبران کے اتفاق آرا سے پاس ہوا تھا۔

یہ تمام تحفظات اور مراعات ہیں جو گزشتہ کچھ عرصے سے مزارعین اور کاشتکاروں کے ساتھ ہوتی رہی ہیں اور جن سے اس صوبے کے اندر اس طبقے کی حالت اگر بہت اچھی نہیں تو کچھ بہت بری بھی نہیں رہی ہے، لیکن گزشتہ سال کے اندر نرخ اجناس میں ۳۰ سے کر ۵۰ فیصدی تک کی یکبارگی کمی نے ایک نئی صورت حال پیدا کر دی ہے جس سے کاشتکار پورا لگان ادا کرنے سے ایک حد تک معذور ہو گئے۔ حکومت صوبۂ متحدہ نے اس کے لئے یہ کیا کہ ۳۲-۱۹۳۱ء کے کل مطالبات مالگذاری میں سے جو تقریباً ۷ کروڑ ہوتے ہیں۔ ایک کرور ۱۰ لاکھ کی کمی کر دی، یعنی تقریباً ۱۶ فیصدی کی رعایت ہو گئی۔ گویا موجودہ مطالبہ مالگذاری اب سے ۳۰ سال قبل کے مطالبے سے ۲۴ لاکھ یا ۴ فیصدی کم ہو گیا ہے۔ اور اسی طرح ۱۹ کرور ۴۰ لاکھ کے لگان میں ۴ کرور ۱۲ لاکھ کی کمی ہو گئی ہے۔ یعنی گویا کل مطالبات لگان پر ۲۱،۴ فیصدی رعایت ہو گئی ہے۔

یہ رعایتیں حکومت کی طرف سے خواہ کتنی ہی فیاضی کے ساتھ کی گئی ہوں کاشتکاروں کی مالی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ زمینداروں کی خصوصاً چھوٹے زمینداروں کی حالت بھی قابل رحم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کانگریس کی عدم ادائیگی لگان کی تحریک کا شکار سب سے پہلے اور سب سے زیادہ یہی ہوں گے۔ کاش کانگریس کے کارکنوں میں اور ان لوگوں میں کوئی مفاہمت ایسی ہو سکتی جس سے کاشتکاروں کی مشکلات واقعی رفع ہو جائیں۔ مشکل یہ ہے کہ اقتصادی مسئلوں کے ساتھ سیاسی مصلحتیں ایسی گتھ گئی ہیں کہ جو گرہیں آسانی سے سلجھ سکتی تھیں وہ اور پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں۔

عالم اسلامی

موتمر اسلام

گزشتہ مہینے کا سب سے اہم واقعہ موتمر اسلام کا وہ عظیم الشان اجلاس ہے جو قدس الشریف میں منعقد ہوا اور جس کو سیاسیات حاضرہ میں بلاشبہ ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سے پہلے بھی مصر و حجاز میں موتمر کے دو اجلاس منعقد ہو چکے ہیں لیکن ان کا تعلق زیادہ تر ہنگامی واقعات سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلامی کے

باہمی ربط و ضبط کے لئے ان سے کوئی خاص نتائج مرتب نہیں ہوئے۔ برعکس اس کے اجلاس قدس کے انعقاد میں ایک نہایت اہم اور ضروری مقصد پیش نظر تھا اور وہ یہ کہ مسلمانان عالم کہیں وقتی اور مقامی مصروفیتوں کے خیال میں اپنے ملی اور تمدنی مصالح کو فراموش نہ کردیں۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت عجیب ہے اول تو ان کو اسلام سے بطور ایک تمدن یا نظام اجتماع کوئی ربط یا تعلق باقی نہیں رہا۔ مذہب کی حیثیت ان کے نزدیک کم و بیش ایک مجموعہ عقائد یا شکل عبادات کی سی ہوگئی ہے اور اس میں وہ قوت موجود نہیں رہی جو ان کے انفرادی نشوونما یا جماعتی زندگی کے قیام کا باعث ہو۔ ثانیاً ان کی وطنی اور مقامی ضروریات دن بدن ان کی توجہ کو اپنی طرف جذب کر رہی ہیں اور ذہناً ان کی حالت اس قدر پست ہوگئی ہے کہ وہ دنیا کے سیاسی اور معاشی حالات کی تعبیر اپنے دین مقدس کی روشنی میں نہیں کرسکتے۔ اگر کوئی شخص مذہب کا نام لیتا ہے تو وہ گھبرا اٹھتے ہیں اور ان کے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہوجاتی ہے کہ شاید اس کا مطلب ان کے سیاسی اور ملکی مصالح کی نفی ہے حالانکہ سیاست اور خدمتِ ملک و وطن میں ان کا رویہ مذہب اور تمدن کی طرف سے کچھ ایسی بے اعتنائی پیدا کردیتا ہے جس سے بجا طور پر تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس حماقت آمیز کشمکش میں گرفتار ہیں کہ آیا ان کی اجتماعی حالت اسلام کی بدولت سدھرے گی یا اول ان کی اجتماعی حالت ٹھیک ہوجائے گی اور پھر اسلام کو ترقی اور سربلندی نصیب ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں مقاصد الگ نہیں ہیں جیسا کہ غلطی سے بعض لوگ سمجھ لیتے ہیں بلکہ وہ ایک ہی مقصد کے دو مختلف اجزا ہیں جن کی تکمیل اور نشوونما ساتھ ساتھ ہوتی ہے ہم کسی ایسی ترقی کو صحیح معنوں میں دینی ترقی سے تعبیر نہیں کرسکتے جو اس کے پیروؤں کے انفرادی اور اجتماعی نشوونما کے لئے فلاح و کامرانی کا پیام نہ لائے نہ یہ ممکن ہے کہ اول ایک قوم اسلام کا اصول حیات ترک کردے اور پھر کسی دوسرے طریق سے آزادی اور ترقی کی طرف قدم بڑھا کر اس کی خدمت کا دعویٰ کرے۔ اسلام اور مسلمانوں کی دنیوی کامیابی میں ایک ایسا ربط قائم ہے کہ ایک کے ترک سے قدرتاً دوسرے کا ترک لازم آئے گا۔ لہٰذا ارباب موتمر کی یہ کوشش کہ مسلمانان عالم کے لئے عقائد و مسلمات یا وطنی اور ملکی ضروریات سے الگ کچھ ایسے ذرائع و وسائل تلاش کئے جائیں جن سے ان کے قوائے ملی میں از سر نو ایک تازہ حرکت پیدا ہو سراسر مستحق ستائش و مبارک باد ہے۔ یہ کہنا کہ دنیائے اسلام کے موجودہ حالات اس نئی تحریک کے لئے کہاں تک امید افزا ہیں۔ ایک طرح کا مغالطہ ہے اس لئے کہ اگر ہماری موجودہ فضا اس قسم کی تحریکوں کے لئے کچھ بہت زیادہ مساعد نہیں لہٰذا نظر بہ حالات اس کی کامیابی کے آثار کم ہیں تو یہ بھی ممکن نہیں کہ بجز اس قسم کی کسی تحریک کے ہم اپنے حالات میں کوئی خوشگوار

تبدیلی پیدا کرسکیں۔ جہاں تک ارباب موتمر کو فراست ایمانی حاصل ہے اور وہ تعلیمات اسلامی پر بصیرت کی نظر رکھتے ہیں اسی قدر مسلمانان عالم کی ضروریات کے متعلق ان کا اندازہ صائب اور ٹھیک ہوگا۔ اور جہاں تک اخلاص وہمت کے ساتھ وہ ان کے اہتمام میں سرگرم عمل رہیں گے اسی قدر ان کی کامیابی یقینی ہے۔ ہماری رائے میں بطور ایک تمہیدی اور افتتاحی اجلاس کے موتمر کا انعقاد نہایت کامیاب رہا اور اگرچہ ابتداہی میں اس سے کوئی بڑی بڑی امیدیں وابستہ کرلینا دانشمندی سے بعید ہے لیکن موتمر کے مختلف جلسے اور اس کی کارروائیاں ہمت افزا ضرور ہیں۔

البتہ یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ موتمر کا یہ اجلاس جس قدر اہم تھا اتنا ہی اس کے متعلق غلط بیانی بلکہ راز واخفاء سے کام لیا گیا۔ ایک تو مسلمانوں کی ذاتی کاوشیں اور ایک دوسرے سے بے اعتمادی اور بدگمانی کی مصیبت ہی کیا کم تھی اس پر طرہ یہ ہوا کہ خبر رسانی کے جملہ فرائض حضرت رائٹر نے ادا کئے۔ یہ بزرگ بڑے صیہونیت کے طرفدار، جہاں تک ممکن تھا اپنے اصول قومی کے مطابق ہر روایت میں کچھ ایسی تحریف کر دیتے تھے، جس سے موتمر کے متعلق کوئی صحیح خیال قائم کرنا دشوار تھا۔ انھوں نے اول تو جلسوں کے متعلق کوئی خاص اطلاعات بھیجی نہیں اور جو بھیجیں تو غلط۔ البتہ شرکائے موتمر کے باہمی اختلافات کو خصوصیت کے ساتھ شہرت دی گئی اور وہ ناگوار واقعہ جو ایک مصری مندوب کی بدولت ابتدائے موتمر میں پیش آیا اس کے متعلق خوب خوب رنگ آمیزی سے کام لیا گویا موتمر کی ساری کامیابی اور ناکامی کا دارومدار اسی ایک مندوب کے طرز عمل سے وابستہ تھا۔ اجلاس موتمر سے پہلے بھی مغرب کی خبر رساں ایجنسیاں اس مبارک تحریک کے بارے میں حتی الوسع مبالغہ آمیز بیانات اور گمراہ کن اطلاعات شائع کرتی رہیں۔ اول خلافت کا مسئلہ چھیڑ اگیا۔ پھر یہ فتنہ اٹھایا گیا کہ مفتی فلسطین جامعہ ازہر کے حریف بننا چاہتے ہیں۔ اس کے کچھ دنوں بعد یہ اطلاع موصول ہوئی کہ مسلمانان عالم نے موتمر کی دعوت پر کسی گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا، نہ کوئی اسلامی ریاست اس کی کارروائیوں میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مثلاً جب اجلاس موتمر سے کچھ مدت پہلے مفتی سید امین الحسینی قاہرہ تشریف لے گئے ہیں اور وہاں انھوں نے اکابر مصر سے موتمر کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے تو اس پر جریدۂ فلسطین کے نامہ نگار مصر نے جس انداز میں تنقید فرمائی وہ یہ تھا:۔

"۔۔ قاہرہ میں عام خیال یہ ہے کہ فلسطین کی مجوزہ اسلامی یونیورسٹی ازہر کے مقابلے پر قائم کی جارہی ہے ۔۔۔ مفتی فلسطین کہتے ہیں کہ اس یونیورسٹی کا مقصد صرف اس صیہونی جامعہ کے اثرات کو زائل کرنا ہے جو قدس میں موجود ہے ۔۔۔ انھوں نے یہ

بھی کہا ہے کہ موتمر سے مقصود مسلمانان فلسطین کی حالت کو مستحکم اور قوی بنانا ہے تاکہ وہ صیہونیوں کو اپنی اس خواہش میں کہ اماکن مقدسہ ان کے تصرف میں آجائیں کامیاب نہ ہونے دیں۔ الحاج امین اس معاملے میں صریحاً غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں ... اماکن مقدسہ کا مسئلہ محض ان کے ذہن کی پیداوار ہے ... اس لئے کہ اس کا تعلق صرف دیوار گریہ سے ہے جس کے بارے میں "مہذب دنیا" (دادین ہمارے ہیں) جمعیت اقوام کی خاص مجلس کا فیصلہ قبول کر چکی ہے ... مسلمانان مصر پر سید امین الحسینی کی اس کوشش کا جو ذاتی پر مبنی ہے کوئی اثر نہیں پڑا ... یہاں ہر شخص کو یہ بدگمانی ہے کہ مفتی فلسطین قدس کو خلافت کا مرکز بنانا چاہتے ہیں حالانکہ مصریوں کو ... خود اس کی خواہش ہے۔"

گویا ایک ہی وقت میں موتمر کے متعلق وہ تمام فتنے چھیڑ دئے گئے جن سے اس کے مقاصد کو نقصان پہنچنے کی توقع تھی۔ مسلمانان عالم کی باہمی رنجشوں اور ان کے رہنماؤں کے ذاتی اختلافات کا مسئلہ تو اب بہت پرانا ہو چکا ہے۔ اس کی بجا یا بے جا شہرت کے ساتھ ہی ہر ممکن کوشش کی گئی کہ ایک طرف خلافت اور ازہر کے نام سے امم اسلامیہ میں باہم رقابت کا جذبہ پیدا کیا جائے اور دوسری طرف مغربی الکمہ سیاست موتمر کے وجود کو اپنے اغراض و مقاصد کی راہ میں ایک زبردست خطرہ تصور کریں بنا بریں جہاں موتمر کے بظاہر ناکام جلسوں کی تصویریں نہایت مسرت اور اطمینان کے ساتھ کھینچی گئیں وہاں دبی زبان میں اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑا۔

"... یہ خیال کرنا نادانی ہوگی کہ موتمر بالکل ناکام رہی ... جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا۔ یہ حقیقت آشکارا ہوتی جائے گی کہ یہ موتمر امم اسلامیہ کے اس عزم کی تمہید ہے کہ وہ اپنے نظم و ضبط کی طرف متوجہ ہوں۔ جونہی یہ تحریک زیادہ سمجھدار لوگوں کے ہاتھوں میں آئی جیسا کہ یقینی ہے، اس سے مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کی سیاست متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گی یہ خیال ہے جو بہت سے مغربی اہل الرائے حضرات نے ظاہر کیا ہے اور ...."

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت جب ممالک اسلامی ایک دوسرے کی حالت سے قطعاً بے خبر ہیں۔ جب ہمارے اجزائے ملی میں ایک طوفان انتشار رونما ہے۔ نہ مذہب سیاست کا حامل رہا ہے نہ سیاست

مذہب کی آئینہ دار جب رائے عامہ کا وجود ہی نہیں اور اگر ہے تو ارباب حل وعقد اس کی ترجمانی نہیں کرتے، چند درد مند مسلمانوں کا عربیت وعجمیت اور عقائد ومسائل کے اختلافات سے قطع نظر کرتے ہوئے اس پاک اور مقدس سرزمین میں جمع ہو کر جسے انبیاء علیہم السلام کا مولد ومسکن ہونے کا شرف حاصل ہے اسلام کے مصالح تمدن پر غور کرنا اور بغیر کسی سرمائے یا ذرائع نشر واشاعت کے اس امر پر آمادہ ہو جانا کہ وہ ان کے تحفظ وحمایت کے لئے عملاً جد وجہد کریں، ایک ایسا مبارک اور حوصلہ افزا اقدام ہے جس کا خیر مقدم ہر مسلمان کو دلی مسرت کے ساتھ کرنا چاہئے۔ اب تک موتمر نے جن مسائل پر غور کیا ہے اور اس نے جو فیصلے صادر کئے ہیں وہ بتقاضائے وقت وحالات نہایت مناسب ہیں مثلاً اس کی یہ قرارداد کہ فلسطین میں ایک زرعی بنک قائم کیا جائے، یہود کے سامان تجارت کا مقاطعہ کر دیا جائے اور مسلمانوں کو صیہونیت کے خطرے سے مطلع کیا جائے فلسطین میں یہودی سازشوں کے سدباب کے علاوہ اہل فلسطین کی سیاسی اور اقتصادی ترقی کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی۔ جدید تعلیمی اصولوں کے ماتحت جامع اقصیٰ کا قیام اور مصر میں ایک جامع عربی لغت کی تیاری کا فیصلہ نہایت مستحسن ہے۔ اسلامی تمدن کی نشاۃ الثانیہ میں ان کی اہمیت کو نظر انداز کرنا نا ممکن ہے۔ یہ تحریک کہ تمام عالم اسلامی میں نوجوانان اسلام اپنی انجمنیں قائم کریں بلاد اسلامیہ کے باہمی ربط وضبط اور ان میں یگانگت اور وحدت کا احساس پیدا کرنے میں بڑے بڑے موثر ذرائع عمل کا موجب بن سکتی ہے۔ اسی طرح اماکن مقدسہ اسلام اور براق شریف کے تحفظ کا عہد، الحاد ولا مذہبیت کے خلاف تعلیمات اسلامی کے نشر واشاعت کا عزم اور حجاز ریلوے کو واپس لینے کا تہیہ کہ وہ ایک عظیم الشان اسلامی وقف ہے، نہایت ہی مبارک اور مفید ارادے ہیں جن کے حصول واتمام پر ممالک اسلامی کے لئے بلا شبہ نہایت اہم اور دوررس نتائج مرتب ہوں گے۔

البتہ یہ امر کہ مؤتمر کو ان مقاصد میں کہاں تک کامیابی ہو سکتی ہے بہت کچھ وقت طلب ہے اور اس کے متعلق ابھی سے کوئی خیال ظاہر کرنا پیش از وقت ہوگا لیکن اگر موتمر کے شرکا اور ان کی سرگرمیوں سے مستقبل کے متعلق کوئی توقع قائم کرنا ممکن ہے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کا اجلاس نہایت کامیاب رہا اور یقین ہے کہ تبدیلی حالات کے ساتھ اس کی کامیابی کی رفتار بھی برابر بڑھتی رہے گی اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ موتمر میں تقریباً وہ سب بزرگ موجود تھے جو اپنی خدمات اسلامی اور اخلاص و ایثار کے لئے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان حضرات نے موتمر کی تمام کارروائیوں میں نہایت گرمجوشی سے حصہ لیا۔ اس کی مختلف مجلسوں میں باہم مل کر کام کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی صحبتوں اور مشوروں میں

شریک ہوتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا آپس میں تبادلۂ خیالات بھی کیا۔ ناممکن ہے کہ ان ملاقاتوں اور گفتگوؤں سے کوئی نتیجہ مرتب نہ ہو۔ اس امر کا تو جناب رائٹر کو بھی اعتراف ہے کہ سید امین الحسینی کی مخالف جماعت کو موتمر کے مقاصد سے کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ موتمر کی تمام کارروائیوں سے ایک زبردست روح اخوت اور ولولۂ عمل کا اظہار ہوتا ہے اور ارباب موتمر نے اپنے قول و فعل سے اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی ضروریات کے ساتھ اسلام کے بلند و برتر مقاصد سے ناواقف نہیں۔ اس کے لئے صرف اس مسرت آمیز واقعہ کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ کہ ملتِ اسلامیہ کی وحدت اور اسلام کی بے تعصب اور تفریق و انتشار سے بالاتر روح کے تقاضے پر ایک شیعی رہنما یعنی سید محمد حسین الکاشف الغطائی نے جامع اقصیٰ میں امامت فرمائی اور تمام حضار موتمر نے ان کے پیچھے فریضۂ نماز ادا کیا۔ ہماری رائے میں موتمر کا انعقاد نہایت مناسب موقعہ پر عمل میں آیا ہے اور اس کا وجود جس سرزمین سے وابستہ ہے اس کے رہنے والے ان تمام خصائص عمل اور ملکات ذہنی کے مالک ہیں جو عزت و کامرانی کی شرط ہیں اور جن کے ہوتے ہوئے کوئی سعی و کوشش ناکام نہیں رہ سکتی۔ ممکن ہے ہم اپنی فرسودہ سیاست یا بے روح زندگی کی بدولت موتمر کے مستقبل سے ناامید ہوں لیکن ہمیں اپنی بے بصری اور کور ذوقی سے بڑھ کر ان بلند ہمت اور اولوالعزم لوگوں کے قوائے عملی و فکری پر اعتماد رکھنا چاہئے جن کو قدرت نے ایک حساس دل اور بے چین طبیعت عطا کی ہے اور جن کی حمیت دینی اور ذوق جہاد و حریت ایک عالم میں مسلم ہے۔ بفضلہ تعالیٰ موتمر میں وہ پختہ کار اور زیرک اہل سیاست بھی شامل ہیں جن کا فہم و تدبر اور حزم و احتیاط اعتراض سے بالاتر ہے اور اس میں وہ بالغ نظر اور نکتہ بیں ارباب بصیرت بھی شریک ہیں جن کو زندگی اور اس کے حقائق پر غیر معمولی دسترس اور عبور حاصل ہے یقین ہے کہ عالم اسلامی کے ہر حصے میں اس تحریک کا دلی جوش اور سرگرمی سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ البتہ اس کی کامیابی کا راز صرف اس اسلوب ذہنی پر منحصر ہے جس کی طرف موتمر کے خاتمے پر علامہ اقبال نے اشارہ کیا تھا۔ جب مندوبین کو الوداع کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہ ان سے بڑھ کر حقائق کی ترجمانی کا دعویٰ اور کون کر سکتا ہے فرمایا: "... اسلام کو اس وقت دو خطرے درپیش ہیں ایک الحاد و مادیت اور دوسرا وطنیت و قومیت کا، مجھے یقین ہے کہ اسلام کی پاک اور مقدس روح ان دونوں خطرات کو شکست دے سکتی ہے.. مجھے اسلام کے دشمنوں سے اتنا اندیشہ نہیں جتنا خود مسلمانوں سے.. حضرت سرور کائنات صلعم کی ایک حدیث ہے انا حظکم من الانبیاء وانتم حظی من الامم۔ میں جب کبھی اس کا خیال کرتا ہوں تو میری گردن شرم و ندامت سے جھک جاتی ہے۔ کیا آج ہم مسلمان اس قابل ہیں کہ جناب رسالتمآب صلعم ہم پر فخر کریں، البتہ جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کرینگے جو رسول اللہ صلعم نے ہمیں عنایت فرمایا تھا تو ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ حضور ہم پر فخر کریں...."

شذرات

اردو اکادمی کا پہلا لکچر جس کا اعلان ہم پچھلے پرچے میں کر چکے ہیں، رجنوری کو ہوا۔ علاوہ جناب مقرر کے باہر کے ارکان میں سے جناب خواجہ غلام السیدین صاحب، جناب تجمل حسین صاحب، جناب یوسف الزمان صاحب اور جناب محمد یحییٰ صاحب تنہا تشریف لائے تھے۔ مقامی ارکان اکادمی اور دہلی کے دوسرے علم دوست حضرات بھی موجود تھے۔ خصوصاً کالجوں کے طلبہ بہت کافی تعداد میں شریک تھے۔ جلسے کا افتتاح خواجہ غلام السیدین صاحب صدر جلسہ کی تقریر سے ہوا۔ موصوف نے حاضرین کو لکچروں کے اس سلسلے کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، جو اکادمی نے شروع کیا ہے اور اکادمی کی علمی خدمات کے متعلق ہمت افزا امیدیں ظاہر کیں۔ اس کے بعد سید وہاج الدین صاحب کا تعارف کرایا۔ سید صاحب علی گڑھ کے مایۂ ناز طالب علم ہیں۔ آپ نے ۱۹۲۰ء میں بی اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور اسی سال سرکار نظام کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ وہاں سے ٹریننگ کے لئے ڈھاکہ بھیجے گئے اور اول نمبر پر کامیاب ہو کر واپس آئے۔ اب آپ اورنگ آباد کے عثمانیہ کالج میں معاشیات اور نفسیات کے پروفیسر ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات کا شاہد رسالہ "اردو" ہے جو آپ کے متعدد گراں قدر ترجمے شائع کر چکا ہے۔ گذشتہ سال ہندستانی اکیڈمی نے آپ کی ایک تالیف "نفسیات ترغیب" پر انعام دیا ہے۔ آپ کے اسلوب بیان کی یہ خصوصیت ہے کہ دقیق علمی مضامین کو ایسے دلپذیر اور دلنشین انداز میں پیش کرتے ہیں گویا پتھر کو پانی کر دیتے ہیں۔

جناب صدر کی تقریر کے بعد سید وہاج الدین صاحب نے اپنا فاضلانہ مقالہ "نفسیات مذہب" پڑھا جس کا خلاصہ آئندہ مہینے رسالہ جامعہ میں شائع ہوگا اور پورا لکچر رسالے کی شکل میں تین چار مہینے کے اندر چھپ جائے گا۔

آخر میں جناب صدر نے فاضل مقرر کا شکریہ ادا کیا اور لکچر کے موضوع کے متعلق حاضرین کو اپنے خیالات سے مستفید فرمایا۔ جلسہ جناب شیخ الجامعہ کی تقریر پر ختم ہوا جس میں موصوف نے اکادمی کی طرف سے جناب صدر اور فاضل مقرر کی خدمت میں تحفۂ سپاس و امتنان پیش کیا۔

اکادمی کا دوسرا لکچر ۱۴ر فروری یوم یکشنبہ کو منعقد ہوگا۔ وقت کا تعین ابھی نہیں ہوا ہے۔ حضرات اراکین کو دعوت ناموں کے ذریعے اطلاع دے دی جائے گی۔ جناب قاضی عبدالغفار صاحب سابق مدیر جمہور، جمال الدین افغانی کی سیرت پر تقریر فرمائیں گے جس کے متعلق موصوف مدت سے تحقیق و

تدقیق کر رہے ہیں۔ جناب پروفسر محمد حبیب صاحب استاد تاریخ مسلم یونیورسٹی نے جلسے کی صدارت کا وعدہ فرمایا ہے۔

ہم اس نمبر میں جناب نواب نصیر حسین صاحب خیالؔ کا ایک مضمون "ہماری شاعری" کے عنوان سے شائع کر رہے ہیں۔ یہ ایک خطبہ ہے جو جناب موصوف نے مسلم یونیورسٹی کے "یونین" کے لئے مرتب فرمایا تھا۔ ہم نواب صاحب کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے یہ مضمون رسالہ جامعہ میں اشاعت کے لئے عنایت کر دیا۔ نواب صاحب کے کیف بیان سے خمخانۂ ادب کے پرانے میخواروں نے تو ایسے ایسے لطف اٹھائے ہیں کہ اب تک مزے لے رہے ہیں لیکن نئے پینے والے اس لذت سے محروم ہیں کیونکہ ایک [illegible] نے بزم خیال کے میکدۂ بے خروش کو چھوڑ کر عرصۂ عمل کو جولان گاہ بنا لیا ہے۔ شکر ہے کہ خیالی خم کی مہر ٹوٹی اور بادۂ کہن میں پھر جوش آیا۔ اسی ایک مضمون سے ناظرین جامعہ کو حضرت خیال کے طرز تخیل اور طرز ادا کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس میں آپ نے شاعری کو اس رنگ میں دکھایا ہے جس میں آج کل کے وجدانی حکیم فلسفے کو دکھاتے ہیں یعنی اس پر اسرار قوت کے ذریعے سے جسے وجدان کہتے ہیں بغیر عقل و ادراک کی مدد کے حقیقت اور سرچشمۂ حقیقت میں ڈوب جانا یا یوں کہئے کہ اپنی روح کو روح کائنات سے ہم آہنگ کر کے کائنات کی ہم آہنگی، تناسب، "ترصیع" یعنی حسن کا جلوہ دیکھنا اور دکھانا۔ اس چیز کو پیش نظر رکھ کر حضرت خیال نے تاریخ کے چند مناظر دکھائے ہیں جن میں عام تمدن کا ایک دھندلا سا خاکہ کھینچ کر اس میں ہر دور کی شاعری کا نقش ابھارا ہے۔ ہماری رائے میں ناظرین حضرت خیال کے اسلوب بیان کی حلاوت اور کیف سے سرور حاصل کرنے کے بعد بھی تشنہ لب رہ جائیں گے اور موصوف سے فرمائش کریں گے کہ جس گردہ تصویر کی انھوں نے طرح ڈالی ہے اس میں رنگ بھر کر اسے مکمل کر دیں۔

ہم نے افسانہ نویسی کے جس انعامی مقابلے کا اعلان کیا تھا اس کے لئے آخر دسمبر تک متعدد افسانے موصول ہوئے جو کمیٹی کے سامنے پیش کئے گئے۔ افسوس ہے کہ کمیٹی کے نزدیک کوئی افسانہ اس معیار پر پورا نہیں اترا جو انعام کے لئے مقرر کیا گیا تھا اس لئے یہ فیصلہ ہوا کہ ان میں سے دو تین افسانے رسالے میں شائع کرنے کے لئے منتخب کر لئے جائیں اور انعام کی رقم ان کے لکھنے والوں میں تقسیم کر دی جائے۔ یہ افسانے آئندہ چند مہینے کے اندر شائع ہوں گے اور اشاعت کے بعد مجوزہ معاوضہ مصنف کی خدمت میں بھیج دیا جائے گا۔

آپ مکتبہ جامعہ سے طلب فرمائیں

چندہ سالانہ پانچ روپیہ

قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ

پرنٹر، پبلشر: محمد مجیب بی اے (آکسن)

نئی



جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۱۸ | بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۳۲ع | نمبر ۱

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

A.H. Faruqi 1927

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۸ | بابتہ ماہ فروری ۱۹۳۲ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

(محمد مجیب بی۔ اے آکسن، پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرولباغ سے شائع کیا)

نفسیاتِ مذہب

یہ اس خطبہ کا خلاصہ ہے جو سید وہاج الدین صاحب بی اے ، بی ٹی پروفیسر عثمانیہ کالج اورنگ آباد نے اردو اکادمی کے جلسے میں ، ۲ جنوری ۱۹۳۲ء کو پڑھا تھا ۔ امید ہے کہ پورا خطبہ دو تین مہینے کے اندر رسالے کی شکل میں چھپ کر اورارکان اکادمی کی خدمت میں پہنچ جائے گا ۔

(مدیر)

مذہبیت یا حاسہ مذہبی ، فطرت انسانی کے سربستہ اسرار میں سے ہے جن کی تحلیل دشوار ہے ۔ اس کی نزاکت اور لطافت ، علمی موشگافیوں کی تحمل نہیں ہوسکتی ، یا یہ کہئے کہ خشک علمیت اس کی عقدہ کشائی کی صلاحیت اور اہلیت نہیں رکھتی ، اور مذہب کے علمی مفتش کو قدم قدم پر یہ طعنہ سننا پڑتا ہے کہ

از بے خبری ، بے خبراں معذورند ذوقیست دریں بادہ کہ مستاں دانند

مذہب کو ٹٹولنا صرف انجان جگہوں میں قدم رکھنا ہی نہیں ہے ، بلکہ انسان کے متاع دل اور روحانی سرمایہ پر ہاتھ ڈالنا ہے ۔ بقول میر

یہ کارگاہ ساری ، دوکان شیشہ گر ہے

کچھ مذہب ہی پر موقوف نہیں نفس انسانی کی تمام تاثرات ، تمام جذبات ، تمام وجدانات اسی نوع کے شخصی اور سربستہ راز ہوتے ہیں ۔ ان کی پوری پوری حقیقت اور معنویت سے اگر کوئی واقف ہوتا ہے تو صرف وہ نفس جو انہیں آغوش میں پال رہا ہو ۔ دوسرا انھیں سمجھ ہی نہیں سکتا غریب فلسفی اور نفسیات داں اپنا ہی کھاتے ہوئے دور کا دور ہی کھڑا رہتا ہے ۔ وہ زیادہ سے زیادہ ان تاثرات کی توجیہ کردے گا ۔ ان کی تقسیم در تقسیم کر ڈالے گا ۔ کوئی موٹی سی اصطلاح بتادیگا اور بس ۔ اس سے زیادہ کا وہ اہل نہیں ۔ محض دقت نظر اور نظری علمیت اس کے کام نہیں

آسکتی جب تک کہ وہ ویسا ہی جیتا جاگتا، فروزان، رخشندہ وجہندہ شعلۂ احساس اپنے دل میں نہ پیدا کرلے۔ اس موضوع پر بحث کرنے سے پہلے اقبال کی زبان میں میری دعا صرف یہ ہے کہ:

یارب! درون سینہ دل باخبر بدہ ۔۔۔۔ در بادہ نشہ را نگرم، آں نظر بدہ

مذہب کی تعریف | تاثرات اور وجدانات کی تعریف عموماً بہت دشوار ہوتی ہے، یہ چیزیں سراسر کیفی اور ذوقی ہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ ان کے مظاہرات بیان کر سکتے ہیں، یا ان کی ماہیت بتا سکتے ہیں، لیکن ان کی کوئی جامع ومانع تعریف کرنا اگر ناممکن نہیں تو کم از کم دشوار ضرور ہے، یہی حال بدرجۂ اتم حاسہ مذہبیت کی تعریف کا ہے۔ خود عالمان دین اس کی تعریف پر متفق نہ ہوں، باطن شناسان حقیقت اور رمز آشنایان معرفت

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نیست

کہہ کر چپ ہو جاتے ہوں، تو فلسفیات داں ایک تعریف پر کیونکر قائم اور متفق ہو سکتے ہیں۔ ...

مذہبیت کے لازمی عناصر تین ہیں، عمل، ایمان اور مذہبی تاثرات، لیکن ان تینوں کی ہم آہنگی ضروری ہے، محض عقیدہ بغیر عمل صالح کے، مذہب کے مفہوم سے اتنا ہی مستبعد ہے، جتنا کہ محض اخلاقی عمل بغیر ایقان اور ایمان کے۔ پس ان مختلف اجزا کا سمونا ضروری ہے۔ چونکہ ہماری بحث کسی خاص عرفی مذہب سے نہیں بلکہ ان کی قدر مشترک یعنی حاسہ مذہبیت سے ہے، اس لئے ہم اس کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ "انسان کے وہ تمام افعال تاثرات اور تجربات جو اس عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں کہ ایک ہستی بزرگ و برتر موجود ہے جو حقیقت کا سرچشمہ اور نجات کا مدار ہے" یہ تعریف ہمارے موضوع کے لئے بہت موزوں ہے، اس لئے کہ جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے، ہمارا تعلق خاص خاص مذاہب اور ان کے مخصوص ارکان وعبادات ودیگر ادارات سے نہیں، بلکہ عبد اور معبود کے تعلق سے ہے یعنی اس حاسہ روحانی سے جو ہر شخص میں موجود رہتا ہے، خواہ وہ اعمال وعبادات مذہبی کی شکل میں ظاہر ہو یا نہ ہو، عالم لاہوت کے متعلق ہو، یا ناسوت کے، شریعت ہو یا طریقت، منصور کا نعرہ "انا الحق" ہو

یا اس گڈریے کا عقیدہ تجسیم و تشبیہ جس کا قصہ مولانائے روم نے لکھا ہے۔

ان دیکھی حقیقت پر ایمان | عشق مجازی کی طرح عشق حقیقی، جسے ہم نے حاسہ مذہبی کہا ہے، کوئی ایک جذبہ نہیں، بلکہ وجدان ہے اور مختلف جذبات سے مرکب ہے۔ وجدان اور جذبے میں یہ فرق ہے کہ وجدان کوئی خاص جذبہ نہیں بلکہ ایک مجموعی ذہنی کیفیت یا رجحان نفس کا نام ہے جس کے ماتحت مختلف اوقات میں مختلف جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔

اگر سوال کیا جائے کہ مذہبیت کی امتیازی خصوصیت کیا ہے تو عام لفظوں میں اس کا جواب یہ ملے گا کہ مذہبیت کی بنیاد یہ عقیدہ یا ایمان ہے کہ ہمارے اس عالم مجاز و محسوسات سے بالاتر، ہمارے نظام کائنات سے ارفع و اعلیٰ ایک ان دیکھا نظام موجود ہے، جس کے منشاء کے ساتھ خود کو مطابق کرنا انسان کا خاص فرض ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خود اس

دیکھے بھالے بن سوجھے جانے پہچانے، بن بوجھے"

وجود کا احساس انسان کے نفس میں کیونکر ہوتا ہے۔ جب ہم ایمانی کیفیت کے اثر پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ماتحت وجود باری تعالیٰ کا احساس (تصور نہیں، بلکہ احساس)، ایک حقیقت محسوس کی طرح انسان کے ساتھ رہتا ہے، بقول امام غزالیؒ کے

"طریقہ تصوف پر کاربند رہنے سے ایک ایسی وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی حیثیت ایک صریحی ادراک کی سی ہوتی ہے، جیسے کہ انسان خود اپنے ہاتھ سے کسی چیز کو ٹٹول رہا ہو"

اقتضائے ایمانی سے ان دیکھی حقیقت، دیکھی بھالی، سمجھی بوجھی حقیقتوں سے زیادہ حقیقی بن جاتی ہے اور جس طرح ایک مقناطیس کی جنبش سے گرد و پیش کی آہنی اشیاء مقناطیسیت سے بھر جاتی ہیں، اسی طرح سے ایمانی مقناطیسیت انسانی شعور کے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتی ہے اور اس کے حواس پر غالب آجاتی ہے، کائنات کا ہر ذرہ تجلی زار نظر آتا ہے۔ صفات الٰہی، رحیمی و کریمی، جباریت و قہاریت عدل و احسان محض تصورات نہیں بلکہ محسوسات بن کر دنیا میں ہر طرف محیط نظر آتے ہیں۔

ایمان باللہ کے اجزائے نفسی | اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود یہ ایمانی کیفیت جس سے ان دیکھی حقیقت موجود بن جاتی ہے، کیا چیز ہے؟ عقیدہ یا ایمان کے پانچ نفسی محرکات، ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں یعنی (۱) سب سے پہلے روایت بچپن کی تعلیم اور ماحول کا اثر جسے ہم اثر پذیری یا انفعالیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ (۲) دوسرے فطرت کے حسن و جمال کا تصور اور کائنات کے توازن اور ہم آہنگی کو دیکھ کر مبدء فیاض کا یقین۔ اسے ہم فطری عنصر کہہ سکتے ہیں۔ (۳) تیسرے اخلاقی کشمکش کا احساس اور اس سے ایک اعلیٰ اخلاقی مقنن کے وجود کا یقین اسے ہم اخلاقی عنصر کہیں گے (۴) چوتھے داخلی تاثری عنصر، مثلاً انسان میں مذہبی جذبات کا پیدا ہونا، انکسار، کسر نفس، سوز و گداز، رقت قلب وغیرہ صوفیانہ کیفیت نفسی اسی عنصر میں آتی ہے (۵) اور سب سے آخر میں عقل و استدلال کا عنصر مثلاً نظام کائنات کی باقاعدگی اور ترتیب سے یہ عقیدہ پیدا ہو جاتا کہ اس مستمر النظام عالم کی خالق کوئی نہ کوئی صاحب مشیت ہستی ضرور ہے، ہم اس ترتیب سے فرداً فرداً ان عناصر خمسہ سے بحث کریں گے۔

(۱) روایتی عنصر یا اثر پذیری۔

انسانی سیرت کی تشکیل میں تفکر اور استدلال کا دخل اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اس کی عادتوں، اس کے اخلاق اور اس کے معتقدات کو سانچے میں ڈھلنے والے زیادہ تر ماحول تعلیم اور تربیت کے اثرات ہوا کرتے ہیں۔

ہمارے مذہبی عقائد میں بھی بہت زیادہ دخل بچپن کے ماحول اور تعلیم و تربیت کا ہوتا ہے کوئی بچہ ذات باری تعالیٰ کا ایمان، عقلی ثبوت سے نہیں بلکہ ماں کی گود میں، یا خاندان والوں کے افعال و اقوال کی وجہ سے حاصل کرتا ہے اور اس طرح جو بنیادیں قائم ہوتی ہیں وہ اٹل ہوتی ہیں۔ دوسروں کے علاوہ، انسان خود اپنے نفس پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ دعا اور عبادت کا اثر اسی قسم کا خود آفریدہ اثر ہوتا ہے۔ انسان جب صدق دل سے دعا مانگتا ہے تو اپنے قلب میں طمانیت اور سکون کا اثر پاتا ہے۔ عبادت میں خضوع و خشوع سے نفس میں انکساری اور فروتنی پیدا ہوتی ہے۔ مرشد کے سامنے حاضر ہو کر مشکلیں بیان کرنے سے نفس کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ ارشاد و ہدایت سے نفس کو رہبری ملتی

ہے، منتشر ذہن میں یک سوئی پیدا ہوتی ہے۔ ہر مذہب کی عبادت کا فلسفہ زیادہ تر اثر پذیری ہی کے ضمن میں آتا ہے عبادت کے ارکان و قواعد ایسے ہوتے ہیں جن سے نفس کی اثر پذیری بڑھ جاتی ہے۔ جسمانی طہارت و پاکیزگی کا انعکاسی اثر ذہن پر پڑتا ہے۔ عبادت گاہوں کی خاموش فضا احترام کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ حضور قلب حاصل ہوتا ہے۔ عبادت کے الفاظ سے تسکین ہوتی ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔

نہ صرف عقیدہ یا ایمان، بلکہ ہر قسم کے معتقدات اور ہر قسم کی تعلیم بھی اسی انفعالیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایک عالم کے علمی معتقدات کا جائزہ لیا جائے تو اس میں بھی یہی عنصر موجود ملے گا۔ نفسیات جدید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آج اس نے یہ حقیقت ثابت کر دی ہے کہ انسانی زندگی تعقل اور استدلال کی اتنی ماتحت نہیں ہے جتنی جذبات و وجدانات کی۔ نظام نفسی ارسطو اور مل کے منطقی قوانین کا اتنا پابند نہیں ہے جتنا والہانہ جذبات و وجدانات کا۔ انسانی زندگی میں جو کچھ خوش گواری پائی جاتی ہے، ہمارا مذہب، ہمارا ادب، ہمارے فنون لطیفہ سب کا سر چشمہ یہی غیر فکری عناصر ہیں اور یہ انسان کے لئے باعث ننگ نہیں ہیں۔

(۲) فطری عنصر

مناظر فطرت اور حسن قدرت کا دخل عقیدہ یا ایمانی کیفیت پیدا کرنے میں ہمیشہ رہا ہے۔ اس وقت بھی جب کہ انسان وحشی اور غیر متمدن تھا، اس کے پاس مذہبی سہارا نہ تھا اور نہ روحانی سرمایہ، وہ فطرت کے جمال میں حسن ازل کی جھلک دیکھتا تھا، پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش گویائی پکار پکار کر اسے ایک وجود کی طرف متوجہ کرتی تھی، سورج کی خنگیں کرنوں میں چاند کی ٹھنڈک میں صبح کی صباحت اور شام کی ملاحت میں اسے آیات الٰہی نظر آتی تھیں اور وہ اپنے عقیدے کا اظہار ان کی پرستش سے کرتا تھا۔ آج اگرچہ ان محدود اور مخصوص معنوں میں مظاہر پرستی دنیا میں نہیں پائی جاتی، لیکن فطرت کے حسین مناظر اب بھی دیکھنے والوں سے احترام اور عقیدت کا خراج وصول کرتے ہیں۔ سخت سے سخت دل پگھل جاتے ہیں اور بے حس لوگ بھی "فتبارک اللہ احسن الخالقین" پکار اٹھتے ہیں۔

اس ایمان آفریں احساس فطرت میں ہمیں تین قسم کے نفسی تجربات نظر آتے ہیں، احساس رحمت الٰہی، احساس توازن کائنات اور احساس حسن وجمال، یہ تین اجزا انسان کے دل میں ایمانی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کیفیت کو صوفیانہ کیفیت نفسی بھی کہتے ہیں۔

(۲) - اخلاقی عنصر

انسان کو عالم صغیر کہا گیا ہے اور عالم کبیر کی طرح یہ عالم صغیر بھی یعنی نفس انسانی بھی محل کون وفساد ہے - ایک طرف تو انسان کے طبعی تقاضا، خواہشیں، جبلتیں اور جذبات ہیں جو آمادہ اظہار رہتے ہیں اور تسکین چاہتے ہیں، دوسری طرف عالم خارجی میں ایک عنصر ایسا موجود ہے جو ہمیشہ ان فطری تقاضاؤں کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ اس سے متصادم ہوتا رہتا ہے۔ یہ خارجی عنصر کیا ہے، ملک یا جماعت کا اخلاقی قانون، اولاً جب کوئی انسان، اپنے نفس میں متضاد جذبات وخواہشات کی ہنگامہ آرائی دیکھتا ہے، کچھ رجحانات ایسے پاتا ہے جو اسے اتباع قانون کی طرف مائل کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اسے اخلاقی قانون کی خلاف ورزی پر آمادہ کرتے اور ابھارتے ہیں تو وہ بر خود قیاسی کے تقاضے سے مجبور ہو کر، جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، تائیدی رجحانات کو "خیر" اور تردیدی خواہشات کو "شر" سمجھتا ہے اور انھیں دو علٰحدہ علٰحدہ قوتوں سے منسوب کرتا ہے، یعنی رحمانی خیالات اور شیطانی خیالات دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ انسان اس تصادم کے احساس ہی سے فطری طور پر یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس اخلاقی دار وگیر میں انسان کو راہ ہدایت پر قائم رکھنے اور شر سے بچانے کے لئے ایک اعلیٰ مقنن کا وجود ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی جماعت کا اخلاقی قانون اور عدالت کے تادیبی قوانین ایک حد تک انسانی کردار کی نگرانی کرتے ہیں لیکن صرف انھیں کا اثر انسان کو خیر پر قائم رکھنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ ان قوانین سے زیادہ سے زیادہ وہ اخلاق پیدا ہو سکتا ہے جسے انگریزی میں "Daylight Morality" "اجالے کا اخلاق" کہتے ہیں، یعنی اگر کوئی دیکھتا نہ ہو، اگر افشا ہونے کا اندیشہ نہ ہو، قانونی شکنجے سے بچنے کا موقع ہو تو پھر انسان بدی کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی سلیم الطبع شخص اس اخلاق کو اچھا نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے وہ تقاضائے فطرت سے اس عقیدے پر مجبور ہوتا ہے کہ

صحیح معنوں میں ضبطِ اخلاق صرف ایمان باللہ ہی سے ہو سکتا ہے، یعنی ایک سمیع و بصیر، علیم و خبیر ہستی پر ایمان
لانے سے جو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اور جس کی طرف ہر انسان کو آخر میں جانا ہے۔ بعض طبائع
اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کے تمام افعال کا سرچشمہ محبت الٰہی ہوتی ہے، اور بعض طبائع میں حاسہ
مذہبی کی محرک خشیت الٰہی ہوتی ہے۔ کسی کو شانِ رحیمی و کریمی کے تصور میں ایمانیت کا لطف آتا ہے
تو کسی کو جباریت اور قہاریت کے تصور میں۔ کسی کی مذہبیت میں تولا، غالب ہوتا ہے تو کسی کے یہاں
تورع۔ کوئی پابندی شریعت سے تسکین قلبی حاصل کرتا ہے تو کسی کو جادۂ طریقت میں اپنا مطلوب مل جاتا ہے
غرض تفقہ، شریعت اور تورع میں اخلاقی عنصر نمایاں ہوتا ہے یعنی ذات باری تعالیٰ کو ایک اعلیٰ مقنن سمجھنا
عقوبت الٰہی کے خوف کو ہر وقت سامنے رکھنا امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تصوف، طریقت اور تولا میں
تاثری عنصر غالب ہوتا ہے یعنی محبت الٰہی اور عشق حقیقی کے جذبات قلب پر وارد کرنا، ایمانیت کا جزو
دونوں میں ہے۔ فرق صرف طریقے میں ہے

(۴) داخلی تاثری عنصر۔

مذکورہ بالا بحث ہی میں خود بخود مذہبیت کے داخلی تاثری عنصر کی بحث کی طرف لے جاتی ہے۔
نفسیات میں تاثرات کی اصطلاح، جذبات، وجدانات اور حسی جبلیات کے لئے استعمال ہوتی ہے۔
اگرچہ فلسفۂ مذہب، یا الٰہیات کے نام سے، مذہب میں عقلی عنصر داخل کرنے کی کوشش ہمیشہ کی گئی ہے
اور جب تک انسان، انسان ہے اور اپنے یقین اور عقیدے کے لئے دلیلیں ڈھونڈتا رہے گا، اس
وقت تک یہ کوشش بھی جاری رہے گی، لیکن مذہبیت کو علیت اور فلسفے کی خراد پر چڑھانے کی اس
کوشش کے باوجود، نفسیات مذہب کا مطالعہ انسان کو جس نتیجے پر پہنچاتا ہے وہ یہی ہے کہ حاسۂ
مذہبیت، ہمیشہ ہر شخص کی جذبی اور تاثری حیات شاعرہ کا ایک راز ہے، اور سراسر ایک انفرادی اور
شخصی چیز ہے، مذہبیت کی جڑیں اگر کہیں ملیں گی تو صرف تاثرات کی گہرائیوں میں فلسفہ اور الٰہیات
کی حیثیت زیادہ سے زیادہ وہی ہے، جو ایک متن کے کسی غیر زبان میں ترجمہ کی ہوتی ہے۔
غرض مذہب کا اساس "سوز و گداز" ہے اور چونکہ اسی کو اصطلاح میں تصوف کہتے

ہیں، اس لئے اس حصے میں ہماری بحث خاص طور پر تصوف ہی سے ہوگی۔

اگر ہم اپنے دل سے یہ سوال کریں کہ انسانی زندگی کی خاص الخاص غرض اس کی سب سے بڑی قوت محرکہ کیا ہے، تو جواب ملے گا کہ خوشی کی تلاش، خوشی کس طرح حاصل کیا جائے، کہاں ڈھونڈھی جائے، کس طرح قائم رکھی جائے۔ یہی خواہش از آدم تا ایں دم، بنی نوع انسان کے تمام افعال کی اصلی محرک رہی ہے جس حد تک کہ خدا سے لو لگانا، اور اس کی رضا جوئی انسان کے غمگین دل کو، جو عقلی جستجو اور کاوش فکری کا زخم خوردہ رہا ہے، مسرت سے مالا مال کر سکتی ہے، اس حد تک وہ ایمان باللہ پیدا کرنے میں موثر ہوتی ہے۔

اسی طرح جذبہ مسرت کا عکس یعنی غم کا تاثر بھی انسان کے حاسۂ مذہبی کو بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دنیا گزشتنی وگزاشتنی ہے مایاجال ہے۔ یہاں قدم قدم پر کلفت اور مصیبت ہے، یا زنجیر ان ثبات کے دم توڑنے کا نظارہ ہے، وارو گیر ہے۔ رستخیز ہے۔ یہ خیال بھی انسان کو حقیقی اور باقی مسرت کے سرچشمہ کی طرف لے جاتا ہے، وہ نجات کی تلاش کرتا، اور خدا کو پالیتا ہے اگرچہ بادی النظر میں یہ دونوں پہلو، مسرت اور غم، رجائیت اور قنوطیت ایک دوسرے سے متضاد نظر آتے ہیں۔ لیکن حاسۂ مذہبیت کے بیدار کرنے میں دونوں یکساں طور پر موثر ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب میں ہمیں یہ دونوں اجزا سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان دو اساسی تاثرات کا جو اثر مذہبیت پر پڑتا ہے۔ اس کی اس مختصر بحث کے بعد اب ہم ان تاثرات سے بحث کرتے ہیں جو تصوف کی کیفیت نفسی میں پائے جاتے ہیں۔

تصوف | اصطلاح تصوف کی تعریف کی کوشش میں نہیں کروں گا۔ اس سے میری مراد نفس کی وہ تاثری کیفیت ہے جب عبد اور معبود کے درمیان وجدانی رشتہ پیدا ہو جاتا ہے، اب خواہ اس کیفیت میں رقت وسوز گداز کا پہلو نمایاں ہو، یا مسرت آمیز وجد وحال کا۔ اس صوفیانہ کیفیت نفسی کی بہترین مثال اگر کچھ ہو سکتی ہے تو وہ عشق کی کیفیت ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ عشق مجازی کا معروض مادی اور محسوس ہوتا ہے اور عشق حقیقی کا معروض ایک تصور ہوتا ہے جس میں محسوسات کی کیفیت پائی

جاتی ہے۔ اگر صوفیانہ واردات قلب کی نفسیاتی تشریح کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ان میں حسب ذیل چار خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ صوفیانہ کیفیت نفسی کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ناقابل اظہار اور ناقابل بیان ہوتی ہیں۔ وہ

دل من داند و من دانم و داند دل من

کا مصداق ہوتی ہیں۔ انسان اگر اسی نفسی حالت کو بیان کرنا چاہے تو صرف مثالوں سے اپنا مطلب سمجھا جا سکتا ہے۔ بقول غالب

بنتی نہیں ہے، بادہ و ساغر کہے بغیر

جس طرح سے موسیقی سے کوئی کن رس ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے، یا عشق کی کیفیت کو کوئی عاشق ہی سمجھ سکتا ہے، اسی طرح صوفیانہ کیفیات نفسی کے سمجھنے کے لئے ضروری ہو کہ اسی قسم کے واردات قلب پر طاری ہوئے ہوں۔

۲۔ دوسری خصوصیت صوفیانہ کیفیت نفسی کی یہ ہوتی ہے کہ ان میں کسی قدر وقوفی یا ادراکی صفت بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی ایک خاص قسم کی بصیرت افروزی دیدۂ دل وا ہو جاتا ہے، اور انسان نوا ہائے راز کے محرم ہو جاتے ہیں۔ ان حالتوں میں غایت درجہ کی تجلیت اور معنویت ہوتی ہے جس کا اثر اس کیفیت کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ انسان اپنی زندگی کے ان بصیرت افروز لمحات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ کوئی عقلی دلیل یا منطقی بحث ان پرحقیقت لمحات زندگی کی معنوی قدر و قیمت کو کم نہیں کر سکتی۔

۳۔ تیسری خصوصیت، صوفیانہ کیفیت نفسی کی یہ ہو کہ وہ عارضی اور خواب آسا ہوتی ہیں۔ وہ بجلی کی طرح کوند کے غائب ہو جاتی ہیں اور انسان "لب تشنۂ تقریر" ہی رہ جاتا ہے۔

۴۔ سب سے آخری خصوصیت ان کی اضطراریت اور انفعالیت ہو۔ اگرچہ خارجی ذرائع سے انسان اپنے نفس کو ان کیفیات کے نزول کے لئے تیار کر سکتا ہو، مثلاً بعض جسمانی ریاضتوں یا

اُسنوں سے، یا موسیقی اور بخور کی مدد سے، یا دھیان اور سادھی کے ذریعے سے لیکن جب ایک مرتبہ یہ حالت طاری ہوجاتی ہے تو اس وقت نفس کی کیفیت سراسر انفعالیت کی ہوتی ہے۔

رشتہ در گردنم، افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

وہ ایک باطنی قوت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہوتا ہے، خیالات پر بھی اسی قوت کی حکمرانی ہوتی ہے، قوت ارادی سلب ہوجاتی ہے۔ اکثر تو شدت تاثر کی وجہ سے بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ چونکہ اکثر دماغی امراض میں بعینہ وہی مظاہر نظر آتے ہیں جو صوفیانہ کیفیات نفسی میں مثلاً التباس کی حالت میں آدمی نئی نئی شکلیں دیکھتا ہے، اور نئی نئی آوازیں سنتا ہے، صرع کی حالت میں بھی خاص خاص احساسات ہوتے ہیں، ہسٹریا کی حالت میں رقت قلب بڑھ جاتی ہے اور فقدان حس (Anaesthesia) کی صورت میں اعضا جسمانی معطل ہوجاتے ہیں، اس لئے معترضین کے لئے اس سے زیادہ آسان اور کوئی بات نہیں ہے کہ وہ صوفیانہ کیفیات نفسی کو بھی خاص خاص اعصابی امراض سے منسوب کردیں، اور وہ سمجھتے ہیں کہ گویا ایسا کرنے سے ان کیفیات نفسی کی ساری معنویت غلط ثابت ہوجائے گی۔ پروفیسر ولیم جیمس نے جو باتفاق رائے امریکہ کے اس صدی کے سب سے زیادہ مستند اور متبحر عالم نفسیات ہیں، اپنی کتاب Varieties of Religious Experience (تجربات مذہبی کی گوناگونی) میں جس سے میں نے بھی بہت کچھ استفادہ کیا ہے، اس طرز خیال کا نام "طبی مادیت" رکھا ہے، اور اعتراضات پر گہری نظر ڈالی ہے، میں انھیں کے الفاظ آپ کے سامنے بیان کئے دیتا ہوں اور چونکہ یہ کسی "صوفی" کے لفظ نہیں، بلکہ ایک مشہور روزگار فلسفی اور ماہر علم النفس کے الفاظ ہیں، اس لئے امید ہے کہ ہمارے معترضین ان پر غور کریں گے، وہ لکھتے ہیں:-

"طبی مادیت سینٹ پال کی مذہبیت کا خاتمہ یہ کہہ کے کردیتی ہے کہ دمشق کی سڑک پر جو مکاشفہ کی حالت ان پر طاری ہوئی تھی وہ "تعفن موخری" کے ناسور کی وجہ سے تھی اور وہ صرع کے مریض تھے، سینٹ ٹریسا (St. Teresa) کے تقدس کا چراغ یہ کہہ کر گل کردیتی ہے کہ وہ ہسٹریا کی مریضہ تھیں، سینٹ فرانسس کو یہ کہہ کر ختم

کردیتی ہو کہ اسفل کی طرف راجع ہونے کا میلان ان میں موروثی تھا۔ جارج فاکس George Fox کو اپنے زمانے کی جھوٹی بناوٹ، ور تلبیسات کی طرف جو نفرت تھی اور روحانی صداقت کے لئے اس میں جو بے چینی پیدا ہو گئی تھی انسے اختلال اخشار تباتی ہو۔ کارلائل کے اقوال میں قنوطیت اور مایوسی کے جو سُرپائے جاتے ہیں ان کی وجہ امعا کا اختلال قرار دیتی ہو اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس قسم کے تمام نفسی ہیجانات جسم کی مرض پذیری کے نتائج ہیں اور بعض غدود کے غیر طبعی فعل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کے بعد طبی مادیت بڑے فخر و مباہات کے ساتھ کہتی ہو کہ دیکھا میں نے ان تمام بڑی بڑی برگزیدہ ہستیوں کی قلعی کھول کے رکھدی نہ!"

اس کے بعد پروفیسر ولیم جیمس فرماتے ہیں:۔

" اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ واردات ذہنی کے اس طرح محض واقعاتی بیان سے ان کی روحانی معنویت پر کسی قسم کا بھی اثر پڑتا ہے؟ ویسے تو ہمارے ذہن کی کوئی حالت ارفع ہو یا اعلیٰ، صحیح الدماغی کی وجہ سے ہو یا عصبی امراض کی وجہ سے، انبساطی ہو یا حزنیہ ایسی نہیں ہے کہ کوئی نہ کوئی جسمی تغیر اس کی وجہ نہوا ہو۔ علمی نظرئے بھی ان جسمی تغیرات کا اسی طرح نتیجہ ہوتے ہیں جس طرح کہ مذہبی تاثرات، اور اگر واقعات کا پوری پوری طرح علم ہو جائے تو شاید ہم کو کٹر دہرئے کے دہریت آمیز خیالات میں بھی جگر کے فعل کی خرابی اسی طرح نظر آئے جس طرح کہ آج (طبی مادیت کو) اس میتھوڈسٹ میں نظر آتی ہو جو اپنی روحانی نجات کے لئے بے چین ہے!"

آخر میں وہ اپنی قطعی رائے اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

" الغرض نفس کے کسی مذہبی تاثر کی جسمی وجہ بیان کر کے یہ دعویٰ کرنا کہ اس طرح اس کی اعلیٰ روحانی قدر و قیمت میں فرق آگیا ہو۔ سراسر ایک بے تکی اور غیر منطقی بات ہو۔ اگر یہی صحیح ہوتا تو پھر تو ہمارے کسی خیال اور کسی تاثر میں حتّٰکہ کسی علمی نظرئے میں بھی

کسی قسم کی حقیقت باقی نہ رہتی، اس لئے کہ ان سب پر یکساں طور پر انسان کے جسم کی حالت کا اثر پڑتا ہے .... پس ہمیں چاہئے کہ اس کل معاملے پر دیانت کے ساتھ غور کریں۔ جب ہم کسی نفسی کیفیت کو دوسری نفسی کیفیتوں پر ترجیح دیتے ہیں تو کیا اس وجہ سے کہ ہمیں اس کے جسمی مقدمات معلوم ہیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ ہماری اس ترجیح کے صرف دو وجوہ ہوتے ہیں اولاً تو یہ کہ ہمیں ان نفسی کیفیات سے فوری مسرت ہوتی ہو یا پھر کہ ہم سمجھتے ہیں کہ انجام کار ان کے نتائج ہماری زندگی کے لئے بار آور ثابت ہوں گے .... الغرض صرف باطنی مسرت کا احساس یا ان نفسی کیفیات کا ہماری رایوں کے مطابق ہونا یا ان سے ہماری ضروریات کا پورا ہونا یہی وہ معیار ہیں جن سے کسی خیال یا اثر کی بھلائی برائی جانچی جاتی ہے۔"

صوفیانہ حالت کی بسیط ترین مثال تو وہ کیفیت ہو جو کسی شعر یا قول کو سن کر ہم پر طاری ہو جاتی ہے۔ وہ شعر ہم پہلے بھی سن چکے ہیں لیکن ایک وقت ایسا آتا ہو جب وہ دل میں ترازو ہو کر نفس کے تاروں کو ایک خاص انداز سے چھیڑ دیتا ہو۔ اس شعر کی معنویت جیسی اس حالت میں ہم پر منکشف ہوتی ہے، پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک نیا ہی جہان معنی ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اسی طرح سے بعض مناظر قدرت، خوشبوئیں، روشنی اور اندھیرے کا سنجوگ، سطح سمندر پر دھوپ چھاؤں کا نظارہ، پھولوں کا کھلنا، یہ سب باتیں بھی نفس انسانی کے کل پرزوں میں کوک بھر سکتی ہو۔

اس کے بعد دوسری منزل یہ ہو سکتی ہو کہ ہم پر بعض اوقات دفعتاً اور بغیر ہمارے علم اور ارادے کے ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہو۔ ہم ایک نئے مکان میں داخل ہوتے ہیں، یا ایک اجنبی شخص سے ملتے ہیں، یا ایک بالکل ہی نئی بات سنتے ہیں لیکن ذہن میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہو کہ جیسے ہم اس مکان یا شخص کو پہلے کہیں ضرور دیکھ چکے ہیں یا اس بات کو پہلے کہیں ضرور سن چکے ہیں۔ آپ میں سے اکثر حضرات اس کیفیت نفسی کا تجربہ کر چکے ہوں گے۔ اس کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا، بس یوں سمجھئے کہ

انچہ می بینم ، بہ بیداری است یارب یا بخواب

کی سی حالت ہوتی ہے جس میں ذرا دیر کے لئے ہی سہی لیکن ہمارا ادراک غیر معمولی طور پر وسیع ہوجاتا ہے۔ چارلس کنگس نے اپنے متعلق لکھا ہے:۔

"جب میں میدانوں میں ٹہلنے کے لئے نکلتا ہوں تو اکثر یہ باطنی تاثر میرے نفس پر غالب ہوتا ہے کہ ہر چیز جو مجھے نظر آ رہی، کچھ نہ کچھ معنی ضرور رکھتی، بشرطیکہ میں اسے سمجھ سکوں اور بعض اوقات یہ احساس کہ میرے گرد و پیش حقائق و معارف ہیں، جنھیں میں سمجھ نہیں سکتا۔ اکثر مجھ پر ایک ناقابل اظہار ہیبت طاری کر دیتا ہے۔ کیا تم نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا ہے کہ تمھاری اصلی روح تمھارے نفس کی آنکھوں سے بجز صرف چند مقدس لمحات کے پوشیدہ رہتی ہے"

اس کے بعد خالص تصوف مذہبی کی منزل آتی ہے، ہر مذہب میں ہمیں صوفیانہ خیالات نظر آتے ہیں، اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ان میں عجیب و غریب یک رنگی نظر آتی ہے۔ سینٹ ٹیریسا کے واردات قلبی پڑھئے جو ان کی کتاب The Interior Castle. میں بیان کئے گئے ہیں اور پھر ان کا موازنہ و مقابلہ مسلمان صوفیہ اور ہندو یوگیوں کے تجربات سے کیجئے تو ایک ایسی یکسانی اور مشابہت نظر آتی ہے کہ انسان اس اعتراف پر مجبور ہوتا ہے کہ ان لمحات زندگی میں واقعی ایک عجیب و غریب روحانی معنویت پائی جاتی ہے۔

اسلام میں تصوف کے مختلف مدارج کے متعلق آپ حضرات کے سامنے مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں صرف حضرت امام غزالیؒ کی خود نوشتہ سوانح عمری سے ان کے ان ذاتی تجربات کو آپ کے سامنے پیش کئے دیتا ہوں جو صوفیانہ کیفیت نفسی پیدا کرنے کی کوشش میں انھیں ہوئے۔ چونکہ مسلمان صوفیہ میں اس قسم کی خود نوشت سوانح عمریاں بہت کم پائی جاتی ہیں، اس لئے امام غزالیؒ کے واردات قلب کی تشریح خود ان کی زبان سے سننا خالی از منفعت نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں:۔

"تصوف کی غایت یہ ہے کہ دل ماسوا اللہ سے ہٹ کر صرف باری تعالیٰ کے تصور میں محو ہو جائے، چونکہ میرے لئے نظریہ عمل سے زیادہ آسان تھا اس لئے میں نے شروع میں تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اور جو کچھ کتابوں کے پڑھنے یا سننے سے حاصل ہو سکتا تھا، وہ سب حاصل کیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ طریقہ صوفیہ کا خاص الخاص جزو ایسا ہے کہ اس کی حقیقت کسی مطالعے سے نہیں، بلکہ صرف وجد وحال اور قلب ماہیت سے آشکارا ہو سکتی ہے۔ مثلاً غور کرو کہ صرف صحت اور شکم سیری کی تعریفوں کو جاننا اور ان کے اسباب و عقل سے واقف ہونا، خود صحیح الجثہ یا شکم سیر ہونے سے کتنا مختلف ہے؟ اور صرف یہ علم رکھنا کہ نشے کے اسباب کیا ہیں یعنی معدے سے ابخرات اٹھتے ہیں اور نشہ پیدا کرتے ہیں اور فی الواقع حالت نشہ میں ہونے میں کتنا زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ انسان جو نشے میں ہوتا ہے وہ نہ تو نشے کی تعریف جانتا ہے اور نہ اسے اس سے سروکار ہے کہ نشے کو علمی بحثوں سے کیا تعلق ہے۔ لیکن طبیب اگرچہ نشے میں نہیں ہوتا مگر اس کی ماہیت اور علامات سے واقف ہوتا ہے۔ بعینہ یہی فرق ترک لذات کی ماہیت سے واقف ہونے اور خود تارک لذات ہونے میں ہے غرضکہ جہاں تک کہ الفاظ سے تصوف کی ماہیت معلوم ہو سکتی تھی، وہ میں نے حاصل کر لی، لیکن جو کچھ باقی تھا وہ ایسا تھا جو کسی مطالعہ یا قال سے حاصل نہ ہو سکتا تھا، بلکہ صرف خود کو وقف حال کرنے اور تقوے کی زندگی بسر کرنے سے اس کی حقیقت کھل سکتی تھی۔"

سطور بالا سے آپ حضرات کو یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ نفسیات میں تصوف کی اصطلاح کسی خاص محدود معنی میں نہیں، بلکہ وسیع ترین معنوں میں استعمال ہوتی ہے، مذہبی اور غیر مذہبی ہر قسم کی صوفیانہ کیفیات نفسی اس کے مفہوم میں داخل ہیں، یعنی ایسی تمام کیفیات نفسی جو اپنی بصیرت افروزی، انفعالیت، ناقابل بیان ہونے کی خصوصیت اور عارضیت کی وجہ سے دوسری کیفیتوں سے ممتاز ہوں۔ یہ حالت کسی خاص طبقے یا ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہندویت ہو یا اسلام

بودھ مت ہو یا عیسائیت ہر مذہب کے صوفیانہ تاثرات میں ہمیں ایک سی کیفیت نظر آتی ہے، جو ایک اس وجہ سے ہے کہ اس کی قدر مشترک یعنی ایمان باللہ وہی ایک ہے۔

(۵) عنصر عقلی

اب ہم ایمانیت کے عناصر خمسہ میں سے پانچویں عنصر، یعنی عنصر عقلی سے بحث کرتے ہیں، اگرچہ مذہبیت سراسر ایک کیفی اور تاثری چیز ہے، تاہم عنصر عقلی کا دخل بھی اس میں کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ اور اگر ایمان آفرینی میں نہیں تو کم از کم ایمانی کیفیت کی توجیہ میں عقل و استدلال سے ضرور کام لیا جاتا ہے عقلی استدلال کی بھی اکثر صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے انسان وجود باری تعالیٰ کا ثبوت پاتا ہے، یا اگر ثبوت نہیں پاتا تو لا ادری کہہ کر چپ ہو جاتا ہے جو خود اثبات واجب الوجود کی ایک سلبی شکل ہی ہے بقول حالی۔

سمجھا ہے پرے تجھ کو ادراک کی سرحد سے   جس قوم نے رکھا ہے، انکار روا تیرا

سب سے پہلی دلیل جو وجود مطلق کی پیش کی جاتی ہے وہ ایک استخراجی قیاس منطقی ہے فلاسفہ میں سے ڈیکارٹ (Descartes) اور لائب نٹز (Leibnitz) نے اس قیاس سے اثبات وجب الوجود کے متعلق استنباط کیا ہے۔ ڈیکارٹ کی دلیل مختصراً یہ ہے۔

تصور الٰہی ایک مکمل ہستی کا تصور ہے۔

وجود ایک کمال ہے اور عدم وجود ایک نقص۔

ایک کامل ہستی میں صفت وجود کا ہونا ضروری ہے۔

پس خدا موجود ہے۔

دوسری عقلی دلیلیں تجربات انسانی سے ماخوذ ہیں، مثلاً علت و معلول کے سلسلے سے وجود باری تعالےٰ کا ثابت ہونا، دنیا میں کوئی معلول بغیر علت کے نہیں ہو سکتا اور ہر علت کے لئے بھی کوئی نہ کوئی سابقہ علت ضرور ہونی چاہئے، اور اس طرح یہ سلسلہ علت اول یعنی خدا پر جا کر ٹھہرتا ہے۔ ایک اور دلیل یہ ہے کہ اشیاء عالم کی ہیئت ترکیبی ایک خالق کے وجود کا پتہ دیتی ہے، مثلاً ذوی الحیات کی ہیئت

ترکیبی ہیں بہت سی باتیں ایسی ملتی ہیں جن کی توجیہ محض طبعی قوانین سے نہیں ہوسکتی، مثلاً ان کی زندگی اور ان کی جبلتیں، ان کے وجود کا منشا، نظام کائنات میں صرف اپنے بقائے ذات کے علاوہ اور کچھ ضرور ہے تمام اشیا میں ایک واحد نظام کارفرما نظر آتا ہے۔ کثرت کے لباس میں وحدت جلوہ گر ہے، غرضکہ ان مختلف صورتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان اشیا کا کوئی نہ کوئی صانع ضرور ہے سب سے آخر میں اثبات واجب الوجود کی اخلاقی دلیل کا ذکر کروں گا جس کی تفصیل پہلے عنصر اخلاق کے ضمن میں کی جا چکی ہے یعنی اخلاقی تصادم سے خیر و شر کا تصور پیدا ہونا اور انسان کا خیر پر قائم رہنے کے لئے خدا کے وجود کو ضروری سمجھنا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ان دلائل کے بیان کرنے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ فلسفیانہ حیثیت سے بھی یہ دلیلیں قابل قبول ہیں یا نہیں، میرے اس مقالے کے موجودہ حصے میں وہ ایک خالص نفسیاتی مسئلہ ہے، یعنی یہ کہ ایمانیت پر استدلال اور عقلیت کا اثر کیا ہوتا ہے؟ مجھے امید ہے کہ سابقہ بحثوں سے میرے سامعین یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ انسان کے عقیدے پر زیادہ تر اثر ہمارے تاثرات و جذبات کا پڑتا ہے اور بہت کم عقل و استدلال کا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عقل کا حصہ بالکل ہوتا ہی نہیں ہے۔ معتقدات کی بنیاد خواہ تاثرات ہوں یا جذبات، لیکن ان کی جرح و قدح نقد و نظر میں زیادہ تر عنصر عقلی ہی کا دخل ہے بے ربط عقائد و خیالات کو کوئی ذہن قبول نہیں کر سکتا ایسے عقائد جو ہمارے مجموعی علم سے میل نہ کھائیں، درجہ قبولیت حاصل نہیں کر سکتے۔ عقلیت کے معیاروں کے خاص خاص صورتوں میں مفید ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے، ہمارا سارا فلسفہ اور ہمارے تمام علوم صحیحہ عقلیت کے معیاروں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، لیکن . . . .

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مکانے دارد

کیا فرض ہے کہ انسانی زندگی کی سی ایک پیچیدہ اور مختلف الحیثیات چیز بھی انھیں معیاروں سے جانچی جائے۔ اگر مجموعی حیثیت سے انسان کی حیات نفسی پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ عقلیت اور منطقیت صرف اس کے ایک جزو کی تشفی کر سکتی ہے اور بس، یعنی صرف قوائے استدلالیہ کی، ان

قوتوں کی جو چرب زبان ہیں، دلیل بازی خوب کرلیتی ہیں، منطق بگھار لیتی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ نفس کی دوسری خاموش لیکن طوفانی کیفیتیں بھی ہوتی ہیں یعنی آپ کی پوری غیر شعوری زندگی، آپ کے رجحانات، معتقدات، الہامات فطری، تاثرات اور وجدانات ان سب کے متعلق عقلیت کسی قسم کا ادعا نہیں کرسکتی۔ اس کے مقدمات صغرائے وکبرائے، جب تک کہ پہلے ان بے زبان قوتوں سے سند قبولیت نہ پالیں تسلیم ہی نہیں کئے جاسکتے۔

حضرات، یاد رکھئے کہ جس طرح عقلیت عقیدے کی بنیاد کو متزلزل نہیں کرسکتی، اسی طرح سے محض عقلی دلیل اور منطق سے عقیدے قائم بھی نہیں ہوتے۔ اثبات واجب الوجود کے متعلق منطقی دلیلوں سے کسی کو اس کا یقین نہیں پیدا ہوسکتا۔ نری منطقی بحثیں ایمانی کیفیت نہیں پیدا کرسکتیں۔

ہندوستان میں جب سے انگریزی تعلیم اور مغربی سائنس کا رواج ہوا، ایک تعلیم یافتہ طبقہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جسے اس وقت تک چین ہی نہیں آتا جب تک کہ وہ صحف سماوی سے نیوٹن کا کلیۂ کشش ثقل اور ڈارون کا نظریۂ ارتقا ثابت نہ کردے، حاسۂ مذہبی اور ایمانیت کو ان کوششوں پر ہنسی آتی ہے، اس کے تاثرات اور وجدانات ہی اس کے لئے کافی شہادتیں ہیں۔ وہ ان مخلص لیکن گم کردۂ راہ عقل و دانش کے پتلوں سے اکبر کی زبان میں کہتی ہے۔

شعر میں کہتا ہوں، ہجے تم کرو

سائنس کو صرف کلیات اور تعمیمات سے مطلب ہے، وہ ابر رحمت کو عمل حرارت و تقطیر کہتی ہے، اسے اس سے کیا بحث کہ غریب کسان اسے کس نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس کا نقطۂ نگاہ سراسر غیر شخصی ہے سائنس کا خدا صرف عمومی قوانین کا خدا ہے، بقول جیمس کے "وہ تھوک فروشی کرتا ہے۔ خوردہ فروشی نہیں کرتا" غرض دنیائے مذہب میں سائنس ہو یا عقلیت، دونوں کے "پاؤں "پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود"، کے مصداق ہیں، حاسۂ مذہبی ایک شخصی راز ہے، اور زیادہ تر ہر شخص کے جذبات اور تاثرات پر منحصر ہے، اور یہ دل کی انجان گہرائیوں میں پرورش پاتے ہیں، اور انسان

کے عمل پر اپنا رنگ چڑھاتے ہیں

نفس انسانی کا مطالعہ ہمیں جس نتیجے پر پہنچاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر نفس کی کچھ باطنی مشکلات ہوتی ہیں اور وہ ان کا حل تلاش کرتا ہے، حاسہ مذہبی، یا ایمانیت ہی ایک ایسا جامع الحیثیات حل ہے جو روح کے اکثر امراض کے لیے نسخۂ شفا کا حکم رکھتا ہے، انسان اپنی ترکیب نفسی کے اعتبار سے بلکہ اپنی باطنی ضروریات کے تقاضے سے اس حل پر پہنچنے پر مجبور ہیں۔ چاہے نام مختلف ہوں ارکان وعبادات میں فرق ہو، نظریے الگ الگ ہوں لیکن ہر مذہب کی قدر مشترک، یہی حاسہ مذہبی ہے یہ جس کسی میں اور جہاں کہیں پایا جائے، کم از کم اتنا ہی قابل قدر ہے، جتنا کہ کوئی اور جذبہ۔ اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں، تو ہم میں دوسروں کے مذہبی عقائد کے متعلق ایک ایسی بصیرت پیدا ہو جائے کہ خواہ ہم ان کے ہم خیال نہ ہوں لیکن ہمارے دل میں ان کے حاسۂ مذہبی کا احترام ضرور پیدا ہو جائے اور ہم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آں هر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

مولانا محمد علیؒ مرحوم کا ایک خط قاضی عبدالغفار صاحب کے نام

برادرم السلام علیکم - خدا تمہیں تندرست رکھے اور خوش اور اسی طرح صداقت دمبر پہ
قائم۔ اگست میں چند دن کے لئے ایک دور سنسری پرلطف گر دقت و مقابلہ طلب آگیا تھا۔
اسی زمانہ میں تم کو بھی شکایت کا موقعہ ملا تھا۔ میں نے اس کے بعد ہی تم کو ایک مفصل و مشرح
خط یہاں کے حالات کا لکھا تھا جس میں ان سنسر صاحب کے عہد نظامی کے حالات بھی
شامل تھے۔ مگر پھر اس خیال سے پھاڑ ڈالا کہ نئے سنسر صاحب کا طرز عمل بالکل مختلف تھا اور
جب حالات ماضیہ بدل گئے تھے تو پھر ان کا تذکرہ بھی عبث تھا۔ اس کے بعد تم کو خط لکھتا
مگر بھائی مجھے اس "شفاخانہ امن" کی "مس فلارنس نائٹینگل" بننا پڑا۔ بیگم صاحب پہلے علیل ہوئیں
پھر گلنار کو انٹرک[1] ہوا۔ پھر جس دن وہ اچھے ہوئے اسی دن بیگم صاحبہ پھر علیل ہوئیں اور سخت
تم۔ خدا خدا کرکے ان کو شفا ہوئی تو معظم کے ہمراہ ان کے دونوں بھائی آئے ہوئے تھے۔
ان میں سے بیچارہ مسعود اپنے ساتھ ساتھ انٹرک لایا۔ اس عمر میں یہ مرض نہایت خطرناک ہوتا ہے
اور سوائے نرسنگ کے کچھ علاج ہی نہیں۔ چنانچہ اپنا سارا تجربہ تیمارداری کا کام میں لانا
پڑا۔ شوکت صاحب بھی حرارہ لائے۔ پیر میں پھڑیا نکلی۔ جوش میں آگئے۔ ہم نے لاکھ کہا کہ ہمارا
مرہم لگاؤ۔ اچھے ہو جاؤ گے مگر نہ مانا۔ جنگجو یانہ جذبات تراوش کئے بغیر نہ رہے اسسٹنٹ سرجن
سے چیرا لگوایا۔ اس میں لیکن کچھ مادہ فاسد داخل ہوگیا۔ (Esithemua ؟) میں مبتلا

---

(۱) میعادی بخار

ہوگئے۔ آج مادہ ٹخنے کے پاس ہے تو کل ران پر اور پرسوں گھٹنے میں یا پنڈلی میں۔ ڈاکٹر نے دس بارہ مسہل دیئے تب جاکر بخار اور (? Easithemia) سے نجات پائی۔ مسعود بھی بفضلہ تعالیٰ اچھا ہو گیا۔ مگر بیچارے معظم کی درگاپوجا تباہ ہوگئی۔ چنانچہ یہ کیا گیا ہے کہ میری بیوی بچے جو سال بھر سے یہاں پڑے سڑ رہے تھے اور پے در پے علالتوں کے باعث تبدیل آب و ہوا کے مستحق تھے۔ رام پور جانے والے تھے۔ انہیں میں نے بانکی پور بھیجدیا ہے ۱۵-۱۶ تک انشاء اللہ وہاں رہکر گھر چلے جائیں گے۔ جب تک ہمدرد جاری تھا ایک ذریعہ آمدنی موجود تھا۔ سنسر صاحب کی عنایت نے اسے بھی بند کرادیا۔ پریس بھی بند کر دیا گیا۔ مکان کا کرایہ اب تک دینا پڑتا ہے۔ اب صرف (.Sub sistence allowance (۱)) ہی ذریعہ معاش رہگیا ہے اس لئے کہ جائداد موروثی کو تو مدتوں سے شوکت اور میں ہاتھ نہیں لگاتے تھے اور اس کی آمدنی محض ان اعزا کے لئے چھوڑ دی تھی جن کی کوئی دوسری آمدنی نہ تھی۔ ہاں ہمدرد کا مرڈ کی بدولت تینتیس ہزار کی جائداد پہلے رہن رکھدی تھی۔ اب نظر بندی کے زمانہ میں شوکت فیکٹری کے سود کی بدولت یہ ہو رہا ہے کہ ساٹھ ہزار کی جائداد فروخت کر رہے ہیں تاکہ سب قرض ادا ہو جائے۔ یہ جائداد جیسا کہ تم جانتے ہو۔ دادا صاحب مرحوم کو ملی تھی۔ غدر میں گورنمنٹ کو صوبجات متحدہ میں انہوں اور ان کے آقائے نامدار نے بچا دیا تھا۔ شکر ہے کہ جو صلہ اس وقت ملا تھا وہ آج پوتوں کی طرف سے اسی گورنمنٹ پر تصدق کیا جا رہا ہے۔ هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔ شرمندگیِ احسان دور ہو جائے گی۔ یہ بار سخت گراں تھا۔ خدا نے خوب سبکدوش کیا۔ گورنمنٹ کو اطلاع دیدی ہے کہ اب کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے۔ الاونس جب صرف اپنے اخراجات کے لئے مقرر ہوئی تھی ناکافی تھی۔ مگر خدا کا دیا بہت کچھ تھا اس لئے علاوہ اصول کی بحث کے کہ نظر بندوں کو الاونس ٹ یا نہ ملے کچھ نہ کہا گیا۔ سال بھر سے یہ اندھیر کہ بیوی بچوں کے

---

(۱) روزینہ جو بہ حالت نظر بندی مولانا کو ملتا تھا۔

لئے بھی اسی میں سے نکالا جا سکتا ہے۔ تمہارا تو ذکر کیا ہے۔ خود گورنمنٹ کے عہدہ دار اس کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ شوکت (جنہیں علاوہ رامپور کے گاؤں کے ٹھیکہ کے جس میں سے چار سو ماہوار ملتا تھا گورنمنٹ خود چھ سو کے قریب ماہانہ دیتی تھی) اور میرے لئے مع متعلقین کے یہ ڈہائی ڈہائی سو کہاں تک کافی ہو سکتے ہیں۔ امید ہے کہ جس رزاق نے رزق میں پہلے فراخی عطا فرمائی تھی وہی آج بھی عطا فرمائے گا۔ اور الاؤنس میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور سفر خرچ گورنمنٹ ادا کرے گی۔ بغیر (۱)(*Separation allowance*) کے سخت مشکل ہوگی۔ مگر ہم آخر پیدا ہی کس لئے کئے گئے ہیں جانتے ہیں کہ ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں ہمارے بھائی ہیں جنہیں ہماری اسیری کی روزی اور رزق قارون کا خزانہ معلوم ہوتا ہے اگر وہ زندہ رہ سکتے ہیں اور خدا کا شکر بجا لاتے ہیں تو ہم یہ کیوں نہیں کر سکتے۔

جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ خود لارڈ چانسلر سابق قانون تحفظ ہند کو گورنمنٹ اور کونسل واضع آئین و قوانین کے اختیارات قانون سازی کے باہر سمجھتے ہیں۔ اور انڈیا آفس کو خود اس کا اعتراف ہی خیال ہوا ہے کہ اس کے متعلق کچھ کارروائی کروں چنانچہ مظہر کو بلایا ہے۔ ڈپٹی کمشنر نے احتیاطاً گورنمنٹ سے بھی استصواب کر لیا ہے۔ اور گورنمنٹ نے انہیں اطلاع دیدی ہے کہ مظہر شوق سے آ سکتے ہیں۔ نہ معلوم بیچارہ کو فرصت بھی مل سکے گی یا نہیں۔ اگر محرم میں آ گئے تو اچھا ہوگا۔ ارکو بال بچے بانکی پور گئے۔ آج شب کو والدہ آ رہی ہیں۔ ارہی کو حیات آ گیا۔ اس لئے دل نہیں گھبرایا اور یہاں تو عقیدہ ہے کہ

انساں بجائے خود بھی ہے اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اب زیادہ نہیں لکھتا۔ اب سلسلہ پھر جاری ہو گیا ہے اس لئے متوقع رہو کہ مزید از خطوط پھر آیا کریں گے۔ کہو (*Times*)(۲) تو شاید اب نہ آتا ہو۔ کیا (۳)(*Near East*)

---

(۱) گھر بار سے علیحدگی کا الاؤنس (۲) اخبار لندن ٹائمز (۳) اخبار نیر ایسٹ۔

بھی بند ہوگیا۔ اخبار اور رسالے جو ضرورت سے زائد ہوں بھیجدیا کرو۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ خوب کام کر رہے۔ واللہ بسا اوقات رشک آتا ہے۔ اگر اپنی تعلّی نہ سمجھو تو کہوں کہ اردو کے محمد علی ہو۔ یہ مخمصے ختم ہوں گے تو نہ معلوم اخبار کی پھر ضرورت بھی رہے یا نہیں لیکن اگر سب کچھ نکالنے کے بعد پھر بھی اخبار نکالنا پڑا تو ہمدرد ہوگا اور تم۔ میں تو پنشن لے لوں گا اور صرف زبان کے چٹخارے لے لیا کروں گا۔ حیا تو سلام کہتا ہے۔ شوکت یہاں فرماتے ہیں کہ میرے سر پر قرارۃ العین کا بھوت سوار ہے۔ خدا را کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے اس کا کلام بھجوا دو۔ صداقت کے چند مدّاح یہاں موجود ہیں۔ سب شوق ملاقات کا اظہار کرتے ہیں۔ میاں حسرت کی غزل کیا خوب درج کی ہے۔ سب مرصع ہے۔ مگر ہمارے (ہمعصر[1]) کے چند اشعار مع مقطع کے لاجواب ہیں۔ شوکت کا ارادہ ہے کہ بھائی ضیاء علی (بھائیو سلام علیکم) کو ایک کارڈ لکھیں بجواب ان کی تھلی چٹھی کے کہ میری رائے ہے کہ بہتر تو یہ ہو کہ آپ سرے سے کلکتہ جائیں ہی نہیں۔ اور اگر "علمی بحث" کا اس قدر شوق ہے تو یہاں چلے آیئے۔ ہم دونوں بھائی کافی مسالہ فراہم کر دیں گے۔ اچھا رخصت تمہارا

محمد علی

---

(۱) مذاق۔

ایران جدید

ہندوستان کی افسوسناک فرقہ وارانہ کشمکش نے وہ تسکین حاصل کرنے کیلئے جس کی میرے قلب کو ضرورت تھی مجھے اس موسم گرما میں ایک ہمسایہ قوم کے آغوش میں پہونچا دیا۔ مجھ وہاں پہونچکر مایوس نہیں ہونا پڑا۔ ایرانی اپنے ملکی مراحل کو طے کرنے میں ایسی ہوشمندی اور وسعت نظر سے کام لے رہی ہیں جو ہم سب کے لئے ایک اچھی خاصی مثال بن سکتی ہے، مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات جن کی وجہ سے ہندوستان میں آپس کے مناقشات روز بروز بڑھتے جاتے ہیں ان کا ایران میں نام بھی نہیں وہاں تمام فرقے بہ حیثیت ایرانی باشندوں کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات کو استوار کرتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ایرانی قانون ازدواج ہے جو کہ گذشتہ ستمبر میں پاس کیا گیا ہے، یہ قانون تمام ایرانیوں کے لئے ہے جس میں مسلمان، پارسی، عیسائی اور یہودی سب شامل ہیں اور تمام ملک نے اس کو دل سے قبول کرلیا ہے۔ نابالغوں کے لئے جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو جسمانی لحاظ سے شادی کے قابل نہیں شادی کرنا قانوناً جرم قرار دیدیا گیا ہے، علاوہ ان نابالغوں کے جن کی شادی ہو، تمام وہ اشخاص جو اس قسم کی شادیوں کے ذمہ دار ٹھہریں، سزائے قید کے مستوجب قرار پاتے ہیں، جس کی میعاد ۳ سال تک رکھی گئی ہے۔ نکاح اور طلاق کی رجسٹری کرانا ضروری ہے اور اس کی فروگذاشت کے جرم میں شوہر کو چھ ماہ کی سزائے قید ہوسکتی ہے۔ شادی کے وقت شوہر اور زوجہ کو حق حاصل ہوتا ہے کہ نکاح نامہ میں ایسے شرائط تحریر کرائیں جن کے مطابق فریقین کے آئندہ تعلقات کا فیصلہ ہوا کرے گا۔ جانبین کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملت اور شریعت کے قدیم روایات پر قائم رہیں۔ یا کوئی جدید مذہب اختیار کرلیں۔ بجز اس صورت کے کہ نکاح نامہ کے شرائط خود ازدواجی تعلقات کے منافی

ہوں ان شرائط کا نفاذ سرکاری عدالتوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے جن میں علماء کے طبقہ کو کوئی دخل نہیں ہو، نکاح کے رسم و رواج کا تعلق جہاں تک قانون سے ہو اس کو طبقہ علماء کے ہاتھ سے قریب قریب بالکل نکال لیا ہے۔ اور یہ تعلیمیافتہ ایرانیوں کی عین خواہش ہو کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ لارڈ کرزن جیسے سیاحوں کی رائے ہو کہ ایرانی فریبی اور ناقابل اعتماد ہوتے ہیں لیکن یہ ان کے ساتھ صریحاً ناانصافی ہے۔ ایرانی لوگوں کی تعریف کرنے میں الفاظ کا طومار باندھ دیتے ہیں لیکن یہ محض ان کی خوش خلقی کا ایک راز ہو۔ ورنہ ان الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ آپ کو مشکل سے کوئی قوم ملے گی جس کے ہر طبقہ کے لوگوں میں یکساں طور پر تہذیب اور تمدن، شائستگی اخلاق اور مروت اس قدر پائی جاتی ہو جتنی کہ ایرانیوں میں۔ بازاروں میں یا سڑکوں پر کہیں گالی گلوچ بیہودہ الفاظ سننے میں نہیں آتے۔ اگر ایران کی معاشرتی زندگی کا ہم اپنے معاشرتی زندگی سے مقابلہ کریں تو دو باتوں میں نمایاں فرق پائینگے۔ اولاً یہ کہ وہاں نہ ذات پات کا فرق ہے، نہ مختلف طبقوں میں نیچ اونچ۔ نہ بڑے بڑے امراء کا کوئی طبقہ ہو جو دولت سے سرشار ہو، نہ فاقہ مستوں کا کوئی طبقہ ہو جو بالکل تباہ حال ہو۔ اس لحاظ سے ایرانیوں میں جتنی یک رنگی ہو اتنی مشرق کے کسی دوسری قوم بلکہ شاید دنیا کی کسی قوم میں نہ ہو گی۔ مسلمانوں کے ورود سے قبل ایران میں ذات پات کی خفیف سی جھلک پائی جاتی تھی۔ لیکن سامیوں کی فتوحات نے اس کی بھی پوری طرح بیخ کنی کر دی، اس کے بعد پھر کبھی ذات پات کا رواج نہ ہو سکا۔ اب وہاں کے تعلیمیافتہ طبقہ اور عوام الناس کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں۔ تمام ایرانی اپنے ملک کے ہر باشندہ کو اپنا ہم مرتبہ سمجھتے ہیں اور مساوات کا برتاؤ رکھتے ہیں۔ اسی قسم کی سوسائٹی میں تعلیم یافتہ طبقہ کے خیالات نہایت سرعت کے ساتھ عوام الناس تک پہنچ کر ان میں خود بخود اثر کر جاتے ہیں اس کے علاوہ بخلاف ہماری قوم کے ایرانی جدید روشنی اور خیالات کو قبول کرنے اور اختیار کرنے پر بالطبع بہت زیادہ مائل ہیں کسی نئے خیال کے وہ اتنے ہی گرویدہ ہوتے ہیں جتنے ہم اس سے متنفر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ ایران مسلسل تغیرات سے پر ہو جس کی کوئی مثال ہمارے ملک

کی تاریخ میں مشکل ہے۔ قرون وسطی کا ابتدائی زمانہ تصوف کی نشو ونما میں گذرا اور اس کے بعد صفوی خاندان کی شہنشاہیت کا دور دورہ رہا بالآخر دونوں کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اور اب ان کا کوئی نام اگر کہیں باقی ہے تو صرف تاریخ و ادب کی کتابوں میں۔ ورنہ آج کل تو قوم پرستی یا ملت پرستی کا زور ہے ۱۹۲۰ء۔ ۲۰-۲۱ فروری کی درمیانی شب میں آدھی رات گذر چکی تھی کہ رضا خاں پہلوی نے (جو کہ اب اعلیحضرت پہلوی اول کے نام سے مشہور ہیں) طہران پر تسلط حاصل کرلیا۔ ایران کے اکثر مورخین تاریخ جدید کا آغاز اسی دن سے کرتے ہیں۔ اس صورت حال کا جس کو ایرانی انقلاب کے نام سے یاد کرتے ہیں ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ ایک مستقل دولت ملیہ کی تاسیس و تشکیل کی گئی۔ اور دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی طرز زندگی اور خیالات میں ایک نیا نقطہ نظر نمایاں طور پر پیدا ہوگیا جسے ہم اصطلاحاً مغربیت کہہ سکتے ہیں۔ سلطنت پہلوی کی گذشتہ گیارہ سال کی حکومت میں تقریباً وہ تمام باتیں جن کا تعلق قرون وسطے سے تھا یا تو معدوم ہوگئیں یا نہایت سُرعت کے ساتھ معدوم ہو رہے ہیں۔ علما یا مجتہدین جنہیں ایرانی اخوند کہتے ہیں۔ ان کا سیاسی بساط سے غائب ہوجانا تمام اصلاحات کے لئے سب سے پہلی اور ناگزیر شرط تھی۔ ۱۹۰۶ء کے دستور اساسی اور اس کے بعد ۱۹۰۷ء کے ضمنی دستور (Consti- tution.) دونوں نے مجتہدین کی حیثیت کو مستحکم کردیا تھا تمام ملک کے اخوندوں کو حق دیدیا گیا تھا کہ وہ اپنی جماعت سے ۲۰ اشخاص منتخب کردیا کریں مجلس ان ۲۰ منتخب شدہ اشخاص میں سے ۵ ممبران کی ایک مذہبی کمیٹی مقرر کردیتی تھی جس کو اختیار حاصل تھا کہ وہ مجلس کے منظور کردہ قوانین کو مذہبی مصالح کی بنا پر مسترد کردے۔ اس کے باوجود بھی اکثر اخوندوں نے خود دستور کو غیر مذہبی اور حرام قرار دیدیا بعد میں ان کے سرگروہ لوگوں سے دستور پر جبریہ دستخط کرائے گئے، مذہبی کمیٹی کا تجربہ ناکامیاب رہا اور اس سے حکومت کے معطل ہوجانے کا اندیشہ ہوا اس لئے اس کو توڑ دینا پڑا ۱۹۲۴ء میں جمہوریت کی تحریک ایران میں نہایت شدومد کے ساتھ اٹھائی گئی لیکن اخوند نے فتویٰ دیا کہ یہ بھی حرام ہے۔ آخر مجلس نے اس مشکل اور کشمکش کو یوں حل کیا کہ قدیم خاندان شاہی کو ختم کرکے رضا شاہ پہلوی کے سر پر تاج حکومت رکھدیا۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جب تک ان مسائل میں اخوندوں کا دخل تھا

۔۔۔ت تک ایران نئی روشنی کے مطابق نہیں ہوسکتا تھا یہ بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہو کہ اس زمانہ میں سرکاری عدالتیں قریب قریب بالکل اخوندوں کے ہاتھوں میں تھیں لیکن ان عدالتوں کا طریق کار اس قسم کا تھا کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی کوئی قدرومنزلت پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ رشوت ستانی اور بدکرداریوں کی کوئی حد نہ تھی ان عدالتوں کے ضابطے اور شہادت کے اصول نہایت دقیانوسی تھے۔ گواہ کے قابل اعتبار ہونیکا انحصار اس قسم کی باتوں پر تھا کہ وہ کتنے تحائف دیسکتا ہو یا اس کی ڈاڑھی کتنی لمبی ہے۔ علاوہ بریں رویت ہلال معاہدہ اور قتل وغیرہ مختلف النوع معاملات کے لئے ایک ہی قسم کی عینی شہادت درکار ہوتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں حالات زمانہ نے ایرانیوں کو مجبور کردیا کہ وہ ایک فیصلہ کن صورت اختیار کریں چنانچہ انہوں نے ایک نہایت عاقلانہ اور دلیرانہ فیصلہ کرلیا۔ رضا شاہ اور ان کی گورنمنٹ کی خواہش ہوئی کہ غیر ملکی سفارتوں کے عدالتی اختیارات کا خاتمہ کردیا جائے۔ لیکن دول خارجیہ نے معقول وجوہ کی بنا پر اس سے انکار کیا اور کہا کہ ہم اس وقت تک اس تجویز پر راضی نہیں ہوسکتے جب تک ایرانی عدالتوں کو مذہبی طبقہ کے ہاتھوں سے بالکل نکال نہ لیا جائے۔ ظاہر ہو کہ ان کے لئے اس امر پر راضی ہوجانا ناممکن تھا کہ غیر ایرانیوں کے مقدمات بھی اسی قانون کے ماتحت فیصل ہوا کریں جو اخوندوں یا مذہبی پیشواؤں کا بنایا ہوا تھا۔ عام اس سے کہ وہ قانون اچھا ہو یا بُرا۔ قانون اور عدالتوں کا از سر نو ترتیب دینے کا نازک اور مشکل کام شاہ نے ایک قابل ترین ایرانی یعنی وزیر عدلیہ آغا اختر علی خان کے سپرد کیا۔ مذہبی عدالتیں اب بھی باقی ہیں کیونکہ از روئے آئین ان کو کسی وقت توڑا نہیں جاسکتا لیکن ان کے تمام قانونی اختیارات سلب ہوگئے، اب ایران میں ایک درجن سے زیادہ مرتب شدہ قوانین اور ضابطہ جات نافذ ہیں بالجملہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ نفس امری قوانین کے اصول اسلامی شریعت سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ قانون شہادت اور ضابطہ عدالت کی ترتیب میں فرانسیسی قوانین کی تقلید کی گئی ہے۔ اخوندوں کی جگہ قانون جدید کے ماہرین حاکمان عدالت کے عہدوں پر مامور کئے گئے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ تمام تبدیلیاں عوام الناس کو اپنی مرضی کے خلاف زبردستی ماننا پڑیں ایسا ہرگز نہیں ہو بلکہ واقعہ یہ ہے

کہ ایران کے کسی ایک باشندہ کو بھی اپنے مذہبی پیشواؤں کے طبقہ پر اعتماد باقی نہیں۔ اگر ان مذہبی پیشواؤں کا بس چلتا تو یہ شرارت آمیز فتوے جاری کر دیتے لیکن نہ ان میں اتنی ہمت ہے اور نہ انہیں اس کا موقع ہے۔ ان میں سے بعض نظر بند کر دیئے گئے ہیں اور باقی خاموش ہیں بجز المدرس کے علماء کے طبقہ نے اپنے اس سخت ترین آزمائش کے وقت کوئی جری آدمی پیدا نہیں کیا اور سب ملکوں کی طرح ایران میں بھی ایسے لوگوں کی کوئی عزت نہیں کیجاتی جو اپنے عقائد کی خاطر مصائب برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

مذہبی علماء کے طبقہ کے فنا ہو جانے کے بعد ایران کو اس بات کا موقع ملا کہ ملکی معاملات میں ترقی کی جدید راہ پر چل سکے۔ ملک کے مالی انتظامات کو ڈاکٹر ملس پاف اور ان کے امریکن ساتھیوں نے سنہ ۱۹۲۳ء سے سنہ ۱۹۲۷ء تک از سر نو ترتیب دیا اور اب یہ کام ایک نہایت قابل وزیر مالیات آغا قاسم تقی زادہ کے ہاتھوں میں ہے جو کئی سال کی جلا وطنی کے بعد اپنے ملک کی خدمت کے لیئے طلب کئے گئے ہیں۔ اسی طرح نظام حکومت کا قریب قریب ہر شعبہ از سر نو درست کیا گیا ہے۔ رضا شاہ نے پہلے اپنی وزارت جنگ کے زمانہ میں اور اس کے بعد عہد بادشاہت میں سالہا سال کی جد و جہد سے خود سر قبیلوں کی قوت کو بالکل توڑ دیا اور ملک کے ایک گوشہ سے لیکر دوسرے گوشہ تک امن اور سکون پیدا کر دیا۔ تمام ملک میں جا بجا پولیس کی چوکیاں قائم ہیں اور ایران کی پولیس نہ صرف اپنے کام میں مستعد ہے بلکہ شائستہ اور خوش خلق بھی ہے اور اپنے کو اہل ملک کا ملازم سمجھتی ہے نہ کہ مالک و مخدوم۔ حکومت ایران بھی اور قومی حکومتوں کی طرح باشندگان ملک کی نجی زندگی میں بہت زیادہ دخیل ہے۔ اس لیئے کہ نظام حکومت کی اصلاح بغیر قوم کی اصلاح بیکار ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر ایرانی کے لئے اپنے نام کے ساتھ ایک خاندانی نام کا اضافہ کرنا ضروری ہے۔ اور اسے ہر وقت اپنے پاس پروانۂ شہریت رکھنا پڑتا ہے جس میں پولیس اس کی زندگی کے خاص خاص واقعات یعنی پیدائش، نکاح، طلاق، موت وغیرہ کا باقاعدہ اندراج رکھتی ہے۔ لوگوں کی پوشاک کے متعلق بھی خاص خاص قاعدے ہیں جن کی

پابندی ضروری ہے۔ ۱۹۲۹ء کے قانون کے بموجب ہر ایرانی مرد خواہ اس کا مذہب کچھ بھی ہو ایران کی قومی پوشاک پہننے پر مجبور ہے جس سے مراد پہلوی ٹوپی اور یورپین کوٹ ہے۔ کالر اور ٹائی لگانا لازمی نہیں جو شخص اس قانون کے خلاف ورزی کرتا ہے اس کو ایک ہفتہ کی سزائے قید ہو سکتی ہے یہ کہنا بے سود ہے کہ اس قانون کی ہر شخص پابندی کرتا ہے۔ دیہاتوں میں یہ پوشاک یورپین پوشاک کی ایک نہایت بدنما نقل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن طہران اور ارد گرد کے شہروں میں مردوں کے لباس کا معیار اسی قدر بلند ہے جتنا کہ یورپ کے دارالسلطنتوں میں۔

ایران کے مصلحین اس بات کا بڑا خیال رکھتے ہیں کہ وہ ترقی کی راہ میں رائے عامہ سے آگے نہ بڑھ جائیں اسی وجہ سے اگرچہ ایران میں گذشتہ ۱۰ سال کے اندر نہایت سرعت کے ساتھ اصلاحات رونما ہوئیں لیکن ان اصلاحات کا ردعمل کسی جگہ ظہور میں نہیں آیا نہ اس کا کوئی خطرہ پیدا ہوا حکومت کی طرف سے اصلاحی پالیسی کا یہ رخ آزادی نسوان کے معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہے پردے کا جو مفہوم ہم سمجھتے ہیں جس کے ذریعہ سے عورت کو بغیر ساعت مقدمہ تمام عمر کی سزائے قید دیدیجاتی ہے وہ مفہوم ایران میں کبھی نہیں سمجھا گیا۔ وہاں عورتوں کو شہر میں نکلنے، خرید و فروخت کے لئے باہر اور ایک دوسرے کے مکان پر جانے آنے کی ہمیشہ اجازت رہی۔ قاچار کے عہد میں زمانہ صفوی کی قدیم خوبصورت نسوانی پوشاک کے بجائے مغربی رقص خانون کی پوشاک رائج ہو گئی، جو حد درجہ حیا سوز اور ناشائستہ تھی۔ گذشتہ چند سال کے اندر اصلاحات کے سلسلہ میں معمولی مغربی پوشاک اختیار کر لی گئی قبیلوں اور گاؤں کی عورتیں اب بھی قدیم پوشاک میں نظر آتی ہیں یہ ہندوستانی لہنگے کے مانند ایک لانبا کرتہ ہوتا ہے۔ قصبات اور بڑے بڑے شہروں میں عورتیں فراک اور موزے پہنتی ہیں اور باہر نکلتے وقت ایک سیاہ برقعہ جس کو چادر کہتے ہیں ڈال لیتی ہیں۔ چہرہ اکثر کھلا رہتا ہے باریک سی نقاب پڑی رہتی ہے۔ اسی سلسلہ کے متعلق آیات قرآنی کا یہ مفہوم سمجھا جاتا ہے کہ ان میں چہرہ چھپانے کا حکم نہیں ہے، بلکہ عورت کی زینت یعنی جسم اور کپڑے چھپانیکا ہے۔ آزادی نسواں کی رفتار بہت تیز ہے۔ طہران میں عورتوں کی ایک بہت قلیل روشن خیال جماعت نے چادر بھی ترک کر دی ہے۔ آئندہ پانچ سال کے اندر یا شاید اس سے بھی پہلے قدیم طرز معاشرت کا بالکل

نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا۔

اب ہمیں ایران کی موجودہ قومی حکومت پر نظر ڈالنا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں مظفر الدین نے ایران کے دستور اساسی کے بنیادی قوانین پر دستخط کئے اور دوسرے سال ان کے بیٹے محمد علی کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ دستور اساسی کے اس ضمیمہ پر دستخط کریں جس میں علاوہ دیگر امور کے اس کا بھی اعلان تھا کہ فرمانروائی جمہور کا حق ہے محمد علی شاہ نے دستور اساسی کی خلاف ورزی کی متواتر کوشش کی جس کا انجام ان کے اخراج کی شکل میں نمودار ہوا اور ان کے بیٹے احمد شاہ کے زمانہ صغر سنی میں تمام اختیارات تمام و کمال دستوری قائدین کے ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ یہ زمانہ ایران کے لئے بہت خوشگوار تھا روس اور انگلستان کے غالب اثرات نے آزادی ایران کو حرف غلط بنادیا۔ ملک کے نظم ونسق میں ابتری پیدا ہوگئی اور عمال حکومت کی حالت بگڑ گئی، باقاعدہ فوج کی تعداد کبھی مشکل سے ۴ ہزار تک پہونچتی ہوگی۔ مالیہ ایران کی نصف رقم ہضم کرلی جاتی تھی صوبجات میں مرکزی حکومت کے احکام ٹھکرادیئے جاتے اور ان سے اغماض برتا جاتا تھا۔ محصولات کا وصول کرنا دول خارجہ کے اثرات کی وجہ سے مشکل ہوگیا تھا۔ اور موروثی گورنران اور سرداران قبائل سرکاری مطالبات کا ایک حصہ بھی مشکل سے ادا کرتے تھے اور رہنمایان قوم بجائے اس کے کہ نظم ونسق میں اصلاح کی کوشش کرتے اپنی جیبیں بھرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ مصائب ایران کا کسی کو بھی غم نہ تھا، کوئی مدبر اتنا دیانت دار نہ تھا کہ دوسرے کی قلعی کھول سکے۔ مدبرین کا یہ گروہ جس میں صرف یہی ایک خوبی تھی کہ وہ تمام بداعمالیوں کو سراہتا رہتا تھا برابر برسر اقتدار رہا یہاں تک کہ موسم سرما میں ایک رات ان میں کا ہر ایک اچانک گرفتار کرلیا گیا۔ رضا شاہ نے جو انقلاب برپا کیا اس کی تمامتر اہمیت اس میں مضمر ہے کہ اس نے پرانے مدبرین کے جتھے کو توڑ دیا اور اس کی جگہ قومی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ ملک کی دستوری حکومت کے بادشاہ احمد شاہ ۵ سال اور رہے لیکن تمام اختیارات جدید پارٹی نے اپنے ہی ہاتھوں میں رکھے۔ رضا شاہ نے پہلا کام یہ کیا کہ فوج اور پولیس کی از سر نو تنظیم کی اور ان کے ذریعہ سے باغی سرداروں کو دبانا

شروع کیا اور ملک میں پھر امن و امان قائم کیا یہ کام انہوں نے غیر معمولی قابلیت سے انجام دیا اور دولت ایران یعنی مرکزی حکومت کا عاملانہ اقتدار سب پر قائم کیا، گذشتہ ۱۱سال کے اندر دولت ایران کی تشکیل جدید طرز پر کی گئی جس میں مذہبی طبقہ کا کوئی دخل نہ رہا۔

ایران کے دستور اساسی کی تعریف میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہو سوا ان مذہبی تحفظات کے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، یہ دستور بالکل بلجیم کے دستور اساسی کی نقل ہو، اس کی بہت سی دفعات ناقابل عمل ثابت ہو چکی ہیں۔ ۱۹۰۶ء و ۱۹۰۷ء میں جس کمیٹی نے یہ دستور مرتب کیا تھا اس کو کوئی سابقہ تجربہ اس کا نہ تھا۔ اس لئے قدرتاً اس نے مغربی ممالک سے وہ دستور منتخب کرلیا جو اس کے نزدیک جدید ترین اور بہترین تھا۔ ۱۹۰۶-۱۹۲۱ء کے آئینی دور میں اس دستور کی بہت سی دفعات بلا بوجہ کرپس پشت ڈالدی گئیں اور جنگ عظیم کے زمانہ میں اس دستور کا عملاً خاتمہ ہوگیا۔ سابق حکومت کے مقابلہ میں پہلوی حکومت کو بعض اوقات (دکٹیٹر شپ) کہا جاتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اولاً تو رضا شاہ اور ان کے عمال نے اپنے تمام اختیارات اسی طریقہ پر حاصل کئے۔ کیونکہ مجلس نے ان کو تخت شاہی پر بٹھایا اور دستور اساسی کی ان ترمیمات کا جن کی روسے بادشاہت نئے خاندان میں منتقل ہوئی یہ مفہوم بھی تھا کہ رضا شاہ اپنی اصلاحات کا کام شروع کریں گے دوسرے یہ کہ سوا دستور اساسی کی ان دفعات کے جن کو آئینی حکومت نے ناقابل عمل قرار دیکر ردکر دیا تھا، مثلاً سینیٹ ضلعے اور صوبے کی کونسلوں کا قائم کرنا، رضا شاہ نے اپنے تمام زمانہ حکومت میں بنیادی قوانین کی حرفاً و معناً نہایت دیانت داری کے ساتھ پابندی کی ہے جس بات سے دولت ایران پر ڈکٹیٹر شپ کا الزام لگایا جاتا ہے وہ یہ ناقابل انکار حقیقت ہو کہ مجلس کے لئے انتخابات کا طریقہ ایک بالکل مہمل اور بے معنی ہے۔ دستور اساسی میں مجالس واضع قوانین کے دو ایوانوں کی شرط تھی۔ ایک سینیٹ۔ ۶۰ ممبروں کی جن میں سے نصف تعداد بادشاہ کی نامزدگی کے لئے معین تھی اور نصف قوم کے انتخاب کے لئے۔ اور دوسری منتخب شدہ مجلس شورائے ملی جس کے ممبروں کی تعداد دو سو تھی سینیٹ کبھی وجود میں نہیں آئی۔ اور فی الحقیقت ایک ایسے ملک

یں جہاں جماعت امراء اور اس کا احترام دونوں مفقود ہوں دوسرے ایوان کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ مجلس کے ممبروں کا انتخاب دو سال کے لئے ایک یا متعدد حلقہ ہائے انتخاب سے عمل میں آتا ہے موجودہ مجلس جو آٹھویں مجلس ہے، ۱۱۱ ممبروں پر مشتمل ہے۔ دستور اساسی نے مجلس کو وہ اختیار دے رکھے تھے جو دوسرے ملکوں میں مجالس واضع قوانین کو عموماً نہیں دیئے جاتے بلکہ وزیروں اور انتظامی افسروں کے سپرد ہوتے ہیں۔ کسی دوسری حکومت سے کوئی صلحنامہ بغیر مجلس کی منظوری کے جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تمام منشورات جو دربارہ ملازمت سرکاری صنعت وحرفت و معاشی رعایات بحق اشخاص غیر ملکی یا باشندگان جاری ہوں تاوقتیکہ ان کو مجلس منظور نہ کرے؛ ناجائز سمجھے جاتے تھے۔ حکومت کسی غیر ملکی شخص کا تقرر بغیر منظوری مجلس عمل میں نہیں لا سکتی یہ کہنا ہی بیکار ہے کہ مجلس کو مالیہ پر پورا اختیار حاصل ہے اور وزراء مجلس کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ارکان مجلس کو اس وقت بشرح ۳۰۰ تومان (قریب ۶۰۰ روپیہ کے) مشاہرہ ملتا ہے لیکن یہ امر قابل لحاظ ہے۔ کہ ایران میں سرکاری ملازمت کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ صرف ۳۱۲ تومان ہے البتہ اسمبلی کے صدر کی تنخواہ ۶۰۰ تومان ہے اور وزراء کی ۷۰۰ تومان (۱۴۰۰ روپیہ) مجلس کا عام اجلاس قریب قریب دوبارہ ہر ہفتہ میں ہوتا ہے۔ اجلاس بہت مختصر ہوتا ہے جو کبھی شاذ و نادر ۳ گھنٹہ سے متجاوز ہوتا ہوگا۔ تقریریں بھی بہت مختصر ہوتی ہیں لیکن اگر کوئی ممبر اعداد و شمار اور واقعات سے مسلح ہو کر طویل تقریر کرے تو یہ آداب کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ ایران کی مجلس کے محاسن و معایب کے بارے میں جو بھی خیالات ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ مجلس اپنے زرق برق لباس و حسن اخلاق کے لحاظ سے دنیا میں بہترین مجلس ہے۔ ایوان مجلس کے باہر اکثر ارکان مجلس آپ کو تبسم آمیز احساس سرداری کے ساتھ عالیشان باغ بہارستان کے قریب چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آئیں گے مجھے صرف ایک ہی بار ممبروں کی جماعت سنجیدہ انداز میں گفتگو کرتی ہوئی دکھلائی دی اور میں پیشیں کے بعد ٹہلتا ہوا ان کے پاس پہونچا۔ موضوع بحث مولانا جامی رحمہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ تھا جو حال ہی میں برآمد ہوا تھا۔ ایوان مجلس کے اندر مباحثے کوئی جوش نہیں پیدا کرتے،

... س واضع قوانین میں یا خود ملک میں، کوئی مخالف پارٹی نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اچھوپا خوگی نوبت نہیں آتی مطبوعہ مذاکرات (کارروائی) کا ایک ثلث حصہ صرف آداب و القاب پر مشتمل ہوتا ہے مجلس کا عام اجلاس نمائشی ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بس ان فیصلوں کو جو پیش اور کئے جا چکے ہیں صرف درج کارروائی کر دیتا ہے مجلس ہر چھٹے مہینہ اپنے ممبروں سے ہر وزارت کے لئے اٹھارہ ممبروں کی ایک کمیٹی یا کمیشن مقرر کرتی ہے۔ اور ممبران کمیٹی یا بالفاظ دیگر کمشنران تمام سرکاری محکمہ جات کے تیار کردہ قوانین وضوابط پر بحث ومباحثہ کرتے ہیں۔ ان کمیٹیوں کی سفارشات کو مجلس کا اجلاس عام منظور کر لیتا ہے۔ ممبروں کو مزید تقریر کرنے کے مواقع دینے کے لئے پارٹی کے جلسے منعقد کرنے کا حال ہی میں انتظام کیا گیا ہے۔ پارٹی کا جلسہ بند کمروں میں ہوتا ہے لیکن اس کے گرد وپیش سے نمائشی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ حکومت قریب قریب ہر موقعہ پر اپنی رائے منوا لیتی ہے ترکوں کی قوم پرور جماعت کے مانند ایرانیوں کی کوئی جماعت نہیں ہے ہم لوگوں کو ایرانی انتخابات عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ کل بالغ اشخاص کو ووٹ دہی کا حق حاصل ہے۔ البتہ سنگین جرائم کے سزا یافتہ لوگ اور دیوالئے جو ان افعال کیوجہ سے اس نوبت کو پہونچے ہوں۔ اور سیاسی مجرم حق ووٹ سے محروم ہیں لیکن قانون کی یہ فیاضی بیکار ہو جاتی ہے اس لئے کہ پہلے سے کوئی فہرست انتخاب کنندگان کی تیار نہیں کی جاتی۔

ہر حلقہ انتخاب میں انتخاب کا انتظام ایک مجلس کے متعلق ہوتا ہے جس کو مجلس نظارت کہتے اور یہ حکومت کیطرف سے مقرر کیجاتی ہے۔ مجلس نظارت مختلف حلقوں میں ماتحت کمیٹیاں ووٹ جمع کرنے کے لئے مقرر کر دیتی ہے۔ امیدواران انتخاب کی باقاعدہ نامزدگی کا کوئی طریقہ وہاں رائج نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر سرکاری حکام اور مجلس نظارت رائے دہندوں کو ہدایت نہ کریں۔ تو ان کو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ کتنے امیدوار مقابلہ کے لئے کھڑے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ رائے دہندہ وقت مقررہ پر حاضر ہو جاتا ہے۔ اپنے ساتھ ایک سفید کاغذ کی پرچی لاتا ہے جس پر اس امیدوار کا نام پہلے سے لکھ دیا جاتا ہے جسے وہ منتخب کرانا چاہتا ہے۔ ہر شخص کے حق رائے دہندگی

کا فیصلہ مجلس نظارت اسی وقت اور اسی جگہ کردیتی ہے اور اس کے بعد رائے دہندگان اپنی پرچی بکس میں ڈالدیتے ہیں۔ بالآخر رائے شماری ہوتی ہے۔ اور کامیاب امیدوار کو ایک سٹرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے جس میں یہ بھی واضح کردیا جاتا ہے کہ کل کتنے ووٹ آئے اور اس میں سے کامیاب امیدوار کو کتنے ووٹ ملے اس قسم کے طریق انتخاب پر تنقید کرنا عبث ہے۔ ظاہر ہے کہ انتخاب کنندگان کی فہرست نہ ہونے کی وجہ سے اس کا موقع نہیں رہتا ہے کہ اگر کسی شخص کو اس پر کوئی اعتراض یا قانونی چارہ جوئی کرنی ہو تو کر سکیں یعنی یہ شہریوں کو ان کے ایک ایسے حق سے محروم کردیا گیا ہے جو قانوناً اُن کو حاصل ہو۔ پھر چونکہ امیدوار باضابطہ نامزد نہیں کئے جاتے۔ اس لئے عملاً گویا کہ رائے عامہ کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ مجلس نظارت اپنے فرائض بیحد جوش اور قابل تعریف وطن پرستی کے جذبہ سے انجام دیتی ہو کہ بکس سے جو پرچیاں نکلتی ہیں ان کی تعداد عموماً ان لوگوں کی تعداد سے کئی گنی زیادہ ہوتی ہو جو رائے دینے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ قانون کے مطابق کوئی امیدوار بغیر کلی اکثریت کے منتخب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اگر مجلس نظارت کافی توجہ نہ کرے تو کوئی امیدوار کبھی منتخب ہی نہیں ہو سکتا۔ امیدوار کی نامزدگی کا کوئی طریقہ رائج نہ ہونیکی وجہ سے ایک وقت سو سو امیدواروں کو ایک ایک حلقہ سے ووٹ دیئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے مجلس کو وہی کرنا پڑتا ہے جس کی اس صورت میں ضرورت پڑتی ہو۔ یعنی فرضی اشخاص کی طرف سے پرچیاں بکس میں ڈالدی جاتی ہیں اور مجلس ان کو نظرانداز کردیتی ہو یہانتک کہ رائے شماری کا وقت آجاتا ہے۔ پھر پرچیوں کے شمار میں البتہ پوری دیانتداری سے کام لیا جاتا ہو۔ اکثر تعلیمیافتہ لوگ اس قسم کے انتخابات کو لغو تسلیم کرتے ہیں مگر بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کسی تبدیلی کے خواہاں ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ انتخابات کے لئے ایک صحیح نظام قائم کرنے کی راہ میں بہت بڑی دشواریاں بھی ہیں۔ ایران کی آبادی بہت تھوڑی اور بکھری ہوئی ہو۔ تقریباً ۱۱ اشخاص فی مربع میل اوسط ہوتا ہے اس لئے عام رائے دہندگان کے لئے عملاً یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ مقام انتخاب تک پہونچ سکیں اکثر لوگوں کو تین یا چار دن کا سفر پیدل یا خچر پر طے کرنا پڑے گا۔ اس کے

علاوہ یہ اندیشہ بھی ہے کہ اگر انتخاب کا کام باقاعدہ طور پر ہو تو کہیں سیاسی تجار کو آگے بڑھنے کا موقعہ نہ مل جائے اور یہ لوگ بآسانی بیرونی طاقتوں کے ہاتھ بک جائیں ۔ برخلاف اس کے قومی حکومت اس بات کی کوشش کرتی ہو کہ جن امیدواروں کو وہ منتخب کرائے وہ اپنے انتخاب کے بعد حب الوطنی۔ اور وطن دوستی کا ثبوت دیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ پہلوی حکومت قائم ہی اس وجہ سے ہوئی کہ ایران اصلاحات اور جدید تہذیب اور ترقیات کی راہ پر گامزن ہو جس قوم نے ۱۹۲۵ء میں اپنی مجلس موسسہ میں رضا شاہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے لائحہ عمل کی تکمیل کے لئے کوشش جاری رکھیں اس قوم نے اگر رضا شاہ کے مطلوبہ قوانین کی منظوری دی تو یہ کسی طرح قابل اعتراض نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک دور اصلاحات ختم نہ ہو جائے جمہوری اصول پر منتخب کردہ مجلس سے بجائے مدد ملنے کے رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔ موجودہ رفتار اگر اسی طرح جاری رہی (اور اس رفتار کی سرعت کچھ کم نہیں) تو حکومت نے جو اصلاحات شروع کی ہیں ان کو پایہ تکمیل تک پہونچانے میں کم از کم دس سال صرف ہوں گے۔ ایران کی غیر ذمہ دار اور نیم دستوری حکومت نے ملک کو جو فائدہ عظیم پہنچایا ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ایران کے اکثر ادارات اس سے بالکل مطمئن ہیں اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ اصلاحات کا دور جب ختم ہو جائے گا تو موجودہ حکومت کی بجائے انگریزی نمونہ پر ایک آئینی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔

انقلاب سے پہلے اردو شاعری کی حالت

یہ ایک باب ہے عبدالقادر صاحب سروری کی کتاب "جدید اردو شاعری" کا جو عنقریب طبع ہو کر شائع ہونیوالی ہے

ادبیات کا تعلق قوم کی زندگی کیساتھ اسقدر گہرا ہو کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہو۔ قوموں کی حیات پر جتنے انقلاب آفریں واقعات گذرتے ہیں ان سے قومی شاعری بھی متاثر ہوتی ہو یہی سبب ہو کہ ایک ہی قوم اور ایک ہی زبان کی شاعری مختلف زمانوں میں جداجدا رنگ رکھتی ہو انگریزی شاعری کے ارتقا کا مطالعہ کیجیے تو چاسر کے زمانہ سے کچھ سال بعد سے لے کر سولھویں صدی کے وسط تک کا زمانہ بہت ہی بنجر اور قحط سالی کا ملیگا مگر اس کے بعد ملکہ الزبتھ کی حکومت کا زمانہ آتا ہے جو انگریزی ادبیات کا زرین دور ہو پھر ۱۶۶۰ء سے ۱۸۰۰ء تک انگریزی ادب اور شاعری کا معیار پست ہونے لگا تھا۔ اسی طرح اطالوی ادب میں بھی سولھویں صدی کے وسط کا زمانہ تاسو۔ ماروتی اور چند دوسرے شاعروں سے قطع نظر کرکے شاعرانہ قابلیتوں کی خوابیدگی کا زمانہ ہو۔ اردو شاعری پر بھی اس کی مختصر حیات کے دوران میں کئی موافق اور ناموافق زمانے آتے جاتے رہے۔ اور اسی تعلق کی وجہ سے اردو شاعری اور ادب کا معیار گھٹتا بڑھتا رہا۔

اردو شاعری نے اپنی پیدائش سے لیکر اب تک کئی لباس بدلے۔ نہایت سرسری اور عام مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم تین دور اس شاعری کے گذرے ہیں۔ سب سے پہلے اپنی پیدائش میں یہ زیادہ تر ہندی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی سرزمین اور اسی معاشرۃ کے آب و گل سے اس کا خمیر ہوا ہے۔ بعد میں حاکم مغلوں کی زبان یعنی فارسی سے یہ اس قدر متاثر ہوئی کہ ظاہر اور باطن دونوں لحاظ سے یہ فارسی شاعری کا مثنیٰ معلوم ہونے لگی۔ پھر جب انگریزوں کا تسلط

ہندوستان پر ہوا تو مغربی شاعری کی طرف یہ زیادہ سے زیادہ مائل ہوتی گئی۔ گویا اردو شاعری کے بھی وہی تین دور ہیں جو خود ہندوستان کی تاریخ کے سمجھے جاتے ہیں۔

اردو شاعری پر موجودہ انقلاب آنے سے پہلے، اس کی جو حالت تھی اس پر ہم یہاں تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس باب کا مطالعہ موجودہ دور میں اردو شاعری کی اصولی تبدیلی کے اسباب، قارئین کرام پر اچھی طرح ظاہر کر دیگا۔ اور اس سے یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ ہم انقلاب سے قبل کی شاعری کا موازنہ جدید شاعری کے ساتھ بآسانی کر سکیں گے۔

اردو شاعری کا یہ دور انیسویں صدی کی ابتدا سے لیکر تقریباً ستر سال بعد تک ہے:-
اس زمانہ میں اردو شاعری کا تعلق زیادہ تر لکھنؤ سے رہا جہاں غدر سے پہلے تک شاعروں کو شاہی درباروں کی سرپرستی نصیب ہوتی رہی۔ اس دور کی بیشتر شاعری درحقیقت قدیم اردو شاعری کے تنزل کا نمونہ ہے۔ دہلی کی شہنشاہی کے خاتمے نے ایک پژمردگی کی رو ساری ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی فضا میں دوڑا دی تھی۔ اس پستی سے اردو شاعری بے حد متاثر ہوئی۔
اس زمانے میں بھی اردو کے بہت سے قابل قدر شاعر پیدا ہوئے۔ لیکن چند مستثنیٰ مثالوں کے سوا جن کی ذاتی قابلیت مروجہ شاعری کے تمام معین، مصنوعی اور رسمی اصولوں کو توڑ کر بلند ہو گئی۔ شاعری کی پست ہمتی اور ریچ پچ سے خالی ہونیکی ایک مسلسل داستان ہے۔ رنگین۔ سلیمان۔ ظفر، قائم، منت، ممنون، حسرت، قدرت، بیداد، ہدایت، فراق، ضیا، بقا، حزیں، بیان، راسخ، نظیر، ناسخ، برق، بحر آباد۔ وزیر، رشک، قہر، منیر، سعادت، اختر (واجد علی شاہ) اسیر، امانت، قلق، ذکی، درخشاں انس، انیس، دبیر، عشق، تعشق، صابر، رشید، اوج، غالب۔ ذوق۔ مومن، مجروح، تیر، شیفتہ داغ، اس دور کے جلیل القدر شعرا ہیں، غیر مشہور شاعروں اور ریختی نگاروں کا شمار تو حساب سے باہر ہے۔ اس اہتمام بالشان فہرست کے ناموں پر نظر ڈالیں تو ہم ان کی کثرت سے متاثر ہوئے نہیں رہ سکتے۔ اور اگر ہر شاعر کے کلام کو انفرادی طور پر جانچیں یا ان کا تقابلی مطالعہ بھی کریں تو ہم ان کی مخصوص ذکاوت، کلام کی کثرت اور اس کے صوری تنوع سے بے حد مرعوب ہوتے ہیں

نظیر، انیس، دبیر، غالب، ذوق، داغ کو چھوڑئیے۔ یہ خاک کے ہیرے ہیں۔ اور انہیں سوا اس تنزل کے دور کی شاعری زندہ ہو لیکن اس طویل فہرست کے کسی دوسرے بڑے بڑے شاعر کے کلام کو آپ میر، درد، سودا، سوز، اثر نہیں، بلکہ انشا، مصحفی، جرأت اور شاہ نصیر ہی کے کلام کے سامنے رکھئے! اس کا جادو کیسا غائب ہو جاتا ہے حق یہ ہو کہ اس دور کے شاعر قدما کی سہارے زندہ تھے، انہیں کی ہم نامی اور ہم نوائی کے طفیل میں شاعر مشہور ہوئے۔ ورنہ اکثر صورتوں میں "شعریت" ان کے کلام سے کوسوں دور ہے۔

غزل گوئی اردو کے قدیم اور جدید شاعروں کا بڑا مقبول مشغلہ رہا ہے، غزل کے ارتقا کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے لیکر میر اور سودا تک اس میں جو ترقی ہوئی، وہ انہیں پر ختم ہو گئی۔ انشا، جرأت اور مصحفی میر کا اتباع کرتے ہیں، اس لئے ان کی غزلیں بھی کم و بیش غزل کے تمام اوصاف سے پُر ہیں۔ غزل اور قصیدہ کو میر اور سودا نے انتہائے کمال تک پہنچایا تھا۔ تاہم ان کے بعض معاصر شعرا جیسے درد۔ سوز، اور اثر وغیرہ یا ان کے بعد ہی آنے والے شاعر جیسے انشا جرأت مصحفی، شاہ نصیر ہی سے ہر ایک نے اگر غزل کو ترقی دینے میں کامیابی حاصل نہیں کی تو کم سے کم اس کو اپنی جگہ برقرار رکھنے میں انہیں بیحد کامیابی ہوئی۔ درد بھی اگر میر ہی کی طرح عاشقانہ غزل گوئی اختیار کرتے تو نہ اس صنف میں وسعت پیدا ہوتی اور نہ خود ان کا رنگ میر کے مقابلہ میں جم سکتا تصوف کو اپنی غزل کا موضوع بنا کر درد نے شاعری کا تنوع اور اپنی انفرادیت قائم کر دی جس کا احساس خود ان کو تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ پھولے گا اس زباں میں بھی گلزار معرفت۔ یں یاں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا۔ یہی حال انشا۔ جرأت۔ مصحفی اور شاہ نصیر کا بھی ہو جنہوں نے غزل کو صرف میر ہی کے معیار پر لکھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان کے کلام میں سادگی، اوج، عمق، زور، اور اثر غرض غزل کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ فرق صرف صناعی کا ہے۔ میر کا سا اعلیٰ دماغ انہیں مبدٔ فیاض کی طرف سے عطا نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس قابل تحسین جماعت کے ہاتھ سے نکلکر غزل جب مذکورہ بالا گروہ کے شعرا کے ہاتھ میں پہنچی، تو وہ نہ صرف اپنی بنیادی خصوصیات

سے عاری ہوگئی، بلکہ بسا اوقات اس میں شعریت کا کوئی جزو بھی باقی نہ رہا۔ خیالات اور موضوعات کا غزل میں بہت کم اضافہ ہوا لیکن اپج کا مادہ ہر جگہ اپنا کام کرتا ہے۔ اس کی بدولت ہماری شاعری کو فائدہ پہنچنے کی بجائے اکثر نقصان پہنچا۔ کیونکہ متاخرین کے اس گروہ نے جب میرؔ، سوداؔ اور ان کے معاصرین اور تابعین کو انہیں کے میدان میں شکست دینے کی سکت اپنے آپ میں نہ پائی تو ان کی اپج کا فطری مادہ اسالیب کے تغیر کی طرف مائل ہوگیا اور ان کی پستی کا نامعلوم احساس ان کی غزل میں رعب وادب کی شکل میں ظاہر ہونے لگا رفتہ رفتہ غزل کے شعر معموں کی شکل اختیار کرنے لگے۔ آتشؔ۔ ناسخؔ، مومنؔ وغیرہ کی شاعری اور غالب کا ابتدائی کلام اس کا ثبوت ہے۔

ایک طرف تو غزل میں اپج اور جدت طرازی کا فطری مادہ یہ کام کر رہا تھا۔ دوسری طرف بعض شاعروں نے میرؔ، اور سوداؔ کے ریختہ کے مقابلہ میں ریختی ایجاد کی۔ بعض جنگجو اپنی طبعی قوت کے وسیلے سے حریف پر غلبہ پانا مشکل دیکھتے ہیں تو پھر وہ عورتوں کے ذریعہ انہیں مغلوب کرتے ہیں۔ غالباً ریختی نکالنے والوں کا بھی یہی مقصد تھا۔ لیکن ریختی گویوں کا یہ منتر بھی ریختہ گویوں کے مقابلے میں کارگر نہ ہوسکا کیونکہ اس کے موجدوں ہی نے اس کو اپنے ادنے اور شہوانی جذبات کے اظہار کا آلہ بنا لیا۔ انشا سے لیکر آجتک کسی ریختی گو کا کلام اس طرح کے حیوانی جذبات سے خالی نظر نہیں آیا۔ اسی وصف نے ریختی کو اردو شاعری کی کوئی مستند صنف نہ بننے دیا۔ اور یہ جدت طرازی اس طرح ضائع ہوگئی۔ ورنہ فی نفسہٖ ریختی کوئی بری صنف نہ تھی۔ کیونکہ ہماری سوسائٹی میں عورتوں اور مردوں کی علیحدگی اور پردہ داری کی رسم نے عورتوں کی زبان میں چند مخصوص صفت پیدا کردیئے ہیں۔ جو مردوں کی بول چال میں نہیں آسکتے۔ ریختی کی ایجاد بھی اگر فحش سے نہ ہوتی تو کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ ہندی شاعری کی حریف تھی۔ غزل تنزل کے اس مرحلے پر پہنچنے کے بعد ہمارے ادب کے لئے ایک بھولی ہوئی صنف ہوجاتی اگر جدید احساس پیدا ہونے سے پہلے دہلی میں قدیم شائستگی کے چند علمبردار جیسے ذوقؔ۔ غالبؔ۔ اور داغؔ نہ پیدا ہوجاتے۔ ان

شاعروں نے غزل کا احیا کیا۔ ذوق نے اپنی سادگی اور سلاست سے۔ داغ نے اپنی املی (؟) صناعی اور لطافت کے ذریعہ۔ اور غالب نے اپنی بلند آہنگی کی بدولت غزل کو پھر میر اور سودا کے زمانہ کی سی مقبولیت بخشی۔ خس و خاشاک سے پاک کر کے انہوں نے اس صنف شعر کو ایسے بلند رتبہ تک پہونچا دیا کہ اس کا عشر عشیر بھی آج تک کسی شاعر کو نصیب ہو سکا۔ غزل کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے گویا یہ اس کا سنبھالا لینا تھا۔

قصیدہ اپنی اصلی خصوصیات کے ساتھ اردو میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ فارسی شاعری کے قصیدے جو بادشاہوں اور امیروں کی مبالغہ آمیز مدح میں لکھے گئے تھے۔ ہمارا اصول راہنما ہو اگر ہم اسی قسم کے قصیدوں کو اپنا معیار سمجھیں تو سودا کے قصیدے لازوال شہ پارے ہیں۔ ان کے بعد سے دلی کے آخری شاعر داغ تک اس معیار کے قصیدے لکھے ہی نہیں گئے۔ قصیدے کا ارتقا اردو ادب میں، فارسی کے برخلاف بہت ہی کم ہوا۔ اس میدان میں اس سرے پر سودا ہیں اور دوسرے سرے پر ذوق۔ درمیان میں تقریباً ایک صدی کا طویل وقفہ ہے۔ جس میں قصیدہ گوئی بالکل خوابیدہ رہی۔ اس اثنا میں قصیدہ گوئی کے ذوق نے ایک اہم کام ضرور انجام دیا۔ یہ ہجو نگاری کی ترقی ہے۔ ہجو درحقیقت قصیدے کی فرع ہے۔ ہجو کے سرتاج بھی سودا ہی ہیں۔ لیکن نقاد سودا کی شاعری کے اس پہلو کو ہمیشہ تاریک پہلو سمجھتے رہے۔ مدح سرائی کی طرح شاعروں نے مذمت میں بھی حدِ اعتدال کا خیال بالائے طاق رکھدیا ہے۔ ور اکثر فحش پر اتر آئے ہیں۔ اس لئے ہجو نگار شعرا نے جس قدر موشگافیاں کی ہیں وہ ضائع ہیں۔

رباعی اردو شاعری میں، فارسی شاعری کی طرح زیادہ رواج نہ پا سکی۔ قدیم شعرا نے بھی صرف تنوع صنف کی خاطر اس میں اظہار خیال فرمایا تھا۔ اس لئے اس صنف ارتقا پہلے ہو سکا نہ اب ہوتا نظر آتا ہے۔ لیکن قدیم اصناف سے مثنوی کو اس دور میں خاص

۱) مقدمہ شعر و شاعری

در پر فروغ نصیب ہوا۔ قدیم اردو میں مثنوی بہت مقبول صنف تھی چنانچہ اکثر مذہبی تعلیمات اور اخلاقی یا عشقیہ قصے، قدیم زمانہ کے شعرا مثنوی ہی میں لکھتے تھے۔ انہیں شعرا نے مثنوی کی ایک شکل بھی معین کر دی تھی۔ شمالی ہند میں جب شاعری شروع ہوئی تو اس صنف کا رواج کچھ دنوں کے لئے کم ہو گیا تھا۔ میر اور سودا کا عصر دراصل غزل اور قصیدے کا عصر ہے، انہیں دو صنفوں کو ان شعرا نے اور ان کے مقلدین نے خوب ترقی دی۔ میر اور سودا کی مثنویاں نہ تو فارسی مثنوی کا تتبع ہیں، اور نہ قدیم اردو شاعروں کی مثنویوں کی تقلید میں لکھی گئی ہیں بلکہ یہ عموماً مختصر سی ہیں جن میں کسی خاص واقعہ کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ میر اور سودا کے عصر میں یا اس کے قریب بعد میں، میر اثر کی مثنوی "خواب وخیال" سے بہتر کوئی مثنوی نہیں لکھی گئی۔ اردو مثنوی کی جو شکل بعد میں میر حسن نے قائم کی، وہ بڑی حد تک خواب وخیال سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ "خواب وخیال" کے زمانے سے لیکر "سحرالبیان" کے لکھے جانے تک جو عرصہ گذرا اس میں کوئی قابل ذکر مثنوی نہیں گئی۔ اردو مثنوی کو میر حسن نے مقبول بنایا۔ ان کی مثنوی "سحرالبیان" اردو کی مثنویوں میں سب سے بلند رتبہ ہے۔

ہمارے پیش نظر دور میں جتنی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ وہ سب "سحرالبیان" کی تقلید ہیں۔ ان میں بعض مثنویاں جیسے مرزا محمد تقی خاں ہوس کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار ارم" اور نواب مرزا شوق کی مثنویاں بے حد قابل قدر ہیں لیکن "سحرالبیان" سے ان کو کوئی نسبت نہیں: نازک خیالیوں اور زبان کے چٹخاروں نے ان مثنوی کو کتنا ہی مقبول کیوں نہ بنا دیا ہو "سحرالبیان" کی سادگی، صفائی اور سب سے بڑھکر اس کی شعریت ان میں کم پائی جاتی ہے "سحرالبیان" ہر مذاق کے لئے ہے۔ اور ان مثنویوں سے خاص مذاق ہی متاثر ہوتے ہیں۔ بلند پایہ ادبی کارنامے مقام اور زمان کی قید سے اعلیٰ وارفع ہونے چاہئیں۔

واسوخت اور "سبھا" اس عصر کی مخصوص منظوم اختراعات ہیں۔ واسوخت خیالی اور تقلیدی شاعری کی ایک فرع ہے۔ اس نوع کی شاعری کا نہ تو مقصد ہی اعلیٰ ہوتا ہے۔ اور نہ اس کے اچھے نمونے ہی پیدا ہوئے۔ اس لئے واسوخت کو نہ جب فروغ نصیب ہو سکا اور نہ اب ہو سکیگا۔

واسوخت کے موجدوں نے ریختی گویوں کی طرح، اس کی بنیاد ہی ایسے زود فنا جذبات پر رکھی تھی کہ، جلد ہی یہ صنف متروک ہوگئی، اور اب صرف تاریخ ادبیات کی زینت ہے۔ "سبھا" یقیناً قابل قدر اختراع تھی۔ اور اگر اس عصر کا اصل اصول تقلید نہ ہوتا یا کم سے کم زمانہ اسقدر جلد بدل جاتا، تو توقع تھی کہ امانت نے "اندر سبھا" کی شکل میں جس فن کی بنیاد ڈالی تھی، اسے ارتقا نصیب ہوتی اس زمانے کی تقلیدی ذہنیت کا یہ حال تھا کہ مداری لال نے جب "اندر سبھا" کو سامنے رکھکر اپنا ناٹک لکھا۔ تو اس سے آگے بڑھنا تو درکنار، خود اس کی حد تک بھی نہ پہنچ سکے اور پھر ظاہر کے لحاظ سے امانت کی "اندر سبھا" اور مداری لال کی "اندر سبھا" میں کچھ فرق نہیں۔ ان سبھاؤں کی قدر اس زمانے میں بہت ہوئی۔ مگر اس لئے نہیں کہ یہ شاعری کا اعلیٰ نمونہ تھیں، بلکہ صرف اس لئے کہ یہ ایک جدت تھی۔ یہ ساون کی گھاس کی طرح پیدا ہوئیں اور ابھی نشو و نما بھی نہ پائی تھیں کہ سیاسی انقلاب نے انہیں فنا کر دیا۔

اس دور کی ادبی قحط سالی پوری ہو جاتی، اگر اس میں مرثیہ جیسی قابل قدر صنف کی شاعری کا نشو و نما نہ ہوتا۔ مرثیہ اپنی موجودہ شکل میں درحقیقت اسی عصر کی پیداوار ہے اس کے موضوع میں اس قدر تنوع اور اس کے معمار ایسے صناع تھے کہ ان سے نہ صرف رزمیہ منظومات کی کمی پوری ہوتی ہے، بلکہ واقعات نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری کے کئی ایک قابل قدر پہلوؤں کا اردو شاعری میں اضافہ ہو جاتا ہے جب تک اردو شاعری باقی ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے نام دنیا میں احترام کے ساتھ لئے جائیں گے لیکن مرثیہ سے متعلق دو امر خاص طور سے قابل طلب ہیں ایک تو یہ کہ انیس اور دبیر کے بعد ان کی آدھی قابلیت کے مرثیہ نگار بھی اردو میں پیدا نہ ہو سکے۔ اور اسی لئے اس کے موجد، اس کے خاتم بھی بن گئے۔ دوسرے مرثیہ کی شاعری، درحقیقت مروجہ شاعری سے بیزاری کا ایک بدیہی نتیجہ ہے۔ نیز مرثیہ کی شاعری کے عروج کا زمانہ جدید شاعری کے آغاز سے اس قدر متصل ہے کہ ہم اگر اس کو جدید شاعری کی ابتدا نہ سمجھیں، تاہم قدیم شاعری سے دل برداشتگی کے آثار اس میں ضرور ملیں گے۔

مرثیہ سے ہٹ کر اس دور کی شاعری میں ہم کو کوئی چیز ایسی نہیں ملتی، جسے ہم اردو شاعروں میں شعری احساس کی ارتقا کا ثبوت سمجھ سکیں، ہاں اس احساس کے تنزل کا پتہ بہت آسانی سے چل جاتا ہے۔ اس لئے دور جانے کی ضرورت بھی نہیں، ہزل، زٹل، ہرسیہ وغیرہ، بیسیوں چیزیں اس زمانے میں شعر کے نام سے پھیلی ہوئی ملتی ہیں۔ حالانکہ اس طرح کی لغویات ان میں کتنی ہی اپج کیوں نہ ہو، شاعری سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں۔ اور اگر ہم انہیں شاعری میں داخل کرنے لگیں تو ہم اپنی ادبیات کی بدنامی کے ذمہ دار ہوں گے۔

غرض انقلاب سے پہلے کی اردو شاعری پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر صنف شعر کی پیدائش سادگی پر ہوئی۔ بعد میں ان کا ارتقا مضامین کے اعتبار سے بہت کم ہوا، اسلوب اور زبان کے لحاظ سے ان میں الجھاؤ اور ظاہری شان و شوکت بڑھتی گئی، سادگی سے پیچیدگی کی طرف ترقی اردو شاعری کا عام اصول معلوم ہوتا ہے۔ غزل جو میر، سودا، درد کے یہاں سادہ تھی آتش، ناسخ، اور مومن اور ایک حد تک غالب کے ہاتھوں میں بیحد مصنوعی آرٹ کا نمونہ بن گئی مثنوی میں میر حسن کے سادی سیدھی صناعی کی جگہ پنڈت دیا شنکر نسیم وغیرہ کے اعلی دقیق تصنع نے لے لی۔ قصیدے میں بھی یہی چیز نظر آتی ہے۔ سودا کے قصیدے کتنے ہی پرشکوہ کیوں نہ ہوں لیکن ان میں سادگی ہے، اور ذوق کے قصیدوں کی سی دقت نظر کا ان میں پتہ نہیں۔ خود مرثیہ پر بھی یہ اصول ایک حد تک صادق آتا ہے۔ انیس اور دبیر دونوں معاصر ہیں اس کے باوجود میر انیس کی سادہ پرکاری کے مقابلہ میں مرزا دبیر کی فلک پیمائی قابل غور ہے۔

لیکن زندہ زبان اور زندہ ادب مخالف ماحول اور ہمت شکن فضا میں بھی کہیں کہیں اپنی حیات کا ثبوت دینے پر مجبور ہے۔ رسمی مضامین اور معین اسالیب کے درمیان سے میاں نظیر اکبرآبادی کا اٹھنا، غزل کی رونق جب بگڑ چکی تھی، غالب اور داغ جیسے باکمال غزل گو شعرا کا پیدا ہونا اور جب اردو شاعری کی قلمرو قطعاً محدود نظر آ رہی تھی، انیس اور دبیر کا مرثیہ کی رزمیہ شاعری کا علم بلند کر کے اٹھ کھڑا ہونا، ہماری زبان اور ہماری شاعری کی زندگی کے منتشر ثبوت ہیں۔ اگر زیر

اردو ران شاعروں سے خالی ہوتا تو پھر اس میں پائیدار اہمیت کا ادب لا پتہ تھا، دوسرے
سرے درجہ کے شاعر تو اس عصر میں بہت سے ہیں، قومی پژمردگی سے اردو شاعری اس دور
س جس قدر متاثر ہوئی شاید ہی کبھی ہوئی ہو، ہر شاعر کا کلام اکثر و بیشتر یاس انگیز جذبات سے
ہے اور اس طرز کو متصوفانہ خیالات سے بڑی مدد ملی۔ تصوف ناواقف کے لئے بہت ہی مبہم چیز
ں لئے اس دور کے شاعروں کے لئے اس رنگ میں شاعری کرنے سے بڑی آسانی پیدا ہو گئی
تی۔

قدیم شائستگی اور تمدن کے اس آخری دور میں ہماری ادبیات اور شاعری میں اعلیٰ پایہ
راد تخیل کارناموں کی پیدایش کا عدم تسلسل اور بلند سے بلند تر شعری احساس کی طرف ذہنیتوں کی
رفتار کا منقطع ہوتا جانا اور پائدار شاعروں کا وقفوں وقفوں سے ابھرنا اس بات کا پتہ دیتا ہے
اس کو کسی قوت محرکہ کی ضرورت ہے۔

غزل

از مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری

دوسرا پا ناز کہہ لوں اس ستم آرا کو میں
کس طرح قائل کروں گا لیکن اک دنیا کو میں

ن نے کر دیں نمایاں عشق کی مجبوریاں
کھا گیا غش۔ دیکھ کر اس چہرۂ زیبا کو میں

ہے بیابانوں سے میری وحشت دل بے نیاز
خود جنوں کی جیب میں رکھتا ہوں اک صحرا کو میں

وں وہ مجنوں بس مرا چل جائے دنیا میں اگر
جتنے زیور ہیں پہنا دوں لا کے سب لیلیٰ کو میں

رزو یہ ہے کہ سینہ میں سمائے جس قدر
دل کے بدلے بھر لوں خاک یثرب و بطحا کو میں

م عالم میں اسی سر ہے رواں روح نشاط
دل سمجھتا ہوں جہاں کا قبۂ خضرا کو میں

کاش ہو اس کے قدم تک بھی رسائی ایکدن
چومتا رہتا ہوں اسلم جس کے نقش پا کو میں

مکالمہ عالم ارواح

ہندوستان کا تعلیمیافتہ طبقہ خصوصًا علماء عربی داں جرجی زیداں صاحب مصنف تمدن اسلام اوران کے رسالے الہلال سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جرجی زیداں صاحب کا انتقال ہوگیا ان کے صاحبزادہ امیل زیداں صاحب نے ایک مضمون اپنے مشاہدات ومکالمہ عالم ارواح پر لکھا ہے۔ خود مرحوم جرجی زیدان کو عالم ارواح سے بلاکر امیل صاحب نے گفتگو فرمائی ہے مضمون کا اقتباس اور کل گفتگو کا ترجمہ ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش ہے

یہ موضوع عرصہ سے ہندوستان میں بھی اہل علم کو اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے ہے اکثر اکثر اصحاب اسکو یقینی خیال کرتے ہیں اوران کے پاس اس کے تیقن کے کافی مشاہدات اور دلائل ہیں۔ اکثر اس کو دھوکا خیال کرتے ہیں۔ اکثر شیاطین سے اسکو منسوب کردیتے ہیں لیکن دلچسپی ہر شخص لیتا ہے اور اس فکر میں نظر آتا ہے کہ اگر واقعی یہ صحیح ہو اور اس پر بھی اسی طرح یقین ہوسکے جس طرح سائنس کے دیگر مسائل صحیح اور قابل یقین ہیں تو انسان کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوجائے۔

خاکسار مترجم

مضمون

کیا ارواح ہم سے کلام کرسکتے ہیں اگر ایسا ہے تو کس طرح؟ کیا انسانی جسم کے فنا ہونے پر کل چیزیں فنا ہوجاتی ہیں؟ یا روح جسم سے نکل کر بھی زندہ رہتی ہے کیا اس کی زندگی مستقل ہے؟ کیا حوادث اس کو اس زمین پر پیش آئے تھے وہ اس کے حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں؟

اگر روح کا وجود آیندہ فرض کرلیا جائے۔ اور اس کی مستقل زندگی بھی تسلیم کرلیجائے۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس سے گفتگو اور ملاقات کرسکیں۔

یہ مسائل ہیں جو عرصہ سے عقلاء کرہ ارضی کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔ میں بھی ایک عرصہ تک ایک زمانہ میں ایسی فکر میں مبتلا رہا تھا اب ایک عرصہ سے میں نے یہ خیال کرکے کہ اس کا قطعی ثبوت نہیں ہو پالکل اس کی طرف سے اپنے خیال کو ہٹا لیا تھا لیکن چند سال کے بعد اتفاق سے ایسے مشاہدات پیش آئے کہ میں مجبور ہو گیا کہ اس کو پھر ایک مضمون کی شکل میں پیش کر دوں۔

میرے نزدیک دنیا میں انسان کے لئے اس موضوع سے بڑھکر کوئی موضوع نہیں۔ اگر یہ خاطر خواہ حل ہو جائے تو جو کچھ ترقی اس وقت حاصل ہوئی ہو اس مسئلہ کے حل کے بعد یہ اگلی اس آئندہ ترقی کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہ ہو۔

میں جب یہ مضمون لکھ رہا تھا تو خود بھی متردد تھا کہ اس کو لکھوں یا نہ لکھوں مجھے یقین ہو کہ اس مضمون پر کہیں شک کیا جائیگا اور کہیں تکذیب کیجائے گی۔ میرے معلومات اور مشاہدات اس وسیع میدان میں نہایت درجہ حقیر ہیں۔ یہ مضمون اس قدر وسیع ہے کہ میرے خیال و وہم سے بھی زیادہ اس میں وسعت ہو۔ میں اسکو کسیطرح عبور نہ کر سکوں گا۔

میں اسی پس و پیش میں تھا کہ آخرکار میں نے یہ فیصلہ کرکے قلم اٹھایا کہ ہرچہ بادا باد میں نے کچھ خود دیکھا ہے وہ ضرور لکھوں گا خواہ یقین کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

اس مضمون کو لکھتے وقت میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں اور ان میں اب بحث و مزید تحقیقات کی گنجائش نہیں ہو۔ میں نے برسوں پہلے بھی ان امور پر غور کرکے چھوڑ دیا تھا لیکن اب جو تجربے میرے سامنے ہوئے ان کو میں ضروری سمجھتا ہوں کہ دنیا کے سامنے پیش کر دوں۔ بہت سے بڑے بڑے علماء روحانیات کے قائل ہو گئے ہیں۔ اگرچہ لیکن بہت سے جو اس پر یقین نہیں کرتے۔ جو لوگ روحانیات کے قائل ہیں ان میں سے یہ لوگ جیسے سر اولیور لاج۔ سر ولیم کروکس۔ سر ولیم جیمس وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ روح کے قائل ہیں اور انہوں نے کافی غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ جسم کے فنا ہونے کے بعد بھی روح زندہ رہتی ہے۔ ان کی علمی قابلیت اور شہرت ان کی اصابت رائے کی کافی دلیل ہے۔

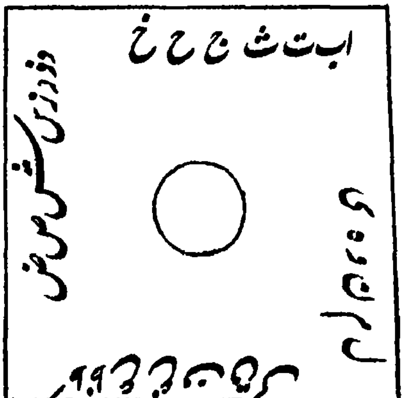
ان مسائل میں روزانہ تحقیقات اور معلومات جدید ہو رہی ہیں۔ اور لوگ کثرت سے اب اس طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ اگرچہ اس کے اصول ابھی اس طرح مدون نہیں ہوئے جس طرح ریاضی وطبعی علوم کے اصول مدون ہو سکے ہیں۔ نہ ان پر ابھی اس طرح یقین کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سائنس کے دیگر اصولوں پر یقین کیا گیا ہے۔ جب ہم ان اصولوں پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جس قدر اصول علمی مروج اور مسلمات میں سے ہیں وہ سب شروع میں نظریات ہی تھے۔ رفتہ رفتہ تجربوں اور علوم نے ان کی صداقت تسلیم کی۔ اور اب وہ مسلمات سمجھے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی وقت ایسا بھی آئے جبکہ روحانیات کے نظریات بھی مسلمات تسلیم کرلئے جائیں اور ممکن ہے کہ ان کے اصول بھی اسی طرح ناقابل تردید ہو جائیں جس طرح آج کل طبیعیات و ریاضی کے اصول ناقابل تردید ہو گئے ہیں۔ ان تمام حالات پر نظر کرتے ہوئے اگرچہ میں اپنے مشاہدات کو اہل علمی تحقیقات کا نتیجہ تو نہیں کہہ سکتا۔ مگر اس کو محض خرافات اور من گھڑت یا شعبدہ بازی بھی نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے کہ علماء روحانی ترقی کر کے کوئی مفید اور ضروری مسئلہ ایسا حل کرلیں کہ دنیا کو مفید ہو۔ میں نے تو صرف اس موضوع پر مضمون لکھ کر اس دروازہ کو کھولدیا ہے جو اب تک مقفل تھا ممکن ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آئے کہ یہ سب محض تفریح ہی ثابت ہو۔ بہرحال یہ ضرور ہے کہ کچھ نہ کچھ علماء کی توجہ سے اس پر گفتگو ہوگی اور کوئی مفید نتیجہ نکلے گا۔ اور وہ نتیجہ حقیقت میں علم کی ہر طرح خدمت ہی ہوگا۔

اس تمہید کے بعد میں اپنا اصل مضمون شروع کرتا ہوں۔

لبنان شام میں ایک موسم گرما کے چند ہفتے میں نے گذارے۔ میرے بعض دوست بھی اس زمانہ میں وہاں تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے مشاہدات اور مکالمہ ارواح کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ آج کل ان امور کی تحقیقات میں مصروف ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ ان حالات کو دیکھوں انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اپنے والد مرحوم کی روح کو آپ بلائیں اور ان سے گفتگو کریں ایسے اخبار اور امور جو صرف آپ دونوں کے علم میں ہوں گے ظاہر ہو جائیں گے۔ اس طرح آپ کو شک نہیں رہے گا۔ آپ کو شک کرنے کا تو حق ہے لیکن جب ایسا ثبوت بین موجود ہے۔ تو کم سے کم آپ کو اس پر توجہ کرنا

ہوگی کہ یہ کیا کرشمہ ہے۔ اور یہ اسی وقت زیادہ بہتر ہوگا جبکہ آپ اپنے والد صاحب کی ہی روح کو بلا کر شرف مکالمہ حاصل کریں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم لوگ دھوکا دیتے ہیں یا یہ باتیں کچھ قابل لحاظ بھی ہیں۔ میں ان کے اصرار پر ایسے جلسے میں شریک ہونے پر راضی ہو گیا۔ چنانچہ میں ان کیساتھ جلسوں میں مجلسوں میں جہاں ارواح کو بلایا جاتا، اور ان سے گفتگو کیجاتی تھی گیا۔ چند جلسوں میں تو میں کچھ نہیں سمجھا۔ یا یہ کہنا چاہئے کہ نہ سمجھ سکا۔ بعد میں مجھے بعض بعض باتیں معلوم ہونے لگیں۔ میرے دوست جو اس مشاہدہ کے محرک تھے ایک سال سے اس کام کو کر رہے تھے۔ انہوں نے بعض بعض مشاہدات اور تجربے ایسے مجھے بتائے کہ عقل حیران ہوتی تھی۔ مجھے ان کے فریب دینے یا دھوکہ باز جھوٹا ہونے کا گمان تک بھی نہیں ہے۔ مگر میں صرف اپنے ہی مشاہدات ہدیہ ناظرین کرونگا۔

جو طریقہ عموماً مروج ہے وہ یہ ہے کہ ایک مربع شکل کی تختی جس کا نمونہ ذیل میں درج ہے۔



نہایت عمدہ سنگ مرمر کی ہوتی ہے۔ اور اس کے چاروں طرف حروف مفردات لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی پیالی ہوتی ہے۔ جو آسانی سے پھسل سکتی ہے۔ اس تختی کے سامنے دو آدمی جو واسطے کہلاتے ہیں، بیٹھتے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے روح سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں اپنی انگلیاں اس پیالی پر رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد اہل جلسہ جس روح کو طلب کرنا چاہیں وہ ان سے کہدیتے ہیں اور وہ روح کسی ایسی روح کے توسط سے طلب کیجا سکتی ہے جس سے پہلے ان واسطوں کی ملاقات ہو۔ یعنی وہ ان کی طلب پر پہلے آ چکی ہو۔ اسی ملاقاتی روح کو پہلے طلب کیا جاتا ہے اور اس سے درخواست کیجاتی ہے کہ ہم فلاں روح سے ملنا چاہتے ہیں۔ جب یہ درخواست ملاقاتی روح سے پیش کر دیجاتی ہے۔ اسوقت جملہ حاضرین خیال کرتے ہیں کہ وہ روح جو طلب کی گئی تھی آ گئی۔ تھوڑی دیر میں واسطوں کو معلوم ہوتا ہے کہ پیالی حرکت کر رہی ہے۔ یہ واسطے روح

کے آنے کی اطلاع دیتے ہیں۔ اور جو سوال کیا جاتا ہے اس کا جواب پیالی کی حرکت سے اس طرح ملتا ہے کہ پیالی صرف مفردات پر حرکت کرتی ہے۔ اور مفردات سے کلمہ اور کلموں سے جملے بنتے رہتے ہیں اور جواب پورا آجاتا ہے۔ حاضرین جلسہ صرف پیالی کی حرکت دیکھ سکتے ہیں اور کچھ نہیں معلوم کر سکتے۔ اس تفصیل کے بعد میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ واسطے پیالی پر کچھ قدرت نہیں رکھتے۔ وہ جس طرف حرکت کرے گی یہ محض اس کی اتباع کریں گے۔ اس کی مدافعت و مخالفت نہیں کر سکتے۔ جو سوال کئے جاتے ہیں واسطے اس کو نہیں جانتے اور اس کا معقول بلکہ ایک حد تک درست جواب آتا ہے بعض بعض سوال ممکن ہے کہ واسطے اور حاضرین میں سے کچھ لوگ جانتے ہوں لیکن بعض سوال ایسے بھی ہوتے ہیں جو کوئی بھی نہیں جانتا۔ سوال کرنیوالے یا محض وہ روح جو طلب کی گئی ہے جانتی ہے بعض کا خیال ہے کہ مقناطیسی قوت یا قوت نفس یا بجلی کا یہ کرشمہ ہے لیکن یہ غلط ہے اس قسم کا کوئی شائبہ بھی مجھے نظر نہیں آیا۔ یہ لوگ بجلی کی روشنی میں بیٹھتے ہیں ان واسطوں کی حسن نیت اور پرہیزگاری کا قائل ہوں۔ میں ان کو دغاباز فریبی نہیں سمجھتا۔

اب میں اس تفصیل کے بعد وہ مکالمہ درج کرتا ہوں جو میرے اور والد مرحوم کی روح کے درمیان ہوا۔ میں نے وہ حصہ اس اشاعت سے حذف کر دیا ہے جس کا تعلق میری ذات سے اور خانگی امور سے تھا۔ کیونکہ اس سے دنیا کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمام جوابات ہمیشہ سوال کے مطابق اور بالکل ٹھیک آتے ہیں۔ میں نے پیالی کو چلتے ہوئے حروف پر حرکت کر کے جملہ کلمات بناتے ہوئے خود دیکھا ہے۔ پھر میں نے والد صاحب کی روح سے اپنی خانگی زندگی اور اپنے ذاتی حالات کے سوالات کئے جن کی اشاعت میں مناسب نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد میں نے کہا۔

میں۔ (والد صاحب کی روح سے) میرے خیال میں مناسب ہے کہ میں ایک مضمون مشاہدات و مکالمات ارواح پر لکھوں کیا جناب مجھے اس ترتیب میں مدد دیں گے۔ جناب بیان

فرمایئں کہ روح جسم سے جدا ہو کر کس طرح زندہ رہتی ہے۔

والد صاحب کی روح۔ جب روح اپنے مسکن ارضی کو چھوڑتی ہے تو وہ تنہا ایک عرصہ تک زمین ہی کیطرف رہتی ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ اپنے استحقاق کے بموجب رفع و بلندی حاصل کرتی ہے۔ عموماً چھ درجے ہیں۔ ساتواں درجہ قرب باری تعالیٰ کا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں نیچے کے درجوں میں نہیں رہا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان درجوں میں راحت نہیں ہوتی۔ اور نہ ایک سیکنڈ عذاب ضمیر سے رہائی ملتی ہے۔

میں۔ آپ کس درجہ میں ہیں اور کیا آپ اس درجہ میں پہلی ہی دفعہ پہونچ گئے ہیں

وہ۔ الحمد للہ میں چھٹے درجے میں ہوں۔ اور یہ انسان کے لئے بڑی کامیابی ہے۔ یہاں نہ تو عذاب ضمیر ہے اور نہ فکر و غم ہے۔ بلکہ یہاں عمدہ پرسکون زندگی ہے۔ البتہ میں دو درجے اس درجہ میں آنے سے پہلے بھی گذار کر آیا ہوں۔

میں۔ ان درجوں میں کیا فرق ہے۔

وہ۔ جب ایک درجہ سے انسان گذر کر دوسرے درجہ میں جاتا ہے تو عذاب ضمیر میں تخفیف ہو جاتی ہے۔

میں۔ کیا آپ نے اپنے بعض دوستوں سے بھی ملاقات کی جو مر چکے ہیں۔

وہ۔ بہت سے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔

میں۔ مثلاً کون کون۔

وہ۔ نغوم (نغوم سے مراد مرحوم نغوم یک شقیر سے تھی اور دوسرے جلسہ میں ڈاکٹر یعقوب صروف و جیران خلیل جیران اور اپنے بعض خاندانی اعزا کا بھی ذکر کیا)

میں۔ کیا روحیں آپس میں گفتگو کرتی ہیں۔

وہ۔ ہاں روحیں گفتگو بھی کرتی ہیں۔ ملتی جلتی ہیں۔ آپس میں محبت کرتی ہیں۔ تعارف ہوتا ہے۔ ہم تم کو دیکھتے ہیں۔ تمہاری خوشی سے خوش اور تمہارے رنج سے رنجیدہ ہوتے ہیں۔

لیکن ہمارے رنج اور اہل دنیا کے رنج میں فرق ہے۔ وہاں کا رنج یہاں کے رنج کی طرح نہیں ہے

میں۔ آپ کو رنج کس طرح کا ہوتا ہے اور اس کا کیا اثر ہوتا ہے

وہ۔ ہمیں تمہارے رنجوں کا احساس ہوتا ہے اور اس احساس سے متاثر ہوتے ہیں۔

میں۔ کیا آپ نکالن کو بھی جانتے ہیں۔

وہ۔ ہاں۔

میں۔ جناب کو علم ہے کہ الہلال اپنے چالیسویں سال میں گذر رہا ہے۔ کیا آپ پسند کریں گے کہ الہلال کے قارئین تک آپ کا مکالمہ پہونچا دیا جائے

وہ۔ ہاں ضرور لکھو۔ میں اپنی زندگی اس کی ترقی میں گذارتا رہا ہوں اور موت کے وقت بھی مجھے خیال رہا اور اس کی ترقی کی آرزو کرتا رہا میرا جیسا کہ گمان تھا ویسے ہی حالات الہلال پر آتے رہے (یہاں کچھ جملہ معترضہ تھے، جو غالباً بعض دوستوں کے جو حاضر جلسہ تھے اذہان کا نتیجہ ہوں) پھر مجھے خطاب کرتے ہوئے روح نے کہا "امیل میری یہ تمام تحریر ایسی ہے کہ جو باپ اپنے اولاد سے کیا کرتے ہیں لیکن میری مرضی ہے کہ تم ضرور لکھو۔ مجھے الہلال پر فخر ہے اور یہ یاد رکھو کہ میری روح ہمیشہ زندہ ہے اور میں تمہارے ساتھ ہوں (اسکے بعد جو الفاظ کہے گئے ان کی اشاعت سے میں معذور ہوں)

میں۔ اپنے عالم کی کچھ معلومات سے ہمیں مستفید فرمائیے۔

وہ۔ جب انسان کی ارضی حیات ختم ہوتی ہے۔ اس وقت سے حیات سماوی شروع ہوتی ہے۔ یہ وہ حیات ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ حیات یا تو جنت کی مستحق ہوتی ہے یا جہنم کی۔ یہ ان اعمال پر منحصر ہے جو دنیا میں کئے گئے ہیں۔ یہ یاد رکھو کہ روح موجود ہے، عذاب ان لوگوں پر زیادہ تر ہوتا ہے جو حیات ابد کے قائل ہیں۔ روحیں اپنے دوستوں کو اعمال

وافعال سے باخبر بھی رہتی ہیں۔

دوسرا جلسہ

میں ۔ پہلی مرتبہ جب جناب نے تکلیف فرما کر معلومات فراہم کئے تھے۔ وہ میں نے قلمبند کئے ہیں کیا جناب براہ کرم اس مضمون کو مکمل فرمائیں گے۔

وہ۔ قارئین کرام کو تعجب ہوگا جب وہ میرا نام جرجی زیدان دیکھیں گے۔ لیکن میں ان کے تعجب کو رفع بھی کر دینا چاہتا ہوں۔ قارئین کرام یاد رکھیں۔ میں جرجی زیدان ہوں میں تم کو تاکید سے کہتا ہوں کہ روح جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی زندہ ہے۔ میرے پاس اس کے بہت کافی دلائل ہیں۔ لیکن یہ دلائل صرف ان ہی کو فائدہ دے سکتے ہیں جو ان کو سنیں اور سمجھیں۔ میں تم کو وہ امور یاد دلاتا ہوں جو بالکل بھلا دیئے گئے ہیں یہی خواہش کرتا ہوں کہ تم کو روح کی آیندہ زندگی کا یقین ہو جائے اور یہ ہوش آجائے کہ جس قدر اعمال دنیا میں کئے گئے ہیں بلا کم وبیش سب کا نتیجہ دوسری دنیا میں ملنے والا ہے۔

عذاب ومصائب ان ہی لوگوں پر ہوتے ہیں جو حیات ابد کے قائل نہیں ہیں قارئین الہلال شاید ان سے فائدہ اٹھائیں۔

میں ۔ روحیں مختلف لوگوں سے جبکہ ان کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں کس طرح گفتگو کرتی اور ایک دوسرے کی بات کس طرح سمجھتی ہیں

وہ۔ آپس میں سب ایک دوسرے کے مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ بات زبان سے نہیں کی جاتی بلکہ انتقال فکر سے ایک دوسرے کا مفہوم ایک دوسرے کو معلوم ہو جاتا ہے۔

میں۔ کیا مرد وعورت کی شناخت بھی روحوں میں ہوتی ہے۔

وہ۔ بیشک بلکہ جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ بھی قائم رہتی ہیں۔

میں۔ دنیا میں جو مختلف مذاہب ہیں ان کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔

وہ۔ مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اپنے اپنے اعمال کی سزا سبھی کو بھگتنا ہوتی ہے

میں۔ کوئی مذہب سب سے زیادہ اچھا اور سچا سمجھا گیا ہے۔

وہ۔ تمام مذاہب جو خدا کے قائل ہیں ایک ہیں۔

میں۔ لو فرضاً اگر انسان خدا کا قائل نہ ہو۔ بلکہ خدا کا منکر ہو تو۔

وہ۔ اللہ واحد کا اعتقاد تو ضروری ہے۔

میں۔ اگر اس کی عقل اس کو خدا کے وجود کا قائل کر دے لیکن اعتماد کلی نہ ہو۔

وہ۔ تو کیا پھر قائل ہونے کے بعد کہیں اعتقاد ضائع ہو جایا کرتا ہے۔

میں۔ اور بت کے پجاری۔

وہ۔ ہلاک ہوتے ہیں۔ (یعنی عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔)

میں۔ فرض کیجیے کہ انھوں نے کبھی خدا کی بابت کہیں کچھ نہیں سنا۔

وہ۔ سزا تو اس کو ہوگی لیکن اس کا انتقال ترقی کیطرف جلد شروع ہو جائیگا۔

میں۔ کیا آپ خالق کے اوصاف بیان کر سکتے ہیں۔

وہ۔ آجتک کسی نے اس کو نہیں دیکھا۔

میں۔ کیا کبھی امید زیارت ہے۔

وہ۔ یقینی اور وعدہ بھی ہے۔

میں۔ کیا آپ کو مستقبل کی بابت بھی کچھ معلومات ہوتی ہے۔

وہ۔ ہم اس کی بابت کچھ کہہ نہیں سکتے۔

میں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کو کچھ معلومات ہے یا نہیں۔

وہ۔ کچھ معلومات ہے سب ممکن نہیں لیکن ہم کچھ بھی اس کی بابت بیان نہیں کر سکتے۔

میں۔ کیوں؟

وہ۔ ہمیں حکم نہیں ہے۔

میں۔ کیا حیوانات کی بھی روحیں ہوتی ہیں۔

وہ ۔ بیشک روحیں ہوتی ہیں لیکن ان کا کوئی مقام مقرر نہیں ہے ۔

میں ۔ پھر وہ کہاں چلے جاتے ہیں ۔

وہ ۔ فضائے بسیط میں منتشر ہو جاتے ہیں نہ پھر ہم ان کو دیکھتے ہیں نہ ہمیں ان کی نسبت کوئی علم ہوتا ہے ۔

میں ۔ کیا آپ کا کوئی مقررہ مرکز ہے ۔

وہ ۔ ہے لیکن ہمیں علم نہیں وہ کہاں ہے اور اس زمین سے کس قدر فاصلہ پر ہے لیکن ہے بہت فاصلہ پر ۔

میں ۔ کیا میرے علاوہ کسی نے آپ کو دنیا میں طلب کر کے کچھ معلومات کی ہے ۔

وہ ۔ نہیں تم ہی پہلے شخص ہو جس نے مجھے بلایا ۔ مدت تک ہمیں گفتگو کرنے کی قابلیت نہیں رہتی اب مجھے عالم ارواح میں واپس ہونا چاہیئے ۔

یہ مختصر نمونہ اس گفتگو کا ہے جو مجھ سے اور والد صاحب مرحوم کی روح سے ہوئی ۔ میں نے تفصیلات کچھ چھوڑ کر صرف مختصر حالات اس مضمون میں درج کئے ہیں اور قارئین کرام کے لئے یہ بحث چھوڑتا ہوں کہ وہ خود غور و فکر سے کام لیں اور سمجھ لیں کہ اس کی کوئی اصلیت حقیقت میں ہے یا نہیں ۔ میرا خیال تھا کہ میں ان لوگوں کا نام بھی ظاہر کر دوں جو ان امور کو صحیح اور یقینی تصور کرتے ہیں لیکن ابھی تک میں خود انکو ایسا یقینی نہیں سمجھتا جیسا دیگر علوم کے نظریات یقینی سمجھے جاتے ہیں ۔ اس لئے میں ان کے نام بھی ظاہر نہیں کروں گا ۔ میں نے یہ بھی معلوم کیا کہ بعض ارواح اپنے مکالمات میں کچھ غلطیاں بھی کرتی ہیں ۔ کچھ بھول بھی جاتی ہیں تاہم جن لوگوں کو ان امور سے دلچسپی ہو ان کو چاہیئے کہ وہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں ممکن ہو کہ ہم کسی خاص نتیجہ پر جو آیندہ دنیا کے لئے مفید ہو پہونچ سکیں ۔ تمام ترقیات اسی اصول پر ہوتی رہتی ہیں ۔

اس کے بعد بھی اگر ایسے امور پیش آئے اور کہیں مکالمہ کا مجھے شرف حاصل ہوا تو میں ناظرین کی خدمت میں پیش کر سکوں گا ۔

"غریب خانے" میں

ابھی رات زیادہ نہیں آئی تھی، لیکن فضا تیرہ و تار ہو رہی تھی، بادل چھائے ہوئے تھے، ستارے چادر ابر میں روپوش تھے، زور شور کی بارش ہو رہی تھی، بیچارے محمود کا "غریب خانہ" بھی، جب تک چراغ مشعل راہ نہ ہو، نظر نہیں آسکتا تھا۔

محمود کی جھونپڑی میں بھی کچھ نظر نہیں آتا، ہاں ایک چراغ تھا جو بیچارا اپنی بساط کے موافق اس تاریکی سے جہاد کر رہا تھا، ایک انگیٹھی تھی، جس کی آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی، صرف چند چنگاریاں باقی رہ گئی تھیں جو عنقریب افسردہ ہونیوالی تھیں۔

اس تاریکی میں چند جھروکے اس طرح چمک رہے تھے جیسے شب تار میں بیڑیوں کی آنکھیں اوہر اُدھر دیکھنے سے ایک فرش نظر آتا تھا، جس پر تین بچے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے دراز تھے۔ پاس ہی ایک عورت بیٹھی تھی، جس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا، دل ہی دل میں زبان حال سے وہ دعا مانگ رہی تھی کہ اس کا شوہر بخیر و عافیت واپس آجائے۔ کیونکہ حسب عادت آج بھی وہ شکار کے لئے گیا تھا اور اب تک واپس نہیں آیا تھا۔

بارش اب اور تیزی سے ہونے لگی، ہوا بھی بہت تیز چلنے لگی۔ جس کے اثر سے جھونپڑی بھی لرزہ براندام ہو رہی تھی، بچے چادر میں سکڑے پڑے تھے، لیکن اس عورت کا دل خوف سے کانپ رہا تھا، اس نے خیال کیا کہ بارش کا یہ تسلسل، بجلی کی یہ کڑک، ہوا کی یہ سنسناہٹ چھتوں اور دیواروں کا دھڑا دھڑ گرنا۔ کوئی اچھی علامت نہیں ہے، اپنے شوہر کے متعلق اس کے دل میں طرح طرح کے شکوک واوہام کا ایک دریا لہریں مارنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں خیال کرنے لگی کہ میں ایک غریب اور دکھیا عورت ہوں، میرا نہ کوئی والی ہے نہ وارث، یہ چھوٹے چھوٹے بچے ابھی اس قابل بھی تو نہیں ہیں کہ اپنی روزی کما سکیں،

اپنا پیٹ پال سکیں، زمانہ کا سرد گرم برداشت کر سکیں۔ اے اللہ، تو مجھ ضعیف وناتواں کے لئے اور ان معصوم بچوں کے لئے اسے بچالے، جو تیری سپردگی میں ہے۔ جو اپنی زندگی تجھے سونپ کر رزق کی تلاش میں نکلا ہے تاکہ اس چھوٹے موٹے خاندان کا کچھ انتظام کرنے .... اب تک وہ واپس نہیں آیا، نہ معلوم قسمت اس کے ساتھ کیا کرنے والی ہے، اور کسے معلوم کہ کیا کر چکی ہے؟ .... ہم شکاریوں کے بال بچوں کی زندگی کتنی المناک اور کس قدر اندوہ افزا ہوتی ہے، وہ ہمیں تنہا چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں، اور دکھ کے اس اتھاہ ساگر میں ہاتھ پیر مارنے لگتے ہیں جس کی نہ کوئی حد ہے نہ پایاں، اور نہ اس کے خطرات و مہالک سے نجات کی کوئی صورت، اسی کمبخت روزی کی تلاش میں وہ ان اٹھتی ہوئی موجوں کا مقابلہ کرتے ہیں، جو بھوکے بھیڑیئے کی طرح جھپٹتی ہیں، جیسے وہ گوشت کے ٹکڑے پر جھپٹتا ہے، .... اور ہم جو قسمت سے ڈر رہے ہیں کہ جانے کیا ہو؟ تو کہیں کچھ ہو نہ چکا ہو؟ کیا قسمت سے لکڑی کے چند وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بچا لینگے جنھیں چپو کہتے ہیں؟ تھوڑی دیر تک موجوں کے ساتھ کشمکش ہوگی اور آخر کار وہ بے حد و نہایت غار میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گر جائیں گے۔ تاکہ مچھلیوں کا شکار بنیں۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ خود مچھلیوں کی تاک میں تھے۔

اب بارش ذرا کم ہو گئی تھی، ہوا بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، وہ عورت چراغ اٹھا کے دروازے کے سامنے دیکھنے لگی کہ اب صبح ہونے میں کتنی دیر باقی ہے؟ لیکن تاریکی پورے طور سے مسلط تھی، اور بارش بھی کچھ نہ کچھ ہو رہی تھی۔ چراغ کی روشنی ایک اور جھونپڑی پر پڑی، جس میں نہ روشنی تھی نہ حرکت، اسے یاد آگیا کہ یہ غریب جمیلہ کی جھونپڑی ہے جس کا شوہر چند مہینے ہوئے، ڈوب کر مر گیا تھا، اور زمانہ کے شدائد و مصائب برداشت کرنے کے لئے دو بچے چھوڑ گیا تھا، اس کے جی میں آیا کہ لاؤ ذرا جمیلہ کی خبر لے آؤں؟ اس لئے

کہ اسے علم تھا کہ جمیلہ مرض الموت میں مبتلا ہے، وہاں پہونچکر جب اس نے دروازہ کھٹکھٹایا، تو کوئی جواب نہ پاکر خود اس نے دھکا دیکے دروازہ کھول لیا، اپنے چراغ سے وہ پاس کی چیزیں دیکھ سکتی تھی، اپنے سامنے اسنے جو کچھ دیکھا اس سے اس کا دل دھڑکنے لگا، خون خشک ہوگیا، اور وہ سرتا بہ قدم کانپنے لگی۔

اس نے دیکھا کہ جھونپڑی ہوا کی شدت سے ہل رہی ہے، اور بارش کے پانی نے اندر داخل ہوکر تمام چیزوں کو تر کردیا ہے جمیلہ بالکل ساکت وصامت فرش پر دراز ہے، جب اس نے پاس سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا تو کام تمام ہوچکا ہے، پانی کے قطرے اس کے سر سے اور رسا تھے سے ٹپک رہے ہیں، پہلے تو چپ چاپ وہ یہ دلدوز منظر دیکھا کی، ایک بارگی یک وہ چیخ اٹھی۔

"خدا کی اس زمین پر یہ ہے غریبوں اور بیکسوں، مسکینوں اور لاوارثوں کا عالم! یہ ہے وہ مرتبہ رفیع جہاں وہ زندگی بھر شدائد ونوائب اور مہالک ومصائب کا مقابلہ کرکے پہونچتے ہیں، اس کارزار عالم میں وہ مجہول ومطرود زندگی بسر کرتے ہیں، نہ ان کا کوئی شناسا ہوتا ہے، نہ واقف کار، نہ نوحہ خواں ہوتا ہے نہ تیمار دار۔ اب وہ ایسی جگہ جارہے ہیں، جہاں نہ کوئی "ہم سخن" ہے نہ "ہم نشین"، نہ ان کے جانے کا کسی کو ملال ہے نہ قلق حتٰی کہ اعزہ واقربا بھی بے پروا ہیں۔

کیا عجب ہے کہ میرا اور میری اولاد کا بھی کل یہی حشر ہو جو آج میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں؟ اسوقت تو کوئی ایسا بھی نہ ہوگا جو اس حال زار پر چند آنسو بہالے۔ جس طرح ان مسکینوں کے لئے میں ماتم کناں ہوں کل میرا ماتم کرنے والا تو کوئی بھی نہیں"۔

پھر اس نے اپنی چادر جمیلہ کی لاش پر ڈال دی، اور چراغ لے کے ادھر ادھر جو دیکھا تو بچے فرش خاک پر آسودۂ خواب نظر آئے، ایک کے منہ پر ایک کا منہ تھا، اور ایک معصومانہ تبسم ان کے ابرو پر کھیل رہا تھا، گویا وہ موت سے جو ان کے چاروں طرف منڈلا رہی تھی بالکل

بے پرواتھے۔ اس نے بچوں کے سر پر جمیلہ کی چادر دیکھی، اسے خیال ہوا کہ گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے اس مسکین عورت نے اپنے مرض الموت میں دیکھا ہوگا کہ پانی ٹپ ٹپ ٹپک رہا ہے، بچوں کے اعضا جکڑ رہے ہیں تو اس نے مہر مادری سے مجبور ہو کر بچوں کے جسم پر یہ چادر ڈالدی ہوگی حالانکہ سب سے زیادہ وہ خود اس چادر کی حاجتمند تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تاب نہ لاسکی، اور جاں بحق ہوگئی۔

محمود کی بیوی اس ہیبت ناک اور دلدوز منظر کو دیکھنے لگی، ہوا اس وقت بھی چل رہی تھی، بارش اس وقت بھی ہو رہی تھی، اور پانی کے قطرات جمیلہ کے ماتھے سے گالوں پر اس وقت بھی ڈھلک کر آرہے تھے، گویا اپنے بچوں کے فراق میں وہ آنسو بہا رہی تھی، اب آثار صبح ظاہر ہونے لگے تھے، جب کچھ کچھ روشنی آنے لگی تو اس نے چراغ بجھا کر یک کونے میں رکھدیا میت کے لئے دعا مانگی، پھر بچوں کی جانب بڑھی، ان پر وہ روئی اور ن دونوں کو نہایت رفق وسکون سے اپنی گود میں اٹھالیا، اور اپنی جھونپڑی میں لے گئی پنے بچوں کے ساتھ انھیں بھی لٹادیا، اور سب پر ایک ہی چادر ڈالدی،

اس کام سے فارغ ہو کے وہ ایک جانب بیٹھ گئی، اور دل ہی دل میں کہنے لگی، نہ معلوم ں نے ان بچوں کو لاکر کوئی اچھا کام انجام دیا ہے، یا بُرا، میں جانتی ہوں کہ اللہ نے رت کا دل بحیثیت شفقت و محبت سے بنایا ہے، وہ اسے نہیں برداشت کرسکتی کہ اس کے امنے دو معصوم بچے ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں فرش خاک پر دراز ہوں، وہاں سوا ان ، ماں کی نعش کے ان کا کوئی رفیق نہ ہو، کوئی عورت اس حال میں تن تنہا انھیں نہیں چھوڑ سکتی ی کرتی جو میں نے کیا ہے، بغیر اسے معلوم کئے کہ اس کارروائی کا اس کی ذات پر کیا اثر ہوگا، پھر جبکہ وہ یہ بھی جانتی ہو کہ اس کس مپرسی میں چھوڑ جانے کا انجام کیا ہوگا؟

یہ منظر جو میں نے دیکھا ہے اس نے مجھے عواقب و نتائج سے بے نیاز کردیا ہے، اگرچہ کچھ عرصہ

کے بعد مجھ پر یہ واضح ہو گیا کہ میں نے غلطی کی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ اس غلطی سے میں بچ بھی سکتی تھی، میں اس کی مرتکب ہوئی، کیونکہ میرا دل گوشت اور خون کا ہے، فولاد اور پتھر کا نہیں،

میں جانتی ہوں کہ میرا شوہر نادار ہے، قلاش ہے، فاقہ مست ہے، اور میرے بچے خود نان شبینہ کے محتاج ہیں، اب اس فقر و فاقہ کے عالم میں اپنے بچوں پران دو جدید بچوں کا اضافہ کسی طرح بھی مناسب نہیں، لیکن یہ بھی کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم اپنے راحت نفس کے مقابلہ میں ان سے بخل کریں اور ان ننھے بچوں کو اپنے سامنے بھوک اور سردی کی وجہ سے مرنے دیں۔

یہ ہیں میرے خیالات جنھیں ابھی ابھی اپنے شوہر کی واپسی پر میں اس کے سامنے دہراؤنگی اپنے اس فعل پر نہ میں متوحش ہوں نہ خوف زدہ، کہ وہ مجھ پر خفا ہوگا، یا مجھے حکم دے گا کہ میں انہیں نکال باہر کروں۔

یہ کہتے کہتے وہ دفعتًا رک گئی، کیونکہ دروازہ پر کھٹکھٹانے کی آواز آئی، اس سے وہ خوف زدہ ہو گئی، لیکن معلوم ہوا کہ یہ ہوا کی سنسناہٹ تھی، تھوڑی دیر تک وہ اپنا سر جھکائے رہی، سر جھکائے ہوئے، وہ عالم خیال میں پہونچ گئی، اس بزم تخیل میں ایسے ایسے مناظر اس کے سامنے آئے کہ کبھی وہ رونے لگتی، کبھی ہنسنے لگتی، کبھی غضبناک ہو جاتی، اور کبھی مطمئن کبھی اس کا چہرہ کسی امید سے دمکنے لگتا، کبھی مایوسی کی شکنیں اس کے ماتھے پر پڑ جاتیں، کبھی اپنے شوہر کے متعلق اچھے اچھے خیالات اس کے دل میں موجزن ہوتے، کبھی طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو جاتے، غرض اسی امید و بیم اور اسی کشمکش آلام و افکار میں اس کا دل ہچکولے کھا رہا تھا کہ اتنے میں اس نے کوئی سیاہ سی چیز اپنے سامنے آتے ہوئے دیکھی، اس کا دل خوف اور وہم سے زور زور سے دھڑکنے لگا، لیکن وہ دیکھتی کیا ہے کہ اس کا شوہر کاندھے پر جال ڈالے، پیٹھ پر اس کی چھتر رکھے چلا آ رہا ہے، اور پانی اس سے ٹپک رہا ہے، اپنے شوہر محمود کو دیکھ کر وہ

کھڑی ہوگئی، اس نے اس کے چہرہ پر ایک نظر ڈالی، کچھ سمجھ کر آنکھیں جھکا لیں، پھر وہ پوچھنے لگی، "رات کیسی گذری"؟ محمود نے اپنا جال اور اس کی چھڑ ایک طرف رکھ کے کہنا شروع کیا،

"ایسی رات! تو بہ میں نے تو آج تک ایسی رات دیکھی ہی نہیں، اور شکار کو کیا پوچھتی ہو؟ یہی خالی ہاتھ آیا ہوں، اگر خدا کا مجھ پر اور تم پر فضل نہ ہوتا تو میرے ہلاک ہونے میں رہ کیا گیا تھا لیکن غم مجھ پر اس وقت تک قابو نہیں پا سکتا جب تک میں تم لوگوں کو بخیر و عافیت پاتا ہوں، بچوں کا کیا حال ہے"؟

یہ سنکر وہ کانپنے لگی اور ٹالنے کے طور پر جواب دیا "اچھے ہیں"۔

محمود۔ "آج کیا بات ہے کہ میں تمہیں اس قدر آشفتہ خاطر اور مضمحل دیکھ رہا ہوں، اچھا رات کیسی گذری"؟

اس نے اپنا سر جھکا لیا اور کہا

"رات کو تو ان بچوں کی تمصیں سیتی رہی، اس طوفان ابر و باد کی کڑک اور گرج جب سنتی تھی تو تمہاری طرف سے قسم قسم کے وہم آنے لگتے تھے، لیکن اب تو الحمدللہ کچھ نہیں ہے، اچھی ہوں"۔

یہ کہہ کے اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا، کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن کہہ نہ سکتی تھی، الفاظ ہونٹ پر آ آکے رہ جاتے تھے، آخر بہت کوشش کے بعد وہ کچھ کامیاب ہوئی، اور کہنے لگی،

"لیکن ایک دوسری بات ہے جس نے مجھے مضطر کر رکھا ہے"۔

"وہ کیا"؟

"تمہارے آنے سے کچھ پیشتر ہماری پڑوسن جمیلہ کا انتقال ہوگیا، اپنے پیچھے وہ دو بچے چھوڑ گئی ہے جن کا اس عالم میں نہ کوئی پرسان ہے نہ خبر گیر"۔

یہ سنتے ہی محمود پر ایک اضطراب و اضطرار کی کیفیت طاری ہوگئی، وہ اپنی جگہ سے

اٹھ کھڑا ہوا، پھر اس نے اپنی بھیگی ہوئی ٹوپی بستر پر ڈال دی، سر پر کبھی کبھی ہاتھ پھیرتا کبھی بالوں سے شغل کرنے لگتا، اس کی بیوی اس پر نظر جمائے اس کے خیالات وجذبات کا اندازہ کر رہی تھی آخر وہ فرش پر بیٹھ گیا جو جھونپڑی کے وسط میں بچھا ہوا تھا، اور آہستہ آہستہ کہنے لگا،

خدایا! اگرچہ میں علم سے بے بہرہ ہوں، جاہل ہوں، میرا یہ منصب نہیں کہ میں تیری حکمتوں کو سمجھ سکوں، اور یہ جان سکوں کہ یہ غریب بچے اپنی ماں جیسی نعمت سے کیوں محروم کر دیئے گئے؛ لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس واقعہ کے وجود سے انکار کروں، شاید وہ لوگ جو مجھ سے زیادہ علم وبصیرت رکھتے ہیں، تیری ان مصلحتوں اور حکمتوں کو اس سے زیادہ سمجھ سکیں، جتنا میں سمجھ سکتا ہوں،

بلا شبہ میں تہی دست ونادار ہوں، بے نوا اور بے مایہ ہوں، مفلس اور فقیر ہوں، میری زندگی مصادفات واتفاقات کی رہین منت ہے، اگر مل گئی تو روزی ورنہ روزہ۔ مجھ پر اور میرے بچوں پر ایسے کڑے دن گذرتے ہیں کہ ہمیں قوت لایموت بھی میسر نہیں آتا ہے لیکن میں اپنے دل کو کیا کروں، وہ ان یتیموں پر اس سے زیادہ کڑھتا ہے جتنا فقر وفاقہ کے عالم میں وہ دکھ محسوس کرتا ہے،

پھر وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا اور کہا،

"میں سخت متاثر ہوں، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمیلہ کی روح کھڑی دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے، اور ہم سے بالحاح وزاری کہہ رہی ہے کہ ہم اس کے بچوں کی سرپرستی کریں ان کفالت کریں......... لیکن میرے اللہ یہ ممکن کیونکر ہے؟ میں کروں تو کیا کروں؟

اب گویا اس کی بیوی کو ایک موقع مل گیا، اس نے کہا،

"اور مجھے تو ایسا سنائی دیتا ہے کہ وہ کہہ رہی ہے، محمود! میری مصیبت تمہاری مصیبت سے زیادہ ہے، تم اس عالم میں ہو کہ کچھ نہ کچھ کر سکتے ہو، میں اس دنیا میں ہوں کہ میرے کئے کچھ بھی نہیں ہو سکتا،

تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہا، بیٹھے بیٹھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، پھر اس نے کہا،

"کیا گذشتہ سال ہمارے دو بچے نذرِ اجل نہیں ہو چکے ہیں"؟

"کیوں نہیں"۔

"اگر آج وہ دونوں زندہ ہوتے تو ہم کیا کرتے"؟

"سوا اس کے کہ ہم اپنا معاملہ خدا کو سونپ دیتے، اور اس سے استعانت چاہتے، اور کیا کر سکتے تھے"؟

تو ہم ان دونوں یتیموں کا معاملہ بھی خدا کو سونپتے ہیں، اور اسی سے استعانت چاہتے ہیں، ہم یہ سمجھ لیں گے کہ ہمارے وہ دونوں بچے زندہ ہیں، یا یہ جان لیں گے کہ خدا نے انہیں از سرِ نو زندہ کر دیا ہے............... جاؤ ان بچوں کے پاس جاؤ اور انھیں یہاں لے آؤ، ممکن ہے وہ بچے جاگ گئے ہوں، اور اپنی ماں کا یہ حادثہ دیکھ کر خوف و دہشت سے وہ بیچارے بھی ختم ہو جائیں،

دیکھو! انھیں رفق و محبت سے لانا، اس طرح لانا کہ وہ جاگنے نہ پائیں، اور یہاں لا کر اپنے بچوں کے پاس لٹا دو، وہ منظر بھی کتنا عجیب و غریب ہوگا جب وہ بیدار ہوں گے اور ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھے گا.............. آج سے میرے اوپر نبیذ[1] اور وشت حرام ہے، جب تک میں اس خاندان کے کھانے پینے کا انتظام نہ کر لوں جس کا بخت و اتفاق سے میں ہی سردار ہوں، اللہ نے چاہا تو ان پاک اور معصوم بچوں کے طفیل ہمارا گھر روٹی اور چربی سے بھر جائے گا، ہم کھاتے کھاتے تھک جائیں گے، لیکن "سامان بس" ختم نہیں ہوگا"۔

[1] احناف کے ہاں علماء عراق نے نبیذ کی حلت کا فتویٰ دیا ہے، اس لئے کہ اس کا نشہ ایسا نہیں ہوتا کہ آدمی کو بے خود دے، بلکہ زیادہ سے زیادہ خمار پیدا کرتا ہے۔ مترجم

یہ سنکر جمیلہ کا چہرہ وفور مسرت سے جگمگانے لگا، وہ بچوں کی خوابگاہ کی طرف گئی، بچوں کے چہرے سے چادر اٹھائی، اور چپ چاپ محمود کی طرف دیکھنے لگی،

محمود نے جو یہ دیکھا کہ بچے تو یہاں پہلے ہی سے موجود ہیں، تو ہجوم مسرت اور فرط محبت سے اس نے جمیلہ کو گلے لگالیا، اور کہا "تمہارا دل کتنا بلند، کتنا ارفع، اور کتنا اعلیٰ ہے، تم تو اس قابل ہو کہ تمہاری پرستش کی جائے"

جمیلہ نے یہ سنا، اور محبت بھری نظروں سے محمود کو دیکھنے لگی،

قرآن حکیم سے موجودہ مسلمانوں کا برتاؤ

(جناب شوق دہلوی از مکہ معظمہ)

کچھ اسے زینت منزل سمجھو — اور کچھ گرمیٔ محفل سمجھے
کچھ تو سمجھے ہیں اسے طب کی کتاب — اور کچھ جادوِ بابل سمجھے
کچھ اسے رٹتے ہیں طوطی کی طرح — اس کا بس وہی حاصل سمجھے
یہ تو آیا تھا ہدایت کے لئے — اس کا مقصد ہی نہ غافل سمجھے
اب عمل اور کتابوں پر ہے — اس کو سب ترک کے قابل سمجھے
کاسہ لیسان حریفان حق — اس کی تعلیم کو باطل سمجھے
منطق و فلسفہ کے سودائی — درس کے اس کو نہ قابل سمجھے
عقل پہ جن کی پڑے ہیں پتھر — فہم کو اس کے وہ مشکل سمجھے
ہائے اس نعمت عظمیٰ کی قدر — خاک بھی تو نہ یہ جاہل سمجھے

+

اے خدا ہم کو عطا کر وہ دل — جو اسے رہبر کامل سمجھے
اور دے شوق عمل بھی ایسا — کسی مشکل کو نہ مشکل سمجھے

تنقید و تبصرہ

کتب

مبادی فلسفہ حصہ اوّل یا فلسفہ کی پہلی کتاب ۔ اشارات تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن ۔ کتاب التوحید ۔ نبیوں کے قصے

مبادی فلسفہ حصہ اول یا فلسفہ کی پہلی کتاب | از مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی۔ تقطیع چھوٹی، حجم ۱۰۵ صفحہ لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ نفیس مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، قیمت درج نہیں۔

فاضل مصنف کے فلسفیانہ مقالات کا یہ مجموعہ ایک دیباچے اور چھ مضامین پر مشتمل ہے جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں:-

(۱) فلسفہ و مذاہب فلسفہ پر ایک نظر۔

(۲) مِل کی منطق۔

(۳) مقدمہ مکالمات برکلے۔

(۴) عادت و فلسفہ عادت۔

(۵) نفس و مفردات نفس۔

(۶) ماہیت جذبات۔

اردو زبان ابھی تک فلسفیانہ مباحث سے خصوصاً فلسفۂ جدید سے بالکل غیر مانوس ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی بدولت چند کتابوں کا ترجمہ تو اردو میں ہوگیا ہے مگر مستقل تصنیف کا حوصلہ سوائے مولوی عبدالماجد صاحب کے اور کسی کو نہیں ہوا۔ اسے فلسفے کی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے کہ اسے اردو دانوں سے روشناس کرنے کے لئے ایسا شخص ملا جس کا قلم الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں، خشک مضامین کو دلچسپ بنانے میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ اس سے یہ امید ہوتی ہے کہ لوگ جنھیں فلسفے کے نام سے وحشت ہوتی تھی اب اس سے مانوس ہوجائیں گے۔ یہ مجموعۂ مضامین، جو ہمارے مشہور فلسفے سے رسم تعارف کا کام تو نہیں دے سکتا لیکن

پڑھنے والوں کے دل کو بے ساختہ اس موضوع کی طرف مائل کر دیتا ہے اور یہی طلب علم کی سب سے پہلی اور سب سے اہم منزل ہے۔

اس لحاظ سے یہ کتاب طالب علموں کے لئے جن میں صرف مدارس کے متعلمین ہی نہیں بلکہ کل علم دوست حضرات شامل ہیں بے حد مفید ثابت ہوگی۔

اشارات | مصنفہ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی بالقابہ۔ تقطیع کلاں، تعداد صفحات ۱۳۶، کاغذ چکنا دبیز، لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ درجے کی، مجلد، خوبصورت۔ قیمت صرف ۱۲/
ملنے کا پتہ :۔ ناظم دفتر تذکرہ، کٹرہ شیر سنگھ، امرت سر (پنجاب)۔

آج سے سات سال پہلے رسالہ جامعہ میں علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کی مشہور کتاب "تذکرہ" پر تنقید لکھی گئی تھی۔ اس طویل خاموشی کے بعد اب انھوں نے یہ اپنی عملی کتاب "اشارات" شائع کی ہے، جس میں مسلمانوں کی اصلاح نفس کے لئے خدمت خلق کی تجویز اور اس کا طریقہ بیان کیا ہے اور ہر مسلمان کو یہ صلاح دی ہے کہ وہ بطور علامت خدمت بیلچہ یعنی کدال اپنے پاس رکھے۔ پھر ہر بستی کے مسلمان شام کے وقت ڈیڑھ دو گھنٹے کے لئے اپنے اپنے منتخب سرداروں کی قیادت میں خاکی لباس پہن کر اور بیلچہ لے کر باقاعدہ قواعد کریں۔ پھر بلا امتیاز مذہب و ملت ہر شخص کی جس قدر ہو سکے خدمت بجا لائیں اور غروب کے بعد سب ایک ساتھ باجماعت مغرب کی نماز ادا کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔

اس تحریک کا نام انھوں نے تحریک خاکساران رکھا ہے اور غالباً منجملہ دیگر وجوہات کے ایک وجہ خاکی لباس اختیار کرانے کی یہ بھی ہے کہ خاکساری اس کے اندر مضمر ہے۔

اشارات میں علامہ موصوف نے اس تحریک کا مغز اور لب لباب تفصیل کے ساتھ نہایت بلند نظری اور خوبی سے سمجھایا ہے جس سے ہر شخص اس یقین پر پہونچ سکتا ہے کہ یہ عملی تحریک مسلمانوں کی اصلاح اور ان کو منظم اور کارکن جماعت بنانے کے لئے کس قدر صحیح اور بروقت ہے۔ اس میں نہ کسی مذہب پر خاش ہے نہ کسی قوم سے عداوت ہے، نہ حکومت سے نزاع ہے نہ سیاسی شائبہ ہے بلکہ خالص اصلاحی اور اخلاقی تحریک ہے جس میں ہر مسلمان بلا کسی پس و پیش کے حصہ لے سکتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے علامہ موصوف [illegible]

ہو جانا چاہیئے۔ ان کو یقین ہے کہ اگر مسلمانوں نے عام طور پر اس تحریک میں عملی حصہ لیا تو پانچ سال کے اندر اندر ان کو حکومت اور سلطنت مل جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند ایک مدت سے بے عمل اور غافل ہیں اور اجتماعی اعمال اور مشاغل جو کچھ کر بھی رہے ہیں وہ عدم مرکزیت کے باعث غیر صالح ہیں جن سے کسی اچھے نتیجے کی امید نہیں ہے۔ یہ دانشمندانہ تحریک جس میں کسی طرف سے رکاوٹ کا اندیشہ نہیں ہے اگر چل گئی تو ساری ملت کو ایک مرکز پر لا کر متحد کر سکتی ہے جس سے توقع ہے کہ ہماری اجتماعی قوت درست ہو جائے گی۔

یہ کتاب ہر صاحب نظر اور دردمند مسلمان کو ضرور پڑھنی چاہیئے جس کی قیمت اسی وجہ سے اس قدر کم رکھی گئی ہے کہ اس کے صرفے سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس کے مطالعے سے واضح ہو جائے گا کہ اس تحریک کی بنیاد عقل، اخلاق اور خالص دین پر ہے نہ کہ کسی ہنگامی یا نفرت یا عداوت کے جذبے پر۔ اگر یہ تحریک مسلمانوں نے قبول کر لی تو کچھ بعید نہیں کہ اس کے نتائج وہی ہوں جو مصنف نے لکھے ہیں۔

تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن | مصنفہ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری سردار جماعت اہل حدیث، بزبان عربی، تقطیع کلاں، صفحات ۴۰۲، قیمت چار روپیئے۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر اخبار اہل حدیث۔ امرتسر۔

عربی زبان میں سینکڑوں تفسیریں کلام الٰہی کی لکھی گئی ہیں لیکن ہر ایک میں انسانی تفسیر ہے یعنی آیات کے مطالب جو ائمہ اور بزرگانِ دین نے سمجھے یا جو رسول پاک سے روایت کیے گئے (جو اکثر حالتوں میں صحیح نہیں ہیں) مندرج ہیں۔ مولانا ثناء اللہ صاحب نے اس تفسیر میں کوشش کی ہے کہ آیات کے مطالب خود قرآن کی آیات سے حل کیے جائیں۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ راہ بالکل اچھوتی ہے جس پر مولانا سے پہلے کوئی دوسرا نہیں چلا تھا۔ اس لئے ان کو اس میں جو دشواریاں اٹھانی پڑی ہیں ان کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا۔ ایک معتد بہ حصہ ہم نے اس تفسیر کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ مصنف نے کس مشکل سے اپنا راستہ آپ نکالا ہے۔ یہ اس قسم کی پہلی کوشش ہے جس میں اس سے زیادہ کامیابی حاصل کرنی مشکل تھی۔ ہاں اب راستہ نکل گیا ہے اس لئے آئندہ آنے والے اس قسم کے مفسر کے لئے آسانیاں ہو گئی ہیں کہ وہ اس داغ بیل پر خوشنما عمارت کھڑی کر سکے۔

[illegible] یہ [illegible] ہے کہ اس تفسیر [illegible] مولانا ہی کی جماعت [illegible] کے گروہ سلف پرست حضرات نے طوفان برپا

کو دیا اور چالیس اعتراض کر کے جو اکثر بزرگوں کے اقوال پر مبنی تھے اربعین نامی رسالے میں شائع کیا یہاں تک کہ اس کا جھگڑا سلطان نجد و علمائے وہابیہ تک پہونچا اور وہاں طے ہوا۔ چنانچہ وہ فیصلہ اس تفسیر کے آغاز میں شامل ہے۔ ۱۳۴۵ھ میں ہمارے سامنے بھی سلطان کی خدمت میں اس جماعت کے لوگوں نے اس ذکر کو چھیڑا تھا لیکن انھوں نے سننا پسند نہ کیا اور موضوع سخن بدل دیا جس سے ہم نے یہ اندازہ کیا کہ وہ وسیع القلب ہیں اور اس قسم کے جزئی اعتراضات سے علماء سے بدظن نہیں ہو جاتے۔

کتاب التوحید | مترجمہ مولانا ابو عبد اللہ محمد بن یوسف السورتی۔ تقطیع ۲۲×۱۸/۲۰، ضخامت ۱۰۰، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ قیمت ۸/ مصنف سے قرول باغ دہلی کے پتے سے مل سکتی ہے۔

کتاب التوحید علامہ محمد بن عبد الوہاب بانیٔ تحریک نجدیہ کی وہ مشہور کتاب ہے جس نے نجدیوں کے دلوں میں اسلامی توحید نقش کر کے ان کو پکا ایماندار، متقی، ماحیٔ شرک اور حامیٔ اسلام بنا دیا۔ یہ کتاب دراصل اس قابل ہے کہ عالم کے جملہ مسلمانوں کو اچھی طرح پڑھائی جائے تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اسلام کس قسم کی توحید سکھلانے آیا ہے اور یہ توحید کس قدر عظیم الشان نتائج پیدا کرتی ہے اور کتنی انقلاب انگیز ہے۔

سب سے پہلے یہ کتاب غالباً ۱۳۱۱ھ میں دہلی میں شائع کی گئی تھی۔ اس زمانے میں مولانا عبد الحلیم شرر مرحوم یہاں مولانا سید نذیر حسین کی خدمت میں حدیث پڑھتے تھے۔ ان کو اس قدر پسند آئی کہ اس کا ترجمہ کر کے شائع کیا۔

اب مولانا سورتی صاحب نے اس کا عمدہ عالمانہ ترجمہ کیا ہے جو متن کے مقابل میں درج ہے۔ آغاز کتاب میں توحید کی حقیقت اور شیخ محمد بن عبد الوہاب کی مختصر سوانح عمری بھی لکھی ہے جس سے کتاب کے متعلق بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ جا بجا حاشیے میں توضیح طلب الفاظ اور معانی کی تشریح بھی کر دی ہے۔ ترجمہ بھی سادہ اور عام فہم ہے۔ اب یہ کتاب اس قابل ہو گئی ہے کہ عام طور پر اردو خواں طبقہ اس سے نفع حاصل کر سکے اور مدارس اور اسکولوں کے طلبا کو پڑھائی جا سکے بلکہ میرے خیال میں ہر مسلمان کے گھر میں اس کا ہونا ضروری ہے۔

[illegible] | [illegible] تقطیع [illegible] لکھائی [illegible]

چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت ۸؍ ۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ، قرول باغ، دہلی۔

اس چھوٹی سی کتاب میں خواجہ صاحب موصوف نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسےٰ علیہ السلام تک ان انبیاء علیہم السلام کے قصے بیان کئے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور اسی قدر بیان کیا ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ انسانی روایات نے ان قصوں پر جو اضافے کئے ہیں اور جن میں سے بڑا حصہ بے بنیاد بلکہ محض افسانہ ہے ان کو چھوڑ دیا ہے اور چونکہ یہ رسالہ تعلیمی ہے اور چھوٹے بچوں کے لئے لکھا گیا ہے اس لئے زبان نہایت سلیس اور سادہ رکھی ہے۔ بیان میں پیچیدگی مطلق نہیں ہے اور عبارت آسان ہے تاکہ بچے سمجھ سکیں۔

قرآن کریم میں انبیاء کے ذکر کی اللہ نے مدح فرمائی ہے اور کہا ہے "ھٰذا ذکر" (اس کا نام ہے ذکر) کیونکہ ان برگزیدہ اور مقبول بارگاہ حضرات کے حالات سراسر ہدایت، عبرت اور نصیحت ہیں اس لئے مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کے دل میں شروع ہی سے انبیاء کی مثال نقش کرائیں تاکہ ان کے اندر ایمان، سچائی، تقویٰ اور صبر پیدا ہو، دنیا کی بڑی بڑی مشکلوں کا مقابلہ کر سکیں اور حق کے حامی اور مددگار بن جائیں۔ اس لئے اس کتاب کا بچوں کو پڑھانا نہایت مفید ہوگا۔ اسی غرض کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے اور جامعہ کے بچے اس کو پڑھتے ہیں۔

دنیا کی رفتار

(الف) ہندوستان

گول میز کی دستوری کمیٹیاں | پہلی گول میز کانفرنس کے اختتام پر یہ حقیقت برطانوی مدبرین پر اچھی طرح روشن ہوگئی تھی کہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کی شرکت کے بغیر آئندہ دستور اساسی کے متعلق تمام فیصلے بے سود اور بے نتیجہ ہوں گے۔ چنانچہ حکومت کی پالیسی میں تبدیلی ہوئی، گاندھی ارون سمجھوتے پر دستخط ہوئے اور کانگریس نے چند شرائط کے ساتھ گول میز کانفرنس میں شرکت منظور کی۔ کانگریس کا واحد نمائندہ جب کانفرنس میں شرکت کی غرض سے انگلستان روانہ ہوا تو بعض حلقوں میں یہ امیدیں قائم کی گئیں کہ سیاسی گتھیاں شاید اب سلجھ جائیں۔ گول میز کانفرنس کا مقصد یہ سمجھا گیا تھا کہ ہندوستان اور انگلستان کے نمائندے ایک جگہ بیٹھ کر ہندوستان اور انگلستان کے آئندہ تعلقات اور ہندوستان کے ایک آزاد دستور اساسی کے متعلق گفت و شنید کر کے کچھ طے کریں گے لیکن جب کانفرنس منعقد ہوئی تو معلوم ہوا کہ مختلف جماعتوں، فرقوں اور طبقوں کے نمائندے ہندوستان کے مال غنیمت میں سے گویا اپنا اپنا حصہ بٹانے کے لئے مجتمع کئے گئے ہیں۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ بہت زیادہ غیر متوقع نہیں ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ ہندوستان کے اہم سیاسی مسائل کو طے کرنے کے لئے برطانوی تدبر نے گول میز کانفرنس کا جو طریقہ سوچ کر نکالا تھا وہ بھی ناکام ثابت ہوا۔

... ...

لیکن وزیراعظم برطانیہ نے یکم دسمبر ۳۱ء کو کانفرنس کے اختتامی جلسے میں کانفرنس کی ناکامی پر ایک خاص اعلان کے ذریعے سے پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور یہ اعلان کیا گیا کہ چونکہ بعض اہم امور مقامی طور پر تحقیقات طلب ہیں اس لئے کانفرنس تو نامعلوم مدت کے لئے ملتوی کی جاتی ہے لیکن اس عرصے میں کانفرنس کی ایک مجلس عاملہ کانفرنس کے تمام کاموں کو جاری رکھے گی اور تین کمیٹیاں مقرر کی جائیں گی جو ہندوستان جا کر ضروری تحقیقات کر کے آئندہ کانفرنس کے سامنے اپنی رپورٹ آخری منظوری کے لئے پیش کریں گی۔

مجلس عاملہ اور تینوں کمیٹیوں کے ارکان کے نام بھی شائع ہوگئے ہیں اور یہ کمیٹیاں اب ہندوستان میں اپنا کام کر رہی ہیں۔ مجلس عاملہ کی صدارت وائسرائے ہند کو دی گئی ہے اور ارکان میں ڈاکٹر تیج بہادر سپرو، مسٹر جیکر، ڈاکٹر مونجے، ڈاکٹر شفاعت احمد خاں وغیرہ شامل ہیں۔ کمیٹیوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ فرنچائز کمیٹی:۔ حق نیابت، حق رائے دہندگی اور متعلقہ امور کی تحقیقات کے لئے مقرر ہوئی ہے۔ اس کے صدر مارکوئس آف لوتھین ہیں، اور ارکین میں منجملہ دیگر انگریز اور ہندوستانیوں کے سر محمد یعقوب، ڈاکٹر امبیڈکر، سر سندر سنگھ مجیٹھیا بھی شامل ہیں۔

۲۔ فیڈرل فائننس کمیٹی:۔ اقتصادی معاملات کی صحیح صورت حال دریافت کرنے کے لئے۔ اس کے صدر رائٹ آنریبل یوسٹس پرسی رکن پارلیمنٹ ہیں اور ارکین میں سر اکبر حیدری اور لفٹننٹ کرنل ہکسر کے نام قابل ذکر ہیں۔

۳۔ انڈین اسٹیٹس فائننس کمیٹی:۔ یہ کمیٹی دیسی ریاستوں کے اقتصادی معاملات کی تحقیقات کرے گی اور اس کے صدر رائٹ آنریبل جے۔ سی۔ سی۔ ڈیوڈسن ہیں۔ اس کمیٹی کے تمام ارکین انگریز ہیں اور تعجب ہے کہ کوئی ہندوستانی اس میں شامل نہیں کیا گیا۔

... ...

ہر کمیٹی کے صدر کے نام وزیر اعظم نے ایک مکتوب بھیجا ہے اور اس میں کمیٹی کے دائرۂ عمل کے متعلق ضروری ہدایات دی ہیں مثلاً لارڈ لوتھین صدر فرنچائز کمیٹی کو لکھا ہے کہ گول میز کانفرنس کی فرنچائز سب کمیٹی کی سفارشات کو پیش نظر رکھ کر ایسی صورتیں دریافت کی جائیں کہ کم سے کم دس فیصدی اور زیادہ سے زیادہ پچیس فیصدی آبادی کو حق رائے دہندگی آئندہ دستور اساسی میں حاصل ہو جائے۔ وزیر اعظم کے تینوں مکتوبات میں بار بار ارکین گول میز کانفرنس کی اکثریت کا حوالہ دے کر اسی کی بنیاد پر مزید تحقیقات کی ہدایت کی گئی ہے حالانکہ گول میز کانفرنس میں نمائندگی آبادی کے لحاظ سے نہ تھی اور یہ پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا کہ کوئی فیصلہ نمائندگان کی اکثریت کے لحاظ سے نہ کیا جائے گا بلکہ آپس کے سمجھوتے اور گفت و شنید سے تمام باتیں طے پائیں گی ورنہ وزیر اعظم بخوبی جانتے ہیں کہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت اور سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمان دونوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ آئندہ دستور میں ہر بالغ کو حق رائے دہندگی ملنا چاہیے، پھر ایک ایسے واضح اور صریح فیصلہ کو نظر انداز کر کے سب کمیٹی کی سفارشات کے حوالے سے حق رائے دہندگی کو زیادہ

سے زیادہ پچیس فی صدی آبادی تک محدود کردینا کہاں تک حق بجانب ہے۔

... ...

ہرچند کہ گول میز کانفرنس کی کارروائیاں باشندگان ہند کے لئے حد درجہ مایوس کن تھیں لیکن چونکہ کانگریس کے واحد نمائندے نے وزیر ہند اور وزیر اعظم سے گفتگو کے بعد ان کمیٹیوں کے ساتھ آخر وقت تک تعاون کا وعدہ کرلیا تھا اس لئے پھر بھی قوم کی کچھ نہ کچھ توقعات ان کمیٹیوں سے وابستہ تھیں لیکن گاندھی ارون سمجھوتے کے ختم ہوجانے کے بعد اب ملک کی موجودہ صورت حال پھر وہی ہوگئی ہے جو دسمبر سنہ ۳۰ء اور جنوری سنہ ۳۱ء میں تھی۔ گزشتہ سال وزیر اعظم، حکومت ہند اور انگلستان کی تمام سیاسی جماعتیں اس بات پر متفق تھیں کہ بہتر سے بہتر دستور مرتب کرلیا جائے لیکن بیکار ہے جبتک کہ ملک کی فضا اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو! سائمن کمیشن نے بڑی محنت و کاوش سے ایک دستور مرتب کیا تھا لیکن اس کا جو حشر ہوا وہ معلوم ہے! پہلی گول میز کانفرنس بھی دستور اساسی کے متعلق تمام مسائل مہمہ طے کرسکتی تھی لیکن آخرکار یہی محسوس کیا گیا کہ کانگریس کی نمائندگی کے بغیر کوئی فیصلہ مناسب نہ ہوگا۔ آج کل سال بھر کے بعد پھر وہی صورت درپیش ہے لیکن ع

کل جو عریاں تھی حقیقت وہی مستور ہے آج

... ...

گاندھی ارون سمجھوتے کے ختم ہوجانے کے بعد اب حکومت کا یہ منشا معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتوں اور اقلیتوں کی مدد سے دستور مرتب کیا جائے اور اس کا نفاذ کیا جائے لیکن صورت حال ایسی بگڑتی جارہی ہے کہ لبرل جماعت کا ایک گروہ جو بمبئی سے تعلق رکھتا ہے اس وقت بھی علانیہ حکومت سے عدم تعاون کئے ہوئے ہے بقیہ لوگوں نے بھی الہ آباد میں ایک جلسہ منعقد کرکے حکومت کی موجودہ پالیسی سے اپنی بے زاری ظاہر کی ہے۔

اقلیتوں میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ پہلے ہی سے کانگریس کے ساتھ شریک ہے جداگانہ طریق انتخاب کے حامی مسلمان گول میز کانفرنس میں شریک تھے لیکن اس جماعت میں بھی حکومت کے موجودہ طرز عمل سے بے زاری پیدا ہورہی ہے اور ایک بہت بڑا گروہ دستوری کمیٹیوں سے علیحدگی پر زور دے رہا ہے اور اگر حکومت مسلمانوں کے مطالبات کا کوئی فیصلہ نہ صادر کرتی

اندیشہ ہے کہ اگر جلد سے جلد حکومت نے فرقہ وارانہ مسئلہ کا خاطر خواہ فیصلہ نہ کر دیا تو علاوہ دستوری کمیٹی کے چند اراکین کے اور باقی تمام مسلمانوں کو بھی کمیٹیوں سے کوئی تعلق باقی نہ رہے گا۔ غرض جملہ حیثیت سے صورت حال کسی طرح بھی خوشگوار نہیں ہے اور اندیشہ ہے کہ دستوری کمیٹیوں کا حشر سائمن کمیشن کی رپورٹ کے ساتھ نہ ہو۔

صوبہ سرحد اور اصلاحات | گول میز کانفرنس کے آخری جلسے میں وزیر اعظم نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ آئندہ دستور اساسی میں صوبہ سرحد کو دیگر صوبجات کے مساوی اختیارات حاصل ہوں گے نیز چونکہ نئے دستور کی ترتیب اور نفاذ میں ابھی زمانہ لگے گا اس لئے فی الفور موجودہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت اصلاحات کا وہاں نفاذ کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد ہی اصلاحات نافذ کرنے کے لئے ضروری انتظامات شروع کر دیے گئے تھے اور ۱۹ فروری ۱۹۳۲ء کے ایک سرکاری بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ضروری انتظامات مکمل ہو چکے تھے، اپریل کے دوسرے ہفتے میں کونسل کے انتخابات ختم ہو جائیں گے اور اس کے فوراً بعد صوبہ سرحد کی پہلی مجلس آئین ساز کا اجلاس منعقد ہوگا۔

مجلس آئین ساز کل چالیس ارکان پر مشتمل ہوگی جس میں سے ۲۸ ارکان منتخب شدہ ہونگے اور بارہ نامزد۔ اٹھائیس منتخب نشستوں میں سے بیس نشستیں مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دی گئی ہیں، پانچ غیر مسلموں کے لئے، ایک سکھوں کے لئے اور دو زمینداروں کے لئے۔ نامزد ارکان میں سے ۶ سرکاری رکن ہونگے اور ۶ غیر سرحدی۔ گورنر کی اگزیکٹو کونسل کا رکن منجملہ سرکاری ارکان کے ہوگا، ایگزیکٹو کونسل میں صرف ایک ہی رکن ہوگا اور وزیر بھی ایک ہی ہوا کرے گا جس کا تقرر حسب دستور منتخب اراکین کونسل میں سے کیا جائے گا۔

... ...

یہی اصلاحات اگر چند سال قبل نافذ کی جاتیں تو شاید ان کا خیر مقدم کیا جاتا حالانکہ "مڈی مان کمیٹی" کو تحقیقات کے بعد اچھی طرح روشن ہو گیا ہے کہ صوبجات کا موجودہ دو عملی نظام حکومت بہت ناقص ہے، اس کے علاوہ یہ وقت ان اصلاحات کے نفاذ کے لئے اور بھی موزوں نہ تھا جب کہ وائسرائے کے آرڈیننس نے تمام آئین اور دستور کو معطل کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرزمین "بے آئین" میں آئینی دور کے افتتاح پر کسی حلقے کی طرف سے خوشی کا اظہار نہیں کیا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ صوبہ سرحد کے ساتھ اب تک بڑی ناانصافیاں کی گئی ہیں اور جلد سے جلد وہاں آئینی نظام حکومت قائم کرنے کی ضرورت ہے لیکن ملک نے گزشتہ دس سال کے اندر سیاسی تعلیم اور سیاسی بیداری کے مدارج اس قدر جلد طے کر لئے ہیں کہ کوئی صوبہ اس فرسودہ دوعملی نظام حکومت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کہ صوبجات میں مکمل ذمہ دار حکومت قائم کرنے کا فیصلہ خود حکومت نے کر لیا ہے۔ ایسی صورت میں اگر حکومت واقعی صوبہ سرحد کی شکایات کو حق بجانب سمجھ کر تلافی مافات کرنا چاہتی ہے تو مکمل ذمہ دار حکومت کا نظام مرتب کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن ایک طرف بجائے اس کے نصف آزادی دینے والے اصلاحات نافذ کرنے میں حکومت غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے اور دوسری طرف آرڈیننس کے عملدرآمد میں اس قدر سختی ہے کہ اس کی وجہ سے تمام ملک میں بے چینی پیدا ہو گئی ہے، ایسی فضا میں اصلاحات کیوں نافذ کی جا رہی ہیں یہ سمجھنے سے تاریخ و سیاست کا ہر طالب علم قاصر ہے۔

برطانوی تجارت اور بائیکاٹ برطانوی ٹریڈ کمشنر مقیم ہندوستان اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ جہاں تک ہندوستانی منڈیوں کا تعلق ہے برطانوی تجارت پر ایسا نازک وقت گزرا ہے کہ اس کے مضر اثرات ایک عرصے تک محسوس کئے جائیں گے۔ برطانوی مال تجارت کی درآمد میں ۲۰ء۹ فی صدی تخفیف ہو گئی ہے اور ٹریڈ کمشنر کی رائے میں یہ تخفیف اس قدر غیر معمولی ہے کہ اس کی وجہ صرف تحریک بائیکاٹ قرار دی جا سکتی ہے۔

گزشتہ سال تحریک سول نافرمانی کا یہی عنصر اثر تھا جس کو تنگ نظر مدبرین انگلستان نظر انداز کرنا چاہتے تھے لیکن سابق وزیر ہند اور وائسرائے نے اسی عظیم الشان تجارتی نقصان اور اس کی اہمیت کو محسوس کر کے قوم پرست جماعت کے ساتھ سمجھوتا کیا تھا۔ ایک تو عام کساد بازاری نے تمام کاروبار کو تباہ کر رکھا ہے اس کے علاوہ بائیکاٹ کی قومی تحریک نے برطانوی تجارت کو شدید ترین نقصان پہونچایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ دستور اساسی کے تمام تحفظات اس تجارتی نقصان کو روک سکتے ہیں؟ پھر اگر برطانیہ اور ہندوستانی قوم کے تعلقات آئندہ اسی قدر کشیدہ رہے تو کیا وہ تحفظات جو لارڈ ریڈنگ اور سر سموئل ہور مجوزہ دستور اساسی کے لئے تجویز کر رہے ہیں کسی صورت میں بھی برطانوی مفاد اور برطانوی تجارت کی حفاظت کر سکیں گے۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ ایک دوسرے پر اعتماد اور خوشگوار سیاسی

تعلقات ہی سب سے بہتر ضمانت اور سب سے عمدہ تحفظات ہیں۔

کلکتہ، بمبئی اور کراچی سے درآمد و برآمد کے جو اعداد و شمار شائع ہوتے رہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تجارت خارجہ میں پچھلے مہینوں کے اندر معتدبہ کمی ہوگئی ہے۔ اس کا اثر سرکاری مالیات پر پڑنا لازمی ہے۔ اسی لئے بہی خواہان حکومت نے بھی گاندھی اروِن سمجھوتے کے ختم ہو جانے پر پرزور احتجاج کیا تھا لیکن معاملات اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ فی الحال سیاسی فضا درست ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بائیکاٹ کی قوت برابر زور پکڑتی جا رہی ہے جو بالآخر برطانوی تجارت کے لئے بہت زیادہ نقصان رساں ثابت ہوگی۔ جرمنی کے تاوان جنگ کے مسئلہ نے برطانوی مدبرین کو پریشان کر دیا ہے اس لئے کہ اس کا مضر اثر برطانوی ساکھ پر پڑ رہا ہے لیکن برطانوی مال کے بائیکاٹ کا مسئلہ بھی برطانیہ کے لئے کچھ کم اہم نہیں، برطانیہ کی ساکھ تجارت ہی کے ذریعے قائم رکھی جا سکتی ہے۔ حکومت کو جلد یا بدیر اس حقیقت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

شمع زندگی | ہندوستان کی مخصوص آب و ہوا میں عمر کا اوسط دیگر ممالک کے مقابلے میں یوں بھی کچھ کم نہ تھا لیکن اصول حفظان صحت کی طرف سے بے توجہی نے اوسط عمر گھٹا کر ۲۵ سال سے ۲۲ سال کر دیا ہے، اس کے مقابلے میں دیگر ممالک کا اوسط عمر برابر بڑھ رہا ہے جیسا کہ حسب ذیل اعداد سے ظاہر ہوتا ہے:۔

۱۔ نیوزی لینڈ میں — ۶۵ سال ہے

۲۔ امریکہ میں — ۵۶ سال سے بڑھ کر ۵۸ سال ہوگیا ہے۔

۳۔ انگلستان میں — ۴۹ سال سے ۵۰ سال ہوگیا ہے، اور

۴۔ جاپان میں بھی — ۴۷ سال سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

ہندوستان میں بلا مبالغہ لاکھوں جانیں ہر سال ہیضہ، طاعون، بخار اور چیچک میں ضائع ہوتی ہیں اور اب کچھ عرصے سے تپ دق کا مرض بھی روز بروز بڑھتا جاتا ہے، چنانچہ اس مرض کے ایک بہت بڑے ماہر ڈاکٹر متھو نے اندازہ لگایا ہے کہ کم از کم دس لاکھ جانیں ہر سال تپ دق کی بدولت ضائع جاتی ہیں اور اس مرض میں جو مبتلا ہوتے ہیں ان میں سے زیادہ تعداد نوعمروں اور نوجوانوں کی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر مِتّو ایک عرصے سے اس مرض کے انسداد کے لیے بہت کوشاں ہیں اور آپ نے ایک بہت بڑی صحت گاہ مدراس کے قریب بمقام تمبرم قائم کی ہے جہاں دق کے مریضوں کا علاج خاص ان کی نگرانی میں کیا جاتا ہے۔ لیکن جس تیز رفتاری سے یہ مرض اس ملک میں ترقی کر رہا ہے اس کو محسوس کرکے ڈاکٹر موصوف نے ارادہ کیا ہے کہ اس صحت گاہ کے ساتھ یہ بھی انتظام کیا جائے کہ (۱) سند یافتہ ڈاکٹر وہاں رہ کر اس مرض کی تشخیص اور علاج کے متعلق تجربات کریں (۲) مریضوں کے اعزا اور تیمارداروں کو حفظان صحت کے اصول اور عمدہ غذا تیار کرنے کے طریقے بتلائے جائیں اور (۳) عام تقاریر اور تصاویر کے ذریعے سے اس مرض سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہدایات اور معلومات عوام تک پہونچائی جائیں۔

ڈاکٹر مِتّو کی یہ کوشش قابل مبارکباد ہے اور ضرورت ہے کہ دیگر مقامات پر بھی اسی قسم کی تدابیر اس نامراد مرض کے انسداد کے لیے اور عامۃ الناس کو از خود موت کے منہ میں جانے سے بچانے کے لیے اختیار کی جائیں ورنہ اس طرف سے بے توجہی خودکشی کے مرادف ہوگی۔

(ب) عالمِ اسلامی

انتداب عراق کا خاتمہ سیاسی حلقوں میں ایک مدت سے یہ خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ عراق میں برطانوی انتداب کا زمانہ عنقریب ختم ہو جائے گا۔ رائٹر کی تازہ ترین اطلاعوں نے اس خیال کی تصدیق کر دی ہے۔ اس لئے کہ انجمن اقوام نے "اصولاً اس تجویز سے اتفاق کر لیا ہے کہ عراق میں انتدابی حکومت کو ختم کر دیا جائے لیکن اس وقت جب مستقل مجلس انتدابات کی تجاویز کے مطابق دولت عراق انجمن اقوام سے چند ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا عہد کرلے"۔ یہ ذمہ داریاں یا ضمانتیں کیا ہونگی اس کا پتہ مجلس انتدابات کی روئداد سے چلیگا۔ جب مجلس مذکور کی یہ روئداد تیار ہو جائے گی تو پھر انجمن اقوام کے بعض نمائندے برطانوی نمائندوں سے ملکر اس اعلان کا مسودہ تیار کریں گے جن میں مجلس کی سفارشات کا تذکرہ ہوگا۔ اس کے لئے حکومت عراق سے گفت و شنید کی ضرورت پڑے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس روز یہ تمام امور طے ہو گئے اس روز انتداب عراق کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اول تو یہ دیکھنا باقی ہے کہ انجمن اقوام حکومت عراق کی "ضمانتوں" کو کس نظر سے دیکھتی ہے، ثانیاً اگر انجمن اقوام نے عراق کی ضمانتوں کو منظور بھی کر لیا تو انتداب کا خاتمہ اسی روز ہو سکے گا،

جب دولت عراق باقاعدہ انجمن اقوام میں شریک ہو جائے گی۔

اب ذرا یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ان "ضمانتوں" کا تعلق جن پر انجمن اس درجہ اصرار کر رہی ہے کن امو
سے ہے۔ ایک تو انجمن کو اقلیتوں کی حفاظت مقصود ہے۔ دوسرے اس کی یہ خواہش ہے کہ عدالت ک
نظم و نسق اعلیٰ پیمانے پر ہو اور انتدابی حکومت کے دوران میں عراق پر جو مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں
ان کا احترام کیا جائے۔ علاوہ ازیں ان بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی بھی ضروری ہے جن میں
عراق نے بالواسطہ یا بلاواسطہ حصہ لیا ہے۔ یہ مسائل ہیں جو اس وقت سر فرانسس ہمفری ہائی کمشنر عراق
اور نوری پاشا وزیر اعظم عراق کے زیر غور ہیں۔ دونوں حضرات اس وقت جنیوا ہی میں مقیم ہیں اور
خیال ہے کہ انجمن اقوام کے اجلاس مئی میں اس اعلان کا مسودہ پیش کر دیا جائے گا جس کو نوری پاشا
اور سر فرانسس عراق کی طرف سے تیار کر رہے ہیں۔

عراق کی آزادی کا مسئلہ ختم انتداب کا پابند ہے لیکن اس امر پر بجائے خود اس قدر شرائط عائد
کر دی گئی ہیں جن کے پورا کرنے کے لئے ایک مدت چاہیے۔ مزید براں ختم انتداب کے بعد بھی یہ سوال
باقی رہ جاتا ہے کہ ان ضمانتوں کی موجودگی میں آزادی عراق کی صحیح نوعیت کیا ہوگی۔ بہر حال جو
لوگوں کو انجمن اقوام پر اعتماد ہے اور جو لوگ مغرب کی سیاسی کارروائیوں کے متعلق حسن ظن سے
کام لیتے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ دولت عراق کو اپنے سیاسی مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی ہو رہی ہے۔
امیر فیصل نے ایک تار میں تاجدار برطانیہ کا شکریہ ادا کیا ہے کہ اگر گزشتہ دس سال میں دولت برطانیہ
کی اعانت ان کے شامل حال نہ ہوتی تو وہ اپنے سیاسی مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہوتے اور ملک معظم
نے اس عظیم الشان کامرانی پر انھیں مبارکباد دیتے ہوئے یقین ظاہر کیا ہے کہ عراق و برطانیہ کا سلسلہ
محبت و مودت اسی طرح جاری رہے گا۔

سیاسیات شام | شام کے انتخابات عنقریب مکمل ہو جائیں گے۔ پچھلے مہینے وطن پسندان شام کے ر
نے حکومت کو مجبور کر دیا تھا کہ دمشق، حمص اور حماہ میں انتخابات کا سلسلہ یک قلم موقوف کر دیا جائے لیکن
اب یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ جماعت وطنیین کے رویے میں ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہو گئی ہے
اور حکومت کا خیال ہے کہ انتخابات کا نتیجہ اس کی توقعات کے مطابق ہوگا۔ انتخابات کا معاملہ ختم

ہو جائے تو مجلس مقننہ کو نئے دستور پر غور کرنا ہوگا اور پھر اس امر کا فیصلہ ہوگا کہ آیا شام میں جمہوریت قائم کی جائے یا بادشاہت۔

سطور بالا سے یہ امر بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ فرانسیسی حکومت نے شامی معاملات کے متعلق کیا طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔ اس سے ہم احرار شام کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہنوز ہنگامۂ انتخابات اختتام کو نہیں پہنچا۔ انتخابات کا سلسلہ جاری تھا کہ حماۃ، حمص اور دمشق میں ان کو یک قلم موقوف کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وطن پسندان شام کا رویہ کچھ بہت زیادہ مستحسن نہیں تھا۔ گویا حکومت انتداب نے ایک طرف آئین و دستور کی نمائش قائم کر رکھی ہے۔ دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ احرار شام کے رستے میں ہر ممکن عذر کی بنا پر کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا کر دے اور انتخابات کے خاتمے پر بہر حال اس کی اکثریت قائم ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ مجلس مقننہ میں جدید دستور کی تصدیق و عدم تصدیق اور شام میں جمہوریت یا بادشاہت کے قیام کا فیصلہ بھی حکومت ہی کے ایما پر ہوگا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس مسئلے کے متعلق احرار شام کی رائے کیا ہے۔ بہر حال قارئین جامعہ انھیں صفحات میں پڑھ چکے ہوں گے کہ امارت شام کے لئے اس سے قبل امیر فیصل تاجدار عراق کا نام لیا جاتا تھا اور یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ ممکن ہے عراق و شام کے الحاق سے ایک متحدہ ریاست قائم کر دی جائے۔ اب یہ معلوم ہوا ہے کہ عباس حلمی پاشا معزول خدیو مصر اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ انھیں شام کا تخت حاصل ہو جائے۔ پچھلے مہینے عباس حلمی پاشا نے قدس اور ماورائے اردن کا سفر کیا۔ جہاں عمان میں انھوں نے امیر عبداللہ سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہونچے کہ امیر فیصل کے دل میں اس قسم کی کوئی خواہش نہیں کہ وہ شام پر حکومت کریں۔ یہاں سے عباس حلمی بیروت آئے اور اب قسطنطنیہ کا عزم رکھتے ہیں تاکہ وہ اس گفت و شنید کا حال معلوم کریں جو حکومت فرانس اور ان کے نمائندے کے درمیان اس بارے میں ہو رہی ہے۔

غالباً یہاں اس امر کا ذکر کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ خدیو معزول جریدۂ ٹائمز کے خلاف ایک دعویٰ دائر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بنائے دعویٰ یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء میں ٹائمز نے سر ولنٹائن چرول کی کتاب "مسئلہ مصر" شائع کی جس میں ان کے متعلق بعض ایسے بیانات موجود ہیں جن پر خدیو معزول کو اعتراض ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ عباس حلمی پاشا اب تک اس معاملے میں کیوں خاموش رہے اس کا جواب یہ ہے کہ حکومت برطانیہ اور شاہ مصر سے ان کے تعلقات حال ہی میں ٹھیک ہوئے

ہیں چنانچہ جنگ کے بعد وہ پہلی مرتبہ پچھلے سال لندن تشریف لے گئے ہیں اور غالباً اسی زمانے میں انھوں نے ٹائمز کے خلاف اپنے دعوے کے انتظامات مکمل کئے ہیں۔

اتحاد طہران وانگورہ | قاہرہ کا ایک پیام مظہر ہے کہ توفیق رشدی پاشا وزیر خارجۂ ترکی طہران و بغداد کا عزم رکھتے ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ پاشائے موصوف سفر طہران سے فارغ ہو کر اب بغداد تشریف لے آئے ہوں گے۔

ایران و ترکی کی باہمی رقابت اور عداوت کا افسانہ ایک مدت ہوئی ختم ہو چکا ہے۔ سیاسی انقلابات کی بدولت یہ دو عظیم قومیں جو اپنے مذہبی تعصب اور بے بصر سیاست کی وجہ سے صدیوں تک باہم حریف بنی رہیں اب ایک دوسرے کو صلح و آشتی کا پیام دے رہی ہیں۔ ان کی سیاسی بے خبری، تدبر و مصلحت اندیشی اور مذہبی جنون وطنیت سے بدل چکا ہے۔ بایں ہمہ انگورہ اور طہران کے تعلقات ابتک کچھ بہت زیادہ اطمینان بخش نہیں تھے۔ خیال یہ ہے کہ دولت ایران کردوں کے جذبۂ آزادی کو اپنے مطلب کے لئے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ کردستان ایران و ترکی کی سرحد پر واقع ہے اور باغی کرد جب چاہتے تھے ایرانی علاقے میں پناہ گزیں ہو جاتے تھے لیکن جب سے رضا شاہ پہلوی کی حکومت نے ملک کے اندرونی نظم و نسق کی طرف قدم اٹھایا ہے کردی قبائل کی آزادانہ نقل و حرکت میں بہت کچھ کمی واقع ہو گئی ہے بلکہ گزشتہ دو سال کی جنگی کارروائیوں کے بعد اب ایران کی کردستانی سرحد تمام قبائلی مفاسد سے پاک ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران و ترکی کے باہمی اتحاد کی تکمیل کے لئے اب توفیق رشدی پاشا طہران گئے ہیں۔ قرارداد یہ ہے کہ ترکی سرحد کے بعض اضلاع ایران کو دیئے جائیں اور ان کی بجائے ارارات اصغر پر ترکوں کا قبضہ تسلیم کر لیا جائے۔ کیونکہ یہی علاقہ کردی باغیوں اور رہزنوں کا آماجگاہ ہے۔ حکومت ایران نے اگرچہ اس کے متعلق اپنی رضامندی کا باقاعدہ اظہار نہیں کیا لیکن توفیق رشدی پاشا کو اس سفر سے غالباً اس قسم کی کوئی مفاہمت بآسانی عمل میں آجائیگی۔

البتہ بغداد کا سفر ایک دوسرے مقصد کا پابند ہے۔ قارئین جامعہ انہی صفحات میں عراق و انگورہ کے خوش گوار تعلقات کا حال ملاحظہ کر چکے ہیں۔ امیر فیصل کے سفر قسطنطنیہ کے بعد نوری پاشا وزیر اعظم عراق براہ حلب قسطنطنیہ تشریف لے گئے تاکہ عراق و ترکی کے اتحاد کا رشتہ زیادہ مضبوطی سے

قائم ہو جائے۔ اب ان دوستانہ روابط کے قیام کے بعد رشدی پاشا بغداد گئے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ عراق اور ترکی میں تجارتی تعلقات بھی قائم ہو جائیں۔ ترکوں کی خواہش ہے کہ ایرانی تجارت میں وہ از سر نو اپنی اہمیت قائم کریں۔ آج سے آٹھ دس سال پہلے یہ خیال ظاہر کیا جاتا تھا کہ ترک فطری طور سے تجارتی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی اہمیت نہیں رکھتے لیکن اب کچھ سال سے ترک نہایت کامیابی کے ساتھ بہت سے بینک چلا رہے ہیں جن میں ترکوں کے علاوہ کسی دوسری قوم کا مطلق دخل نہیں۔ رشدی پاشا اپنے ساتھ ترکی بینکوں کے افسر اعلیٰ کو بھی لے گئے ہیں۔ طرابزون اور ارض روم کی سڑک عنقریب سرحد ایران تک پہنچ جائے گی لہذا ترکوں کے لئے موقع ہے کہ وہ اپنے بینک کی ایک شاخ طہران میں کھول دیں اور اس طرح دونوں ہمسایہ ممالک میں تجارتی روابط قائم ہو جائیں۔ پاشائے موصوف کا بغداد تشریف لیجانا بھی اسی خواہش کا نتیجہ ہے۔

حکومت انگورہ کی مالی دشواریاں

گزشتہ چند مہینوں سے انگورہ کی مالی مشکلات نے ایک نازک صورت اختیار کر رکھی ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ترکوں کو بھی یہ دشواری پیش ہے کہ وہ اپنے میزانیہ میں کیوں کر توازن قائم کریں۔ لیکن ترکی میں جو کچھ ہوتا ہے پوشیدہ طور پر ہوتا ہے اور اکثر یہ پتہ نہیں چلتا کہ حکومت کے مد نظر کیا تدابیر ہیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے مجلس ملیہ کے افتتاح پر یہ اعلان کیا تھا کہ ان امور کے متعلق حکومت غیر معمولی ذرائع اختیار کرے گی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے ہر شخص کی آمدنی پر خواہ وہ ترک ہو یا غیر ترک ۱۰ فی صدی ٹیکس عائد کر دیا ہے البتہ عمال حکومت اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مجلس ملیہ اس امر پر غور کر رہی ہے کہ غیر ملکی آبادی کو ترکی حدود میں کسی کام کاج کی اجازت نہ دی جائے چنانچہ تین مہینے کے اندر اندر ان سب لوگوں کو اپنے اپنے کام کاج سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ یہ نیا قانون تمام پیشوں اور صنعتوں پر عائد ہوگا۔ قسطنطنیہ کے فوٹوگرافر تو یہاں تک کر رہے ہیں کہ انھوں نے ایک درخواست میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ غیر ملکوں کو فوٹوگرافی کے پیشے تک کی اجازت نہ دی جائے۔

اس سے قبل حکومت ایک خفیہ حکم صادر کر چکی ہے اور وہ یہ کہ کابینۂ وزارت تمام سامان درآمد کا دو ماہ کے لئے تعین کر دیا کرے گا۔ وہ مصنوعات جو ترکی میں تیار ہوتی ہیں ان کو منگوانا ممنوع قرار دیا گیا ہے اور تعیشات کا تعین اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کی درآمد بند ہو جائے۔ تاجران درآمد کو مجبور کیا گیا ہے کہ

جس قدر مال ترکی میں آئے اتنا ہی مال ترکی سے خرید بھی جائے۔ علاوہ ازیں حکومت نے تمام ممالک کو مجبور کر دیا ہے کہ ان کی باہمی ادائگیوں کی رفتار ایک سی رہے گویا ترک یہ چاہتے ہیں کہ ان کے تجارتی حسابات میں ایک توازن سا قائم ہو جائے۔

جہاں تک درآمد کے تعین کا تعلق ہے اس کا طریق کار یہ ہے کہ حکومت ہر دو ماہی کے لئے درآمد کی مقدار کو مقرر کر دیتی ہے اور اس کا اعلان بہت روز پہلے کر دیا جاتا ہے۔ بالفعل ۱۹۳۶ء کی درآمد کو تعین درآمد کی بنا ٹھہرایا گیا ہے جو گزشتہ سالوں کے مقابلے میں قلیل ترین مقدار ہے۔ باوجود اس کے درآمد و برآمد کا توازن مشکل نظر آتا ہے اس لئے کہ ابھی تک ۲ کروڑ پاؤنڈ کی ادائگیاں باقی ہیں۔

حالات فلسطین معلوم ہوتا ہے کہ موتمر اسلام نے جن مجالس کے ذمے مختلف فرائض سپرد کر دئے تھے وہ اپنے کام میں مصروف ہیں۔ مسلمانان ہندوستان نے اس خبر کو مسرت کے ساتھ پڑھا ہوگا کہ اعضائے مجلس نے شہنشاہیت وملوکیت کے خلاف ایک اعلان شائع کیا ہے اور شامی عیسائیوں نے اس پر رضامندی کا اظہار کیا ہے کہ حجاز ریلوے کا وقف پھر مسلمانوں کے ذمے کر دیا جائے۔

البتہ یہ امر کہ جامع اقصیٰ میں سے مصحف پاک کا وہ بیش قیمت نسخہ جو ایک عرصے سے وہاں رکھا تھا دفعۃً غائب ہو گیا ہے نہایت افسوسناک ہے۔ پچھلے دنوں یہ اطلاع موصول ہوئی تھی کہ مصحف پاک کے صرف چند اوراق غائب ہیں۔ بہرحال مصحف پاک کا یہ ایک عدیم المثال نسخہ ہے جس کو مفتی سید امین الحسینی نے جامع عمر میں سے اٹھوا کر عجائب گھر میں بھجوا دیا تھا۔ یہ روایت جریدۂ فلسطین کے نامہ نگار مصر کی ہے اور اسی کا بیان ہے کہ یہ مصحف شیشے کے ایک صندوق میں رکھا تھا جس کی ایک کنجی سپریم کونسل اور دوسری مراکشی جماعت کے امیر کے پاس رہتی ہے۔ یہ اس لئے کہ مصحف مذکور کو سلطان ابوالحسن المرینی نے تیرھویں صدی مسیحی میں فتح جبل الطارق کے بعد تیار کیا تھا۔ پورا قرآن مجید ہرن کی کھال پر لکھا گیا ہے اور روشنائی میں مشک کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ سارا نسخہ نہایت درجے مزین ہے جس سے ابتک ہلکی سی خوشبو آتی ہے۔ ہر پارہ علیحدہ علیحدہ نقرئی جلد میں ہے جس کی زیبائش اندلسی اور مغربی صنعتکاری سے کی گئی ہے۔ ۶۵۰ سال ہوئے جب یہ نسخہ قلمبند ہوا اور اس کے لئے وہی اسلوب کتابت اختیار کیا گیا تھا جو مصحف قرطبہ کا تھا اور اس کا مقصد بھی دراصل نسخۂ قرطبہ کا بدل مہیا کرنا تھا۔

ممالک غیر

تخفیف اسلحہ | بارہ برس کی طویل گفت وشنید کے بعد اقوام عالم ایک مرتبہ پھر جنیوا میں جمع ہوئی ہیں تاکہ تخفیف اسلحہ کے مسئلے پر غور کریں لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مختصراً ان حالات کی طرف اشارہ کر دیا جائے جن کے ماتحت یہ سوال اول اول دنیا کے سامنے آیا۔

ہمارے لئے ان تجاویز وتدابیر کا تذکرہ بے سود ہوگا جو ۱۹۱۴ء سے قبل امتناع جنگ کے لئے وقتاً فوقتاً سیاسئین مغرب کی طرف سے مختلف انجمنوں میں پیش ہوتی رہیں۔ البتہ اختتام جنگ کے قریب جب صدر جمہوریہ امریکہ نے امن عالم کا محافظ بن کر اپنے چہاردہ نکات کا اعلان فرمایا ہے تو ان کے ارشادات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ " اس امر کا پورا پورا اطمینان کر لیا جائے گا کہ ہر قوم سامان حرب کا صرف اس قدر اندوختہ رکھنے پائے گی جو ملک کے اندرونی امن وامان اور اس کے دفاع ومحافظت کے لئے کافی ہو" یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اتحادیوں نے پریسیڈنٹ ولسن کی اس تجویز کی تائید کی اور جرمنی نے اسے منجملہ دوسری شرائط صلح کے تسلیم کیا۔ چنانچہ جنگ کے خاتمے پر جتنے بھی معاہدے مرتب ہوئے ان سب میں اسی تجویز کے الفاظ موجود تھے۔ انجمن اقوام کے تمام اراکین اس کے پابند ہیں بلکہ مجلس اقوام کا یہ فرض ہے کہ وہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے عملی تدابیر اختیار کرے۔ ۱۹۱۹ء میں جب اسی تجویز کے ماتحت جرمنی سے تخفیف اسلحہ کا مطالبہ کیا گیا ہے تو اس وقت موسیو کلیمنشو وزیر اعظم فرانس نے یقین دلایا تھا کہ یہ پہلا قدم ہے جو اقوام عالم نے تخفیف اسلحہ کی طرف اٹھایا ہے لیکن کچھ مدت کے بعد خود فرانس ہی نے اس تجویز پر یہ اعتراض کیا کہ جب تک انجمن اقوام اتنی قوت حاصل نہ کرے کہ وہ کسی ایسے ملک کو جس نے اپنے ذخائر حرب میں تخفیف کر دی ہے دوسرے حملہ آوروں سے بچا سکے اس وقت تک اس مسئلے پر غور کرنا بے کار ہوگا۔

فرانس کا یہ اعتراض ایک حد تک صحیح تھا لیکن سوال یہ ہے کہ جب جرمنی سے سامان جنگ کی تحدید کا مطالبہ کیا گیا تھا تو اس وقت موسیو کلیمنشو کو یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ بہرحال ۱۹۲۴ء میں یہ مسئلہ پھر اقوام مغرب کے سامنے آیا اور اب کے تجاویز جنیوا میں یہ طے ہوا کہ اگر سوئے اتفاق سے جنگ چھڑ جائے تو مجلس اقوام کا ہر رکن اس میں حصہ لینے پر مجبور ہوگا۔ برطانیہ نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا لہذا ۱۹۲۵ء

میں لوکارنو میں ایک اور اجتماع ہوا جس میں بالآخر یہ قرارداد منظور ہوئی کہ جرمنی اور فرانس دونوں کو جنگ کے موقع پر باہمی امداد اور اشتراک عمل کا یقین دلایا جائے۔ اس اجتماع میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، بلجیم، پولینڈ اور چیکوسلوواکیہ سات قومیں شریک تھیں۔ اگلے سال یعنی ۱۹۲۶ء سے جرمنی نے انجمن اقوام میں شرکت کر لی ہے اور اب گویا جرمنی کو بھی تخفیف اسلحہ کے مطالبہ کا ایسا ہی حق حاصل ہے جیسا دوسری قوموں کو۔ فرانس کا منشا یہ ہے کہ اس کی جنگی طاقت بدستور قائم رہے لیکن جرمنی یا ہنگری یا کسی دوسرے ملک کو یہ کیوں کر گوارا ہو سکتا ہے کہ اس کے مقابلے میں ان کی فوجی قوت برابر گھٹتی رہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اختتام جنگ پر ہر قوم نے جہاں تک ممکن تھا دوسری قوم کی شکست سے فائدہ اُٹھانا چاہا اس سے قدرتاً تمام یورپ میں صلح و آشتی کی بجائے بغض و عداوت اور جذبات انتقام کو تحریک ہوئی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جرمنی اور فرانس میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کی آگ دن بدن بھڑک رہی ہے۔ دونوں قوموں میں جنگی روح کارفرما ہے۔ فرانس کو اندیشہ ہے کہ جرمن قوم اس سے اپنی گزشتہ ناکامی کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔ اس کے لئے ہٹلر پارٹی کی موجودگی دن بدن خطرے کا موجب بن رہی ہے۔ ادھر اٹلی سے بھی اس کے تعلقات کچھ اچھے نہیں اور شمالی افریقہ کی سیاسی پیچیدگیاں کچھ ایسی ہیں کہ ان سے ہر وقت جنگ و جدل کا خدشہ ہے۔ مزید برآں مشرقی یورپ کی ریاستوں کی طرف سے اس پر جو پابندیاں عائد ہوتی ہیں ان سے بھی ہر لحظہ جنگ کا امکان ہے۔ لیکن اگر ان تمام وجوہ کو باطل قرار دیا جائے، تب بھی فرانس کا یہ عذر ہے کہ امن یورپ کے قیام کے لئے اس کے عساکر کی موجودگی ضروری ہے۔ گویا حکومت فرانس اب وہی حیثیت اختیار کرنا چاہتی ہے جو اس کے نزدیک جنگ سے قبل جرمنی کی تھی اور جس کے لئے اسے اب تک مطعون کیا جاتا ہے۔ بہرکیف یہ مطلب نہیں کہ فرانس کے یہ سب عذرات حقیقت پر مبنی ہیں اور انہیں اخلاقاً بھی جائز سمجھنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ مدبرین مغرب اگرچہ جنگ کے خطرات سے خوفزدہ ہیں لیکن ان کے اندر کوئی ایسی اخلاقی یا روحانی قوت موجود نہیں جس سے اقوام عالم کے درمیان تصادم نہ ہونے پائے۔ مغربی قوموں کی حالت تو اس معاملے میں خاص طور سے افسوسناک ہے۔ ان کا جذبۂ وطنیت، ان کی ہوس استعمار اور خواہش غصب، ان کی باہمی رقابت، مقصد انتقام، عیش پرستی اور مادیت اور لامذہبی اتحاد و اتفاق کی راہ میں

طرف جرمنی اور دوسری قوموں کا بجا طور پر اصرار ہے کہ ان کی اور فرانس کی حالت میں جو فرق پیدا ہوگیا ہے اس کو دور کیا جائے۔ اس پر لطف یہ کہ وہ قومیں جن کے معاملات فرانس یا جرمنی کے سے نہیں ہیں امن عالم کے نام پر تخفیف اسلحہ کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ اب کے جنیوا میں امریکہ اور روس کے مندوبین بھی شریک مجلس ہیں اور کوشش کی جا رہی ہے کہ اس میثاق کو جو مسٹر کیلوگ کی طرف منسوب ہے عملاً کامیاب بنایا جائے گویا بساط سیاست مغرب کے سبھی مہرے ایک جگہ جمع ہیں اور اگرچہ بظاہر امن عالم کا مقصد عظیم ان کے سامنے ہے لیکن ہر قوم جو چال چلتی ہے اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ تدبیر اور کاربرآری کی دنیا میں اپنی حریف قوم کو شکست دے سکے۔

ہٹلر پارٹی جرمنی کی مشہور سیاسی جماعت "ہٹلر پارٹی" نے جو اشتراکیت و وطنیت کے پردے میں اصل سابق طرز حکومت یعنی شہنشاہی اور قومی نظام کی حامی ہے حال ہی میں قانونی ذرائع کی مدد سے اپنا اثر بڑھانا شروع کر دیا ہے۔ اس کی تصریح مشہور جرمنی صحافی جارج برن ہارڈ نے اس طرح کی ہے کہ اگرچہ مجلس حکومت میں اس وقت ہٹلر پارٹی کی تعداد ۴۰ فی صدی ہے جس میں بآسانی دو فیصدی کا اور اضافہ ہو سکتا ہے لیکن ہٹلر کو یقین ہے کہ اس کے لئے مزید ۵ فی صدی کا حاصل کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا ایڈولف ہٹلر کے سامنے دو ہی راہیں ہیں۔ یا تو وہ کسی موقعے سے فائدہ اٹھا کر دفعۃً حکومت پر قبضہ کر لے یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر سردست مخلوط حکومت قائم کی جائے اور جب وقت آئے تو ہٹلر اپنے رفقاء کو چھوڑ کر مختار کل کی حیثیت اختیار کرے۔

ہٹلر پارٹی کی تعداد میں جس چیز نے اضافہ کیا ہے وہ جرمنی کی حد درجہ پست معاشی حالت ہے۔ ہٹلر کا کہنا یہ ہے کہ اس صورت حالات کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو جرمنی کے دشمن ہیں یعنی فرانس اور امریکہ اور جو جنگ کے بعد سے برابر اس کا خون چوس رہے ہیں۔ ہٹلر کا دعویٰ ہے کہ جرمنی کی سابقہ حالت ایک مرتبہ پھر عود کر سکتی ہے۔ گویا اس وقت وہ سب لوگ جنہوں نے انقلاب حکومت یا زر کی قیمت گر جانے سے نقصان اٹھایا ہے ہٹلر کے جھنڈے کے نیچے جمع ہیں یوں بھی اب تک جو سیاسی جماعتیں قائم ہو چکی ہیں ان سے کوئی خاص نتائج مترتب نہیں ہوئے لہٰذا لوگ یہ دیکھنا

ممکن ہے کہ ہٹلر کی قوت میں اس قدر جلد اضافہ نہ ہوتا لیکن ہوا یہ کہ ہٹلر نے اپنی تحریک کا آغاز اشتراکی اصولوں کے پردے میں کیا۔ اس سے بڑے بڑے تاجروں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہٹلر کی تحریک مزدوروں کی انجمنوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لئے مفید ثابت ہوگی لہذا انہوں نے ہٹلر کی مدد کرنا شروع کر دی۔ اس وقت ہٹلر کے ساتھ ہر قسم کے لوگ ہیں اور اس نے ان میں سے ہر شخص کے ساتھ جیسا جس نے چاہا ویسا وعدہ کر لیا۔ اس جماعت میں سابق والیان ملک، قدیم حکام، متوسط طبقہ، مزدور، دستکار، نوجوان، اشتراکی غرضکہ ہر طرح کے آدمی شامل ہیں۔ اس وقت ایڈولف ہٹلر کی گفت وشنید سنٹر پارٹی سے جاری ہے۔ ادھر خود سنٹر پارٹی بھی یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ ہٹلر کی بڑھتی ہوئی جماعت کو بہت دنوں تک حکومت میں حصہ لینے سے روک نہیں سکتی۔ لہذا سنٹر پارٹی کے ارباب حل وعقد یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہٹلر کے ساتھ مل کر اس کی جماعت میں تفریق وانتشار پیدا کر دیں لیکن سنٹر پارٹی کے بعض اراکین جن میں قابل ذکر نام چانسلر برونگ کا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک دفعہ ہٹلر کا عمل دخل حکومت میں قائم ہو گیا تو پھر مؤیدین ہٹلر یہ کوشش کریں گے کہ پوری حکومت ان کے قبضے میں آجائے۔ سنٹر پارٹی کے اس فریق کا خیال ہے کہ نیشنلسٹ سوشلسٹ جماعت کو باہمی مفاہمت کا موقع دینا چاہیئے تاکہ وہ اس امر کا فیصلہ کر سکیں کہ آیا انھیں باقی ماندہ نیشنلسٹ سوشلسٹ طبقے کو اپنے ساتھ ملا کر حکومت کرنی ہے یا بدستور سوشلسٹ ڈیماکرٹ جماعت کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اس لئے کہ ممکن ہے آیندہ انتخابات میں سوشلسٹ نیشنلسٹ جماعت کی تعداد کم رہ جائے۔ لیکن اگر فان ہنڈنبرگ دوبارہ صدارت کی لیڈری کے لئے تیار ہو گئے (جس کی رائٹر نے حال ہی میں تصدیق کر دی ہے) تو پھر سنٹر پارٹی ہٹلر سے اس امر کا مطالبہ کرے گی کہ وہ ان کے اشتراک عمل کے عوض جنرل ہنڈنبرگ کی صدارت کی تائید کرے۔

مگر اب ہٹلر کا ہنڈنبرگ کی تائید کرنا اس کے سابقہ اقوال کے منافی ہوگا اور اس سے قدرتاً اس کی جماعت میں تفریق وانتشار رونما ہو جائے گا۔ بایں ہمہ ہٹلر کے لئے اپنی قوت کو قائم رکھنے کا یہی ایک ذریعہ ہے اس لئے کہ ہٹلر کے لئے کسی انقلاب آفریں طرز عمل کا کوئی امکان نہیں اور اسے خوب معلوم ہے کہ اگر اس قسم کا کوئی موقع آیا تو جرمن قوم اس کی بجائے ہنڈنبرگ کے ساتھ ہوگی۔

شذرات

اردو اکادمی کا دوسرا جلسہ جس کے لئے ۱۴؍ فروری کی تاریخ مقرر ہوئی تھی اس دن منعقد نہ ہو سکا کیونکہ فاضل مقرر کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی۔ تمام مقامی اور بیرونی اراکین کو چند دن پہلے سے تاریخ بدلنے کی اطلاع دیدی گئی تھی اور اخباروں میں بھی اعلان ہو گیا تھا پھر بھی بعض حضرات احتیاطاً ۱۴؍ فروری کو بھی مختلف اوقات میں تشریف لائے۔ انھیں جو زحمت برداشت کرنی پڑی اس کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔

جلسہ ۲۰؍ فروری یوم شنبہ شام کو ۷½ بجے سے ۸½ بجے تک ہوا۔ صدارت جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے فرمائی کیونکہ پروفیسر محمد حبیب صاحب بعض وجوہ سے تشریف نہیں لا سکتے تھے۔ قاضی عبد الغفار صاحب نے اپنا فاضلانہ خطبہ "جمال الدین افغانی کی سیرت" پر پڑھ کر سنایا۔ قاضی صاحب اس موضوع کے متعلق عرصے سے تحقیقات فرما رہے ہیں اور آپ نے بڑی کاوش اور تلاش سے بہت کچھ نیا مواد جمع کیا ہے جو آج تک کسی کو ہاتھ نہیں آیا تھا مثلاً شیخ جمال الدین کے دوست اور قدرداں مسٹر بلنٹ کا روزنامچہ، عروۃ الوثقیٰ کے متعدد نمبر (یہ رسالہ پیرس سے شیخ جمال الدین اور مفتی محمد عبدہٗ کی ادارت میں شائع ہوا مگر صرف چند مہینے چل سکا۔ اس کے پرچے اب نایاب ہیں)، شیخ کے خطوط مختلف احباب کے نام، ان کے خاص دوستوں کے قلمی بیانات وغیرہ وغیرہ۔ قاضی صاحب کی تقریر جس دلچسپی، توجہ اور جوش سے سنی گئی اس کی مثال علمی جلسوں میں کم ملتی ہے۔ حاضرین کی تعداد پچھلے جلسے سے کچھ زیادہ تھی اور ان میں سفارت افغانستان کے نمائندے بھی موجود تھے۔ ہم اس مقالے کا ایک حصہ مارچ کے نمبر میں شائع کریں گے اور پورا مقالہ انشاءاللہ علیحدہ رسالے کی شکل میں جون تک چھپ جائے گا۔

اکادمی کا تیسرا جلسہ ۱۹؍ مارچ کو ۸ بجے شام سے شروع ہو گا۔ مولانا اسلم جیراجپوری حسب ذیل

"مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر"

امید ہے کہ مولانا محمد سورتی صاحب جلسے کی صدارت فرمائیں گے۔

اس تقریر کے بعد ایک علمی مباحثہ ہوگا۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب یہ تجویز پیش کرینگے کہ "ہندوستانی یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم مجموعی حیثیت سے ملک وقوم کے لئے مضر ہے"۔ جناب خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل ٹرننگ کالج علی گڑھ اس کی مخالفت میں تقریر فرمائیں گے۔ بعض اور حضرات بھی جو تعلیم کے مسئلے سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں اس موضوع پر اپنے خیالات ظاہر کریں گے۔

دربار بھوپال نے مسلمان عورتوں کی دادرسی کے لئے سال گزشتہ ایک مزید ضابطہ "تحفظ حقوق زوجین" کے نام سے جاری کیا ہے جو شوہر کے مفقود الخبر ہو جانے کی حالت میں عورتوں کی گلو خلاصی نیز بصورت عدم ادائے نان ونفقہ یا بصورت امراض متعدیہ خلع کے حقوق پر مشتمل ہے۔

مذہب حنفی میں شوہر مفقود الخبر کی بیوی کو عمر طبیعی تک انتظار کی ہدایت کی گئی ہے جس کو کسی نے ۹۰ سال تجویز کیا ہے اور کسی نے اس سے بھی زیادہ۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں تا بہ زندگی اس کے لئے رہائی کی صورت ممکن نہیں۔ مگر چونکہ مذہب حنفی میں اس بات کی اجازت دیگئی ہے کہ باقتضائے ضرورت دیگر ائمہ کے مسلک کو اختیار کیا جا سکتا ہے اس لئے اسی اصول کے تحت میں بمنظوری فرمانروائے بھوپال دبلحوظی احکام شرعیہ یہ ضابطہ جاری کیا گیا ہے جس میں مفقود الخبر کی بیوی کو قاضی صاحب ریاست کے سامنے درخواست پیش کرنے پر مطابق مذہب مالکیہ زیادہ سے زیادہ چار سال کے انتظار کے بعد نکاح کا اختیار دیدیا جائے گا۔

اسی طرح اس کو حق دیا گیا ہے کہ شوہر کے مجذوم یا مبروص وغیرہ ہونے کی صورت میں بھی وہ تفریق کی درخواست محکمۂ قضا میں کرسکتی ہے اور قاضی صاحب بعد ثبوت دعوے کے مطابق قواعد شرعیہ تفریق کرا سکتے ہیں۔ دربار بھوپال کا یہ اصلاحی کام ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور ہر طرح تحسین کا مستحق ہے۔

غور سے دیکھنے کے بعد اس ضابطہ میں ہم کو ایک کمی نظر آئی جس سے بعض حالتوں میں عورت کی مصیبت کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم اس کو ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک طرف تو زادالمعاد سے یہ آزادانہ اصول اس ضابطہ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ

"ہر وہ عیب جو باعث نفرت زوجین ہو اور اس سے مقصد نکاح حاصل نہ ہوتا ہو اختیار فسخ کا واجب کر دے گا۔"

دوسری طرف امراض متعدیہ کے متعلق یہ ضابطہ کہتا ہے کہ:۔

"اگر قبل نکاح ان امراض میں مبتلا ہوتے کا عورت کو علم تھا تو اس کو تفریق حاصل کرنے کا حق نہ ہوگا۔"

حالانکہ یہ ممکن ہے کہ عورت با وجود علم ان امراض کے دور رس نتائج کا اس وقت اندازہ نہ لگا سکی ہو یا اس نے ان کو عارضی سمجھا ہو اور بعد میں وہ دائمی ثابت ہو گئے ہوں یا اس نے ان کو قابل برداشت خیال کیا ہو اور بعد میں بڑھ کر وہ ناقابل برداشت ہو گئے ہوں۔ کیا ان صورتوں میں محض اس وجہ سے کہ اس "ناقص العقل" نے جان بوجھ کر نکاح کیا تھا عدالت شرعی اس کی رہائی کی کوئی سبیل نہ کرے اور انسانیت کی حفاظت اور طبی اصول سب کو پس پشت ڈال کر اس کو اس بلا میں گرفتار رہنے دے جو باعث نفرت ہے اور جس سے مقصد نکاح حاصل نہیں ہوتا۔

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

نمبر ۳

بابت ماہ مارچ ۱۹۳۲ع

۱۸

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہوار

جامعہ

دہلی

زیر ادارت

مولینا اسلم جیراجپوری
ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے؛ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۸ | بابتہ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۲ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرول باغ سے شائع کیا۔

جمال الدین افغانی

(یہ قاضی عبدالغفار صاحب کے اس مقالے کا آخری حصہ ہے جو موصوف نے اردو اکادمی کے جلسے میں ۱۲ فروری کو پڑھا تھا۔)

ایران میں شیخ کی عملی زندگی کا اہم ترین زمانہ ۱۸۹۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ وہ بادشاہ کے مہمان ہو کر گئے تھے لیکن ان کے افکار و عزائم شاہ کے اثرات سے بہت دور تھے۔ وہی ایک جذبہ جوان کو مصر اور روس لے گیا تھا یا نجد و خلیج فارس کی طرف لے گیا وہی جذبہ ان کو ایران میں کھینچ کر لایا تھا اور کچھ ہی عرصے بعد اس جذبے کے مظاہرے شروع ہو گئے۔

شیخ کا بہت بڑا کارنامہ جو مصر و ایران میں ان کی زندگی کا نشان ہے یہ تھا کہ جو جماعت یعنی جماعت علماء شہنشاہیت کی پرستار اور مددگار تھی اسی سے انھوں نے شہنشاہیت اور مطلقیت کے فنا کرنے کا کام لیا۔ تاریخ اسلامی کے اس دور میں قدامت پسند علماء کا گروہ حقوق انسانیت کا حامی نہ تھا بلکہ مخالف تھا تاہم شیخ ہی کا وہ جادو تھا جس نے اس استبداد پسند جماعت کے قلوب کو بدل دیا اور حقوق ملت کے چوروں ہی کو "آدمیت" اور انسانیت کا محافظ و پاسبان بنا دیا۔ شیخ کی سیاسی زندگی کا یہ سب سے بڑا معجزہ تھا!

ناصرالدین شاہ کی زندگی کے آخری چند سال ایران کے قومی مصائب اور ایرانی شہنشاہیت کے بدترین چند سال تھے۔ شاہ کو یورپ کی دلچسپیوں اور عیاشیوں نے اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور اس کی دولت یورپ کے بازاروں اور قہوہ خانوں میں پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ ناصرالدین شاہ کا تیسرا اور آخری سفر یورپ وہ تھا جب وہ یورپ سے اپنی شہنشاہیت کے سخت ترین دشمن کو مہمان بنا کر ساتھ لایا تھا جس طرح فرعون کے محل میں موسیٰ لائے گئے تھے۔ ناصرالدین نہ صرف اپنا خزانہ خالی کر چکا تھا بلکہ اس کی رعایا کی جیبیں بھی خالی ہو چکی تھیں۔ اب مصر کی طرح یہاں بھی یورپ

کے ساہوکار قبضہ جما رہے تھے۔ مشرقی تاجداروں کے تاجوں کو گرو رکھنے کے لئے یورپ کا بنسیا ہمیشہ تیار رہتا ہے اس لئے کہ وہ خوب جانتا ہے کہ تاج کے ساتھ تخت بھی اس کے گھر آئے گا۔ ناصرالدین کی تنگدستی نے اس کو قرضے لینے اور یورپین سرمایہ داروں کو اپنے ملک میں ہر قسم کی مراعات دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۹ء میں برطانوی سرمایہ داروں کو طہران میں شاہی بنک قائم کرنے کا ٹھیکہ دے دیا گیا اور اسی کے چند روز بعد تمباکو کے اجارے کا قصہ پیش آیا، جس نے بالآخر انقلاب کے دروازے کھول دئے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۸۹ء کو شاہ سفر یورپ سے واپس آئے، شیخ ان کے ہمراہ تھے۔ چند ہی روز بعد اہواز سے طہران تک سڑک بنانے کا ٹھیکہ ایک برطانوی کمپنی کو دے دیا گیا۔ ۸ مارچ ۱۸۹۰ء کو ایک انگریز ہی کو تمام ایران کے تمباکو کی کاشت کا اجارہ دا۔ بنا یا گیا۔ تقریباً دس کروڑ کے سرمایے سے اس کمپنی نے اپنا کام شروع کیا۔ اس اجارے کے خلاف سب سے پہلے شاہزادہ مالکم خاں نے، جو لندن میں ایرانی سفیر تھے احتجاج کیا اور اسی بنا پر شاہ نے ان کو سفارت کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ مالکم خاں کی زبردست شخصیت نے اس موقعے پر اپنے تمام ذاتی اثرات کو حکومت کے خلاف نکتہ چینی میں صرف کر دیا۔ وہ اپنے عہدے سے برطرف ہو کر لندن ہی میں مقیم رہے۔ انھوں نے اخبار "قانون" جاری کیا۔ اس اخبار نے ایرانی شہنشاہیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ شیخ کے مضامین بھی "قانون" میں شائع ہونے لگے اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ راز ظاہر ہو گیا کہ شیخ مالکم خاں کی اس تحریک سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح شیخ کی زبردست آواز خط کے لفافے میں طہران سے لندن جاتی تھی اور لندن سے "قانون" کے پردے میں طہران واپس آ کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل جاتی تھی۔ شاہ ان کے اصلی رنگ سے واقف ہو چکا تھا اور وہ بھی کھل کر میدان میں آ گئے تھے۔ جانفروشوں کی ایک جماعت ان کے حلقے میں داخل ہو چکی تھی۔ شیخ علی قزوینی جو بعد کو قاضی عدلیہ ہوئے، مرزا آقا خاں جنھوں نے بعد کو قسطنطنیہ سے اخبار اختر جاری کیا اور پھر تبریز میں خفیہ طور پر قتل کر دئے گئے، شیخ احمد کرمانی، مرزا رضا کرمانی جس نے ناصرالدین شاہ

کو قتل کیا اور طہران میں پھانسی پائی، مرزا محمد علی خاں طہرانی، اور ایسے ہی بہت سے نام شیخ کے عقیدتمندوں کی فہرست میں تھے۔ ان میں سے بہت سے وہ نام تھے جو آج بھی تاریخ انقلاب ایران کے صفحات پر آب زر سے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اس جنگ آزادی میں ہمیشہ پیش آتا ہے حکومت کے بلند مقام اراکین شیخ کے بڑھتے ہوئے اثرات کو گوارا نہ کر سکے اور وزیر اعظم امین السلطنۃ نے بہت جلد شاہ کو شیخ کی مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ اس عرصے میں بہت سی خفیہ انجمنیں ملک میں قائم ہو چکی تھیں اور شاہ اپنے کو سخت خطرے میں پاتا تھا۔ شیخ بھی اب امین السلطنۃ اور شاہ کے منصوبوں سے بے خبر نہ تھے، چنانچہ انھوں نے شاہ سے اجازت چاہی کہ طہران کے باہر شاہ عبد العظیم کی خانقاہ میں اقامت اختیار کریں اور شاہ نے بھی اس خیال سے کہ یہ فتنہ خاص دار السلطنت سے دور ہو جائے ان کو وہاں جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن جب وہ شاہ عبد العظیم میں جا کر بیٹھے تو وہاں بھی مشاہیر، علماء اور عوام ہزاروں کی تعداد میں حاضر ہونے لگے اور شیخ کی تبلیغ و تلقین کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ۸ مہینے اس طرح گذرے اور اس ۸ مہینے میں داعی حریت کی آواز ایران کے ہر گوشے میں سرایت کر گئی اور وہ ملت ایرانی کے ایک مصلح اعظم سمجھے جانے لگے۔ اسی زمانے میں شیخ نے ایک مکتوب شاہ کو بھیجا اور دریافت کیا کہ وہ کیوں ان سے بدگمان ہیں۔ لیکن اس مکتوب کے جواب میں شاہ نے شاہ عبد العظیم میں شیخ کو ان کے بستر علالت پر گرفتار کرا لیا اور وہیں سے ۵۰ سواروں کی نگرانی میں عثمانی سلطنت کی سرحد پر بھیج دیا۔ شیخ کے خارج البلد کئے جانے کی خبر نے تمام ملک میں آگ لگا دی اور شاہ کو اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ بلاشبہ شیخ کا ایران سے جانا شاہ کی موت کا آنا تھا۔

شیخ نے ایران سے نکلتے ہی مجتہدین عراق و کربلا اور علمائے ایران کی دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دیا اور جو زمین وہ تیار کر چکے تھے اس پر اپنا کام شروع کر دیا۔ جو خطوط شیخ نے علماء و مجتہدین کو لکھے ان میں سے ایک کا کچھ حصہ ان اوراق میں اس لئے پیش کرتا ہوں کہ شیخ کے ان جذبات سے آپ روشناس ہو جائیں جو ایران کے متعلق ان کے قلب کو بے چین کر رہے

تھے۔ سامو کے مجتہد اعظم حاجی مرزا حسن شیرازی کو لکھتے ہیں:-

"میں حق کہتا ہوں، یہ خط شریعت اسلامی کی خاطر لکھتا ہوں۔ جہاں کہیں وہ شریعت جاری ہو اور قائم ہو۔ یہ ایک اپیل ہے جو میں تمام حق پسند روحوں سے کرتا ہوں جو شریعت پر ایمان رکھتی ہیں اور اس کے نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہیں یعنی میں اپیل کرتا ہوں علمار اسلام سے اور یہ اپیل میں تمام علمار سے کرتا ہوں حالانکہ میرے مخاطب ان میں سے ایک بھی نہیں ......

خدا نے آپ کو اس اعلیٰ نیابت پر فائز کیا ہے تاکہ آپ حقیقت عظیمہ کے نمائندے ہوں اور خدا نے ملت بیضا سے آپ کو منتخب کیا ہے کہ آپ انسانوں کی باگ ہاتھ میں لے کر شریعت اسلامی کی حفاظت و نگرانی کریں۔ اہل ایران اب ظلم وستم کے اندر اپنے بیت الدین کو دیکھ کر بیتاب ہوگئے ہیں جو اغیار و کفار کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہے اور جس پر ان اغیار و کفار کا قبضہ قائم ہوگیا ہے۔ مگر کسی لیڈر کے نہونے کی وجہ سے اہل ایران پریشان ہیں، منقسم ہیں اور معطل ہیں۔ وہ حیران ہوتے ہیں، ان کا ایمان متزلزل ہوتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان مجتہدین کی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی جن کو وہ اپنا رہنما اور اسلامی مفاد کے معاملات میں اپنا لیڈر سمجھتے ہیں اور سمجھنے کا حق رکھتے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ تیرا ایک لفظ ان کو متحد کر دے گا اور تیری ہی حجت فیصلہ کن ہوگی، تیرا ہی حکم با اثر ہوگا اور کسی کی مجال نہ ہوگی کہ تیرے حکم پر حرف زنی کر سکے اور اگر تو چاہے گا تو متفرق عناصر کو اپنے ایک لفظ سے متحد کرا دے گا اور اس طرح خدا کے دشمنوں کے دل میں خوف خدا پیدا کر دے گا اور کفار کے ظلم سے اہل ایران کو بچائے گا۔ تیرا ہی ایک لفظ اس مصیبت و ابتلا کا خاتمہ کر دے گا جس میں اہل ایران گھرے ہوئے ہیں اور ان کو زندگی کی سختیوں سے نجات دے کر راحت و آرام عطا کرے گا۔ پس دین کی حفاظت ہو جائے گی اور اس دین کے

حلقہ بگوش اس کو سنبھال لیں گے اور اسلام کا مرتبہ بلند ہو جائے گا ..... . اے امام اعظم! بے شبہ بادشاہ کی قوت ارادی کمزور ہے، اس کی سیرت خراب ہے اور اس کا دل گندہ ہے۔ وہ ملک پر حکومت کرنے اور اہل ملک کے معاملات کو سدھارنے کے قابل نہیں ہے اور اس نے حکومت کی باگیں ایک بے دین ظالم اور غاصب کی سپرد کر دی ہیں جو رسول پر علانیہ استہزا کرتا ہے اور شریعت حقہ کی پروا نہیں کرتا، جو امرائے شریعت کو خیال میں نہیں لاتا اور علماء پر لعنت بھیجتا ہے، اہل زہد و تقوی کو ذلیل کرتا ہے اور سادات کی تحقیر کرتا ہے علاوہ ازیں کفار کے ملک سے واپس آنے کے بعد وہ بالکل قابو سے باہر ہو گیا ہے، علانیہ شراب پیتا ہے اور کفار کی صحبتوں میں وقت گذارتا ہے۔ یہ ہے اس کا چلن۔ مگر اس کے علاوہ اس نے ایرانی زمین کا بڑا حصہ مع اس کے منافع کے کفار کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ (اشارہ ہے معدنیات کی طرف) یہی نہیں بلکہ سڑکیں، کارواں سرائیں، باغات، کھیت سب ہی کچھ اس نے وقف کر ڈالے .... تمباکو کی تمام زراعت مع زمین و عمارات کے، انگور کی فصل مع کارخانوں اور سامان تجارت کے، صابون، موم بتیاں اور شکر کے تمام کارخانے غرض سب کچھ مع متعلقات اس نے کفار کی نذر کر دیا ہے، انتہا یہ ہے کہ بنک۔ آپ کیوں کر سمجھیں گے کہ بنک کیا ہے اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ دشمنان اسلام کو گویا ساری سلطنت دے ڈالی۔ .... اب جو کچھ رہ گیا ہے اس نے روس کے سامنے پیش کر دیا تاکہ روس خاموش رہے یعنی مندب رشت، دریائے طبرستان، سڑک انزل و خراسان مع تمام مکانات و سراؤں اور متعلقہ اراضیات مزروعہ کے، مگر روس نے ناک بھوں چڑھائی اس لئے کہ وہ تو کل خراسان، آذربائیجان اور مازندران کی فکر میں ہے .... یہ سب پہلا نتیجہ اس پاگل کے طرز عمل کا .... اور تو اے حجۃ الاسلام! کیا تو اس قوم کی مدد کے لئے نہ اٹھے گا اور ان کو متحد نہ کر دے گا اور شریعت مطہرہ کی

قوت سے اس ملک کو اس گناہگار کے ہاتھ سے نجات نہ دلوائے گا؟ بلاشبہ بہت جلد
یہ اسلامی مملکت اغیار کے زیر اقتدار ہوگی جو وہاں جس طرح چاہیں گے حکومت کریں گے
اگر تو نے یہ موقع جانے دیا' اور اے امام! اگر یہ واقعہ تیری زندگی میں پیش آگیا تو لازمہً
تو اپنا نام تاریخ کے صفحات پر روشن نہ چھوڑ جائے گا!"

اس کے بعد شیخ نے ان مظالم کا ذکر کیا ہے جو ان کے رفیقوں پر اور خود ان پر کئے گئے۔
انھوں نے اپنے ایران سے نکالے جانے کی داستان ذرا تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ:۔

"اب میری داستان اور جو کچھ اس ناشکر گذار ظالم نے میرے ساتھ کیا وہ بھی
سن لیجئے۔ اس مردود نے طہران کی برف سے ڈھکی ہوئی سڑکوں پر ذلت کے ساتھ
میرے گھسیٹے جانے کا حکم دیا جبکہ میں خانقاہ عبدالعظیم میں پناہ گزیں تھا اور بہت بیمار
تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس کے ذلیل خادموں نے مجھے باوجود میری علالت کے
ایک باربردار ٹٹو پر سوار کرایا اور زنجیروں سے باندھ دیا اور یہ سب اس وقت کیا گیا
جب جاڑوں کا موسم تھا' برف کے طوفان آرہے تھے اور بہت سرد ہوائیں چل رہی تھیں
اس طرح مجھے سواروں کی نگرانی میں خانقین پہنچایا گیا جہاں پہلے ہی ترک والی سے
طے کرلیا گیا تھا کہ مجھے بصرہ بھیج دیا جائے۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر
مجھے آزاد چھوڑا گیا تو میں سیدھا تیرے پاس آؤں گا' اے امام! اور تجھے اس کے
مظالم سناؤں گا اور مملکت ایران کے حالات بتاؤں گا اور تجھ سے اے حجۃ الاسلام
مدد چاہوں گا!"

شیخ کا یہ زبردست اپیل ایک بجلی کی طرح ایرانی مجتہدین کی جماعت میں سرایت کرگیا اور
ایران میں تمباکو کے اجارے کے خلاف وہ شدید اور خوفناک آگ بھڑکی جس نے ناصرالدین شاہ
کا جامۂ ہستی جلا ڈالا۔ اپنے جلاوطن ہونے سے پہلے شیخ نے ایران کی سرزمین پر شہنشاہیت کے
خلاف اس قدر بارود پھیلا دی تھی کہ ان کی جلاوطنی کے چند ہی روز بعد "انقلاب" کی آواز

ایران کے کوچہ و بازار میں گونجنے لگی۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے بظاہر اسباب شیخ کی تعلیمات خود مختار بادشاہوں کی جان کی دشمن معلوم ہوتی تھیں اور یہ شبہ کچھ بیجا نہیں کہ شیخ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے شدید ترین آلات حرب استعمال کرنے کو بھی جائز سمجھتے تھے۔ ان کے اس سیاسی مذہب سے کتنا ہی اختلاف کیا جائے لیکن ان کی بے مثال قربانیوں اور ان کے اعلیٰ انتہائے خیال کے متعلق دنیا کا کوئی وطن پرست ایک حرف نہیں کہہ سکتا۔ جیسا کہ مصر کے حالات میں ظاہر کیا جا چکا ہے ان کی سیاسیات کا وہی رنگ ایران میں بھی تھا۔ علمار کے طبقے میں آگ لگا کر انھوں نے گویا ناصر الدین شاہ کی شہنشاہیت کو آگ لگا دی اور گو وہ خود اس ملک سے نکال دیے گئے لیکن اپنے بعد وہاں بہت سے سرفروش چھوڑ کر جن میں سے ایک نے بالآخر ناصر الدین سے اس کے مظالم کا خوفناک بدلہ لے لیا۔ مرزا رضا کرمانی نے اپنی گرفتاری کے بعد اور پھانسی پانے سے پہلے جو بیان عدالت میں دیا اس کی ایک معتبر نقل ہم کو براؤن کے ذریعے سے ملی ہے۔ مرزا رضا خاں کے الفاظ اس کے جذبات اور ان جذبات سے شیخ کے تعلق کی ایک دلچسپ تصویر ہیں:-

"سید جمال الدین، اولادِ رسول نے کیا قصور کیا تھا کہ اس کو شاہ عبد العظیم کی محترم خانقاہ سے اس طرح ذلت کے ساتھ گھسیٹ کر نکالا گیا کہ ان کے جسم کے کپڑے تک پارہ پارہ ہو گئے۔ یہ تمام ذلت ان کو برداشت کرنا پڑی مگر انھوں نے کیا کہا تھا سوائے حق کے؟ .... جو لوگ میرے عقائد و خیالات سے اس ملک میں متفق ہیں ان کی تعداد بہت ہے اور وہ ہر طبقے کے لوگ ہیں۔ علمار کی جماعت میں، امرار میں، اہل حرفہ اور سوداگروں میں بہت سے میرے ہم خیال ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب سید جمال الدین اس شہر میں آئے تھے تو طہران اور شاہ عبد العظیم میں ہزارہا آدمی ان کے خطبات اور مواعظ سنتے تھے اور چونکہ وہ جو کچھ کہتے تھے وہ خدا کے لئے تھا اور محض مفاد عامہ کی خاطر، ہر شخص کو ان کے خطبات سے فائدہ

ہوتا تھا اوران کے مواعظ کا ہر شخص گرویدہ تھا۔ اس طرح انھوں نے بلند خیالات کا بیج لوگوں کے دلوں کی زمین میں بویا اور انسان جاگے اور ہوش میں آگئے۔ اب تو ہر شخص وہی خیالات رکھتا ہے جو میرے ہیں۔ لیکن میں قسم کھاتا ہوں اس خدا کی جس نے سید جمال الدین اور تمام انسانوں کو پیدا کیا کہ سوائے میرے اور سید جمال الدین کے شاہ کے قتل کے ارادے کی خبر کسی کو نہ تھی۔ سید تو اب قسطنطنیہ میں ہیں جو تمھارا جی چاہے کرو۔"

ناصر الدین شاہ یکم مئی ۱۸۹۶ء کو قتل کیا گیا یعنی شیخ کے ایران سے نکالے جانے کے ۶ سال بعد۔ لیکن ایران کا یہ سارا دور وہ تھا جب شیخ کا ڈالا ہوا تخم بار آور ہو رہا تھا اور شیخ قسطنطنیہ میں بیٹھے ہوئے اپنی کوششوں کے نتائج دیکھ رہے تھے۔ مرزا رضا خاں کا بیان یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ شاہ کے قتل میں شیخ کا اشارہ موجود تھا۔

ایران سے نکل کر شیخ بصرہ پہنچے اور حاجی علی اکبر شیرازی سے جو خود ایک ایرانی مہاجر تھے مشورہ کرکے لندن چلے گئے جہاں مالکم خاں نے ایرانی شہنشاہیت کے خلاف بہت زیادہ زمین تیار کرلی تھی۔ غالباً لندن جانے کا اصلی باعث وہاں مالکم خاں اور بلنٹ کی موجودگی تھی۔ ۱۸۹۱ء میں وہ لندن پہنچ گئے اور براؤن کہتا ہے کہ اس کی ملاقات پہلی مرتبہ شیخ سے ہالینڈ پارک میں مالکم خاں ہی کے مکان پر ہوئی تھی۔ اس زمانے میں انھوں نے چند جلسوں میں" ایران کے خوفناک عہد" کے عنوان سے زبردست تقریریں کیں اور اسی زمانے میں ضیاء الخافقین کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کے بہت سے اقتباسات بعد کو المنار میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ وقت تھا کہ تمباکو کے خلاف علماء کا فتوی ایران میں شائع ہو چکا تھا اور اس فتوے کا یہ اثر ہوا تھا کہ خود شاہ کے محل میں شاہی قلیان کے لئے تمباکو میسر نہ آتا تھا۔ شاہ کو پہلی دفعہ پبلک کی آواز سے مجبور ہوکر اس ٹھیکے کو منسوخ کرنا پڑا اور بلاشبہ شیخ کی یہ پہلی فتح تھی۔ علاوہ ازیں یہ فتح علماء کے لئے بھی تھی۔ ضیاء الخافقین کے صفحات پر شیخ اپنے شدید ترین جذبات کا اظہار

کر رہے تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ طہران میں شیخ کی آواز کی گرج شاہ کو لرزا رہی تھی یکم مارچ ۱۸۹۱ء کی اشاعت سے شیخ کی چند سطریں نمونتاً پیش کی جاتی ہیں:۔

"جب یہ بادشاہ، یہ زہریلا سانپ، یہ گناہگار سلطنت ایران پر مسلط ہوا، اس نے آہستہ آہستہ علماء کے حقوق میں دست اندازی کرنی شروع کی، ان کے رتبے کو گھٹانے لگا اور ان کے اثرات کو کم کرنے لگا تاکہ خود مطلق العنان ہو کر حکومت کرے اور اپنے ظلم و تعدی کے دائرے کو وسیع کر سکے .... مگر حق باطل کے مقابلے میں بلند ہوا اور اس نے شاہ کے ظلم کو کچل ڈالا جس طرح کہ ہر ظالم کا ظلم کچلا جاتا ہے ۔
اے اسلام کے رہنماؤ، میں سچ کہتا ہوں کہ تم نے اپنے عزم و استقلال سے اسلام کے وقار کو بڑھا دیا ہے، تم غیر ملکیوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ اصل طاقت تمہاری ہے جس کو وہ نہ دبا سکتے ہیں نہ نظرانداز کر سکتے ہیں مگر خطرہ سخت ہے اور حالت نازک ہے اس لئے کہ شیطانوں نے اتحاد کر لیا ہے اور اب وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے اس پر تلے ہوئے ہیں کہ اس گنہگار (شاہ) کو بہکا کر علماء کو خارج البلاد کر دیا جائے۔"

یہ مضامین وہ عموماً "سید" یا "حسینی سید" کے نام سے لکھا کرتے تھے اور جیسا کہ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ الفاظ کی سختی، درشتی اور تلخی میں ان کا قلم کچھ کفایت شعار نہ تھا! ان کے عزم اور حوصلے کی اب یہ حالت تھی کہ ایک موقعے پر انھوں نے صاف کہدیا تھا کہ "ان بادشاہوں کا تخت سے اتارنا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ پاؤں سے جوتے اتارنا۔"

تقریباً ڈیڑھ سال تک اس طرح لندن میں مشغول رہ کر وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں داخل ہوئے یعنی ۱۸۹۲ء میں سلطان عبدالحمید خاں کی دعوت پر لندن سے قسطنطنیہ چلے گئے۔ وہاں سلطان نے شیخ کے لئے ۷۵ پونڈ ماہوار وظیفہ بھی مقرر کر دیا اور ان کی مدارات میں بہت زیادہ توجہ کا اظہار کیا لیکن عبدالحمید کا شیخ کو قسطنطنیہ بلانا ایک خاص پالیسی کے ماتحت تھا۔ عبدالحمید خاں اپنے تخت و تاج کی حفاظت کے لئے اتحاد اسلامی کا ایک قلعہ تعمیر کرنا

چاہتا تھا اور خلافت اسلامی کا اشتہار دے کر وہ دنیا کی عقیدتمندی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ یورپین دول کی جانب سے جو خطرات اس کے گرد و پیش بڑھتے جاتے ہیں انکا علاج صرف یہی ہے کہ اسلامی ممالک کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوں۔ چنانچہ ان ہی منصوبوں کے تحت میں اس نے شیخ کے اثرات سے کام لے کر مکہ میں ایک انجمن کی بنیاد رکھوادی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ شیخ کو اپنے زیر اثر رکھ کر ان کے اثرات کو جو عالم اسلامی میں مسلمہ تھے اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں جب شیخ کے ساتھ اس کی توقعات بہت زیادہ وابستہ تھیں، عبدالحمید خاں ہر موقع پر ان کے بہت بڑے حامی و مددگار کے بھیس میں دنیا کے سامنے آتا تھا۔ جب ناصر الدین شاہ نے چاہا کہ شیخ کی آواز اس کے خلاف بند ہو تو اپنے سفیر کے ذریعے سے بار بار دربار خلافت میں اس امر کی تحریک کی کہ شیخ کو ان کی جدوجہد سے روکا جائے۔ چنانچہ عبدالحمید خاں نے ایک دن شیخ سے کہا کہ شاہ ایران کی مخالفت اب ترک کر دو اور "شاہ ایران آپ سے بہت خوفزدہ ہیں" اور شیخ نے بھی سلطان کی خاطر سے کہہ دیا کہ "اچھا خلیفۂ وقت کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے میں شاہ ایران کو معاف کرتا ہوں" لیکن تیر شیخ کے ہاتھ سے پہلے ہی نکل چکا تھا اور وہ شرارہ ایران میں گر چکا تھا جس نے ناصر الدین کی خرمن ہستی کو جلا دیا۔ تاہم اس واقعے سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ شیخ اور خلیفہ کے تعلقات اس وقت کیسے تھے۔ اس کے بعد بھی جب ناصر الدین شاہ قتل کر دیا گیا تو حکومت ایران نے شیخ اور بعض دیگر اشخاص کو ٹرکی سے گرفتار کر کے لیجانا چاہا لیکن سلطان عبدالحمید خاں نے اوروں کو تو گرفتار کرا دیا لیکن شیخ کی گرفتاری کی اجازت نہ دی۔ شیخ نے اس موقع پر خلیفہ کی حکومت سے پناہ نہیں مانگی نہ انھوں نے بھاگنے کی کوشش کی بلکہ غالباً وہ اس لئے مطمئن بیٹھے رہے کہ وہ سلطان عبدالحمید خاں کے منصوبوں سے بیگانہ نہ تھے اور جانتے تھے کہ سلطان کو ابھی ان کی خدمات کی ضرورت ہے۔ مکہ کی انجمن ام القریٰ کو سلطان اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے تھے اور حجاز و عراق میں شیخ کے اثرات سے کام لیا جا رہا تھا۔ لیکن بہت جلد سلطان عبدالحمید خاں کو شیخ کی رفاقت

سے مایوس ہو جاتا تھا۔ درحقیقت شیخ کا سیاسی مذہب عبدالحمید کی پالیسی کا بالکل مخالف تھا عبدالحمید خاں خلافت کے نام سے عالم اسلامی کی ہمدردیاں اپنے تخت وتاج کے ساتھ وابستہ کرکے ٹرکی کو یورپین دول کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور شیخ اول ہی سے ہر ایک تاج وتخت کے دشمن تھے۔ ان کا اتحاد اسلام بالکل دوسرے معنی رکھتا تھا۔ وہ ہر جگہ شہنشاہیت اور مطلقیت کے خلاف جذبات ملی کو بیدار کرنا چاہتے تھے اور ممالک اسلامی کی بیداری کو اپنے عالمگیر اتحاد اسلام کا سنگ بنیاد بنانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک تمام اسلامی ممالک شخصی حکومتوں کے جبر و ظلم سے آزاد نہ ہوں گے آپس میں ایک دوسرے سے کوئی عملی ہمدردی نہیں کرسکتے، اس لئے ان کو کوئی دلچسپی عبدالحمید خاں کی تحریک کے ساتھ نہیں ہوسکتی تھی۔ یورپ نے جس چیز کا نام پین اسلامزم رکھا وہ عبدالحمید خاں کا تیار کیا ہوا ایک بھوت تھا جس نے اس وقت کی سیاسیات کے لحاظ سے بعض یورپین دول کے دفاتر خارجہ کی نیندیں حرام کردیں۔ مگر یورپ میں جمال الدین کے پین اسلامزم پر کوئی عمیق نظر نہیں ڈالی گئی بلکہ ان کو صرف اسلامی ممالک کا ایک فتنہ پرداز، یورپین اثرات کا دشمن اور بادشاہوں کی بادشاہت کا مخالف سمجھا گیا۔ اس کے آگے بہت کم لوگوں کی نظر گئی اور مجھے شبہ ہے کہ خود براؤن اور بلنٹ بھی شیخ کی پرواز خیال کے ساتھ دور تک نہیں چل سکے۔ بہرحال یورپ کی اصطلاح میں خلافت اور پین اسلامزم کا جو مفہوم سمجھا گیا تھا شیخ اس سے بہت بلند، بہت دور اور بہت الگ جارہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عبدالحمید خاں بہت جلد ان سے مایوس اور بدگمان ہوگئے اور شیخ کی زندگی کا آخری زمانہ قسطنطنیہ میں ایک گمنام قیدی کی طرح گذرا۔

"بیوک مجاہد شیخ جمال الدین افغانی" کے عنوان سے اخبار وطن (قسطنطنیہ) میں چند سال ہوئے شیخ کی سیرت پر ایک مضمون شائع ہوا تھا گو شیخ کے سوانح نگاروں نے ان کی نظر بندی کی تفصیلات بیان نہیں کیں لیکن اس مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ کو عبدالحمید خاں نے اس بنا پر قید کردیا تھا کہ خلیفہ کے صیغہ جاسوسی نے اس کو یہ اطلاع دی تھی کہ شیخ سلطان

کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ اور یہ روایت بہت زیادہ قرینِ قیاس ہے اس لئے کہ عبدالحمید خاں کی سیاست کا اس زمانے میں یہی رنگ تھا کہ وہ اپنے سایہ سے بھی ڈرتے تھے اور شیخ کے متعلق شبہات کا نہ پیدا ہونا پیدا ہونے سے زیادہ تعجب انگیز ہوتا۔ بہر حال اس زندگی کی مختصر روداد ختم ہوتی ہے۔ میں نے شیخ کے علم و فضل، قرآنی مشاغل، فلسفیانہ خیالات، عقائد مذہبی اور ان کی سیرت کے بہت سے ضروری پہلوؤں کے لئے ان مختصر صفحات میں گنجائش نہ پائی اور نہ میں اپنے سننے والوں کو بہت زیادہ تھکانا چاہتا ہوں۔ وہ خبریں سب اپنے موقع پر بیان ہوں گی، بار بار بیان ہوں گی، ہزار دفعہ بیان ہوں گی، شاید کہ شیخ کی زندگی کا کوئی ایک نکتہ کسی حق شناس تک پہنچ جائے! میرے پاس ان کے مضامین اور ان کے خطوط کا ایک اچھا مجموعہ ہے جو بجائے خود ایک دلچسپ علمی دعوت کا سامان مہیا کرے گا، لیکن اس کے لئے کوئی دوسری فرصت درکار ہے۔

ایران میں جو جسمانی سختیاں شیخ نے برداشت کی تھیں ان کا بہت زیادہ اثر شیخ کی صحت پر ہو چکا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ایران سے آنے کے بعد پھر وہ اپنی کھوئی ہوئی صحت کبھی حاصل نہ کر سکے۔ قسطنطنیہ میں وہ اکثر بیمار رہتے تھے اور بالآخر دورانِ نظر بندی میں ان کو سرطان کا لاعلاج عارضہ لاحق ہوا۔ اس مرض کے سلسلے میں تین مرتبہ ان کے چہرے اور گردن پر عمل جراحی کیا گیا، لیکن اپنے رب کے پیام پر لبیک کہنے کا وقت آ چکا تھا۔

۹ مارچ ۹۷ء کو اس مجاہد کی زندگی کا کام ختم ہو گیا اور قسطنطنیہ کی سرزمین پر اس نے اپنی آخری منزل کو پا لیا۔ اب یہ بحث دور از کار ہے کہ جمال الدین کو عبدالحمید خاں نے زہر دلوا دیا تھا یا نہیں۔ جتنا کام قسامِ ازل نے ان کی سپرد کیا تھا وہ اس کو انجام دے گئے، دنیا والے اب جس قدر جی چاہے اس پر تنقید و تبصرے کے دریا بہا دیں، لیکن بیداریٔ مشرق کے اس بہت بڑے پیامی کا نام اس وقت تک دنیا میں روشن رہے گا جب تک کہ دنیا آباد ہے۔ اہل نظر کے لئے یہ ایک سبق آموز داستان ہے۔

نشان تاش کے قریب ایک قبرستان میں شیخ کی قبر عرصے تک بے نشان رہی، انکے

جنازے کے ساتھ بھی ۲۰ آدمیوں سے زیادہ نہ تھے لیکن دنیا ان کو بھولی نہ تھی۔ ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا کہ ہم خود اپنے ملک کے مشاہیر کو مرنے کے بعد ایک ہفتے کے اندر بھول جاتے ہیں لیکن تعجب تو یہ ہے کہ شیخ کی زندگی کا زیادہ سرمایہ مغرب میں محفوظ رہا اور عبدالحمید کے بعد ترکوں نے انکی آخری آرام گاہ کو پھر ڈھونڈھ نکالا۔ ایک امریکن کروڑپتی نے ان کی قبر کے لئے سنگ مرمر کا ایک خوبصورت پتھر تیار کرا کر بھیجا تو ایک نوجوان ترک نے ایک غیر ملکی کی اس فیاضی سے متاثر ہو کر قسطنطنیہ کے ایک اخبار میں لکھا کہ :-

"میں نے ایک اخبار میں پڑھا ہے کہ ایک امریکن مسٹر کرآین نے اس بڑے مسلمان عالم کے لئے ایک نہایت شاندار سنگ مرمر کا مزار بنایا ہے۔ یہ امریکن کروڑپتی ہے مگر اس کی تازہ ترین قدرشناسی نے نہ معلوم کیوں میرے دل میں مسرت اور افسوس سے ملی ہوئی ایک حس پیدا کی۔ جمال الدین افغانی کے لئے ایک محتشم و شاندار مزار کا بنایا جانا حقیقتاً ایک ایسا اچھا کام ہے جس سے روح تسلی پاتی ہے۔ جمال الدین اپنی تمام زندگی میں دنیادی جاہ و جلال سے بے پرواہ رہا اور اپنی متواضع زندگی کے شایان اسی کو سمجھا کہ اپنی قبر کے لئے دو گز زمین سے زیادہ نہ لے۔ اس میں فراعنہ مصر کا غرور نہ تھا کہ اپنی لاش کی حفاظت کے لئے اہرام بنوائے۔ اس لحاظ سے ایک محتشم مزار کا بنایا جانا اس کے اعزاز میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ مگر انصاف شرط ہے۔ کیا اس کی یادگار کی مرمت کے لئے اس قدر اہتمام بھی اس کے مداحین پر لازم نہ تھا؟...
.....میں اس سے تو خوش ہوں کہ جمال الدین کا مزار اس کی ایک مادی یادگار ہوگا مگر میرے قلب کے ایک گہرے اور معزور گوشے میں ایک خفیف ٹھیس لگتی ہے اور میرا دل سوال کرتا ہے کہ جمال الدین کے مزار کو ایک ترک ایک افغان یا ایک ایرانی نے (جسے جمال الدین کے ایرانی ہونے پر بہت اصرار رہتا ہے) کیوں تعمیر نہ کرایا۔"

یہ تو ایک ترک کا جذبہ تھا، میں اپنے ہم وطنوں سے کیا کہوں۔ ان میں سے کتنے ہیں جو قسطنطنیہ جاتے ہیں اور وہاں کبھی جمال الدین کی قبر پر دو پھول چڑھانے کا ارادہ کرتے ہوں۔

اپنے آخری لمحوں میں جب زبان بند تھی اور چند آنسو بہانے والے دوست بستر مرگ کے قریب بیٹھے تھے، اس نے ہاتھ کے اشارے سے حلقہ بنا کر کہا تھا کہ "میں مرجاؤں گا اور میری آنکھیں اسی طرح کھلی رہیں گی جس طرح تم دیکھتے ہو"۔ جو الفاظ شیخ نے اپنے مرنے سے چند روز پہلے اپنے محبس سے ایک دوست کو لکھے ان ہی کو میں ان سطور کا خاتمہ بناتا ہوں کہ وہ ان کے آخری جذبات کا بہت دردناک مرقع ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ:۔

"من بسر موقعے ایں نامہ را بدوستِ عزیز خود می نویسم کہ در محبس محبوس و از ملاقات دوستان خود محروم، نہ انتظار نجات دارم، نہ امید حیات۔ نہ از گرفتاری متالم نہ از کشتہ شدن متوحش، خوشم برایں حبس و خوشم برایں کشتہ شدن۔ حبسم برائے آزادیٔ نوع، کشتہ می شوم برائے زندگیٔ قوم"

مجاہد حق کی یہ آواز حق تھی اور یہ جذبۂ عالی تھا جو آندھی بن کر اٹھا، بجلی بن کر چمکا اور اس طرح گرجا کہ مشرق کی سوتی ہوئی دنیا کروٹیں لینے لگی۔ آج وہ نہیں ہے مگر اس کا پیام باقی ہے۔

مولانا محمد علی مرحوم کا ایک خط

(قاضی عبدالغفار صاحب کے نام)

Chhindwara,

(C. P.)

۱۵ر دسمبر ۱۹۱۵ء

برادر عزیز۔ السلام علیکم۔

زندہ رہو۔ خوش رہو۔ تمہارا کام روز دل کو خوش کرتا ہے۔

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
وآنا رکھے آباد اں ساقی تری محفل کو

پہلے تمہارے سوالات کا جواب دیتا ہوں پھر راستے کی مختصر سی سرگذشت سناتا ہوں بشرائط یہاں بھی بجنسہ وہی ہیں جو لینسڈون جاتے وقت غازی آباد اسٹیشن پر صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔ یہاں کی آب و ہوا اچھی ہے مگر ہم جب یہاں پہنچے تو خلاف وقت کچھ بارش ہو رہی تھی۔ غالباً اسی کے باعث میرے اعضا میں پھر درد ہو گیا اور گو اب کم ہے مگر گھٹنوں میں اور کسی قدر کمر میں باقی ہے۔ حکیم صاحب نے حبوب گل آکھ کا استعمال بتایا تھا۔ اسے پھر جاری کیا ہے مگر بظاہر اس سے فائدہ نہیں ہوا۔ چند دنوں بعد پھر رجوع کروں گا۔ پیشاب دن کو تو کم آتا ہے، فجر اور ظہر کے درمیان ایک یا دو بار، ظہر سے مغرب تک اور بعض دن عشا تک ضرورت نہیں ہوتی۔ شب کو البتہ کوئی تین بار آتا ہے بگر دو بار تو معمول ہی تھا۔ بظاہر شکر نہیں آتی۔

کلکتے کی زندگی کے متعلق جو تم لکھتے ہو اس پر مجھے ذرا تعجب نہیں۔ عجب ملک ہے مسلمانوں میں سخت نا اتفاقی ہے۔ حسد اور کینے کی شدت ہے محسنوں کا احسان ماننا کجا الٹا پریشان

کرتے ہیں۔ مدرسے اور کالج والے پھر بھی ہونہار ہیں۔ ان سے ضرور ملتے رہنا اور چونکہ ہمارا انحصار زیادہ تر آئندہ نسلوں پر ہے اس لئے ان کو قومی سانچے میں ڈھالتے رہنا۔ محسن فنڈ کے متعلق واقعات سے اپنے کو کما حقہٗ آگاہ کر لو اور مسلمانوں کے مجوزہ کالج کی گذشتہ تاریخ سے۔ افسوس ہے کہ شمس الہدیٰ نے ابتک کچھ نہیں کیا اور اس کم بخت دلی والے مولوی کو رکھ کر مدرسہ بھی تباہ کیا۔ ہوگلی کالج میں فدا علی خاں رام پوری کالج کے ایم۔ اے میرے کلاس فیلو اور عزیز دوست عربی کے پروفیسر ہیں ان سے ضرور جا کر ملنا، جا کر گاہے گاہے مل لیا کرو یا اتوار کو انھیں بلا لیا کرو۔ سلطان معقول شخص ہے اس سے ضرور دوستی ہوگئی ہوگی۔ مگر ہماری ہے کلکتے کو اس پر کیا فخر۔ رسول اصول کا پکا ہے اور محبوب الرحمٰن بھی مگر یہ لوگ بھی کلکتے کے اثرات سے محفوظ نہیں ہیں۔ بہرحال ان سے مدد ملے گی۔ میرا ایک دوست محسن عجائب خانے میں ہے اس سے غالباً ملاقات ہوئی ہوگی۔ معین الدین مرزا گھاگرے والے کالج کے پرانے طالب علم ہیں ان سے ملتے رہنا۔ خدا کرے کم بخت .... کا اس پر زیادہ اثر نہ پڑا ہو۔ مولوی نجم الدین صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر نہایت سچے مسلمان ہیں ان سے ملتے رہنا۔ ان کے بھتیجے قطب الدین پر لوگ شبہ کرتے ہیں مگر مولانا خود بالکل غیر مشتبہ ہیں۔ کولوٹولے میں حاجی اسمٰعیل صاحب دہلوی معروف بہ بیٹنے والے ان بزرگوں میں ہیں کہ اگر ہندوستان میں ایسے دس بیس ہوتے تو ہماری حالت اس قدر زبوں نہ ہوتی۔ اس قدر فیاض، سیر چشم، محب قوم بلکہ ہمدردِ بنی نوع انسان بہت کم لوگ ہیں۔ اللّٰھم زد فزد۔

Haonoo Bhayya اور Uncle Sharaf سے ملاقات ہوئی یا نہیں۔ دونوں ہائی کورٹ کے جج ہیں حسنو تو سنا ہے جنوری میں مستعفی ہو کر پٹنے میں پریکٹس کریں گے۔ خیر ججی میں دھاک خوب بٹھا دی ورنہ ہر سال ساٹھ ستر ہزار کا نقصان اٹھانا پڑا۔ مسٹر جسٹس شرف الدین بیچارے زیادہ قابل نہیں مگر وضع کے پابند اور بہت خلیق ہیں۔ یہ پٹنہ ہائی کورٹ کے جج ہو کر جائیں گے۔ حسنو نے اس شرط پر ججی قبول کی تھی کہ پٹنے میں ہائی کورٹ ہو تو ضرور بھیجا جاؤں۔

مگر نہ ان کے ساتھ وعدے کا ایفا ہوا نہ علی آمام بھائی کے ساتھ۔ مؤخرالذکر کو میرے علم میں منٹو نے چیف جسٹس کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اب ہارڈنگ نے بھی باوجود اس قدر دوستی کے اور باوجود ان خدمات کے جو علی آمام نے دکھائیں صرف ججی پیش کی۔ لطف یہ ہے کہ خود ان کے ...... نے ان کے خلاف کارروائی کی۔ یہ وہ شخص ہے جسے انھوں نے اپنے سے پہلے Knighthood دلوادی تھی۔ ہل جزاء الاحسان الا الاحسان۔

راستے کی کیفیت سنو۔ پہلے اطلاع شروع نومبر میں ملی تھی کہ تیار رہو۔ ایک دن پہلے اطلاع دی جائے گی۔ اسی وقت روانہ ہونا پڑے گا۔ ہم نے شروع اکتوبر ہی میں لکھ دیا تھا کہ ہمارا الاؤنس بے باق کردینا ہوگا اور زادراہ کا انتظام کرنا ہوگا ورنہ ہم وقت مقررہ پر نہ چل سکیں گے۔ اب اطلاع پاتے ہی پھر اس کے متعلق یاددہانی کردی مگر باوجود سرکاری تار کے اور ہمارے تار کے ہمارا الاؤنس ۲۰ دن کا ۲۰ نومبر تک نہ مل سکا۔ دو دن بعد لینسڈون پہنچا اور وہاں سے یہاں آیا۔ بھلا ہو ایک Old boy کا کہ ان سے قرض لے کر وہاں کے حسابات چکائے اور وہاں کے نوکروں کی تنخواہ ادا کی۔

سفرخرچ کی کیفیت سنئے کہ حکم ایسے خزانے کے نام دیا گیا جو عالم وجود میں بھی نہ آیا تھا یعنی Lansdown Treasury۔ خزانہ پاؤری میں ہے جو ضلع گڑھوال کا صدر مقام ہے اور پیدل کم از کم دو دن کی راہ ہے۔ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو جس کے متعلق ہماری ڈاک کا دیکھنا تھا فوجی افسروں کی معرفت بنیے سے روپیہ قرض لینا پڑا ورنہ ہم لوگ چل بھی نہ سکتے۔

اس خوش انتظامی کے صدقے جائیے۔ مقام کا نام پہلے سے نہیں بتایا گیا تھا۔ ہم نے جب لکھا کہ موسم کے متعلق تک ہم کو علم نہیں ہے۔ جاڑوں وغیرہ کے کپڑے سب دہلی یا رام پور ہیں، دوسرے اس کا فیصلہ کرنا ہے کہ مع اہل وعیال کے جائیں یا بلا ان کے۔ اس کا انحصار مقام کی نوعیت اور دوری پر ہے۔ تو جواب ملا کہ موسم ایام سرما میں دہلی جیسا ہے۔ اس سے خیال ہوا کہ مقام کو سات پردوں میں رکھا جائے گا۔ لیکن یکایک ۱۳ نومبر کو اطلاع ملی کہ ۲۰ نومبر

کو چھندواڑہ جانا ہوگا۔ نہ معلوم وہ رازداری اور تعجیل (۲۴ گھنٹے کا نوٹس) کہاں سے چلا ہے اس اطلاع کے ملنے پر ہم نے چند کارڈ دوستوں کو ڈال دئے کہ فلاں راہ سے فلاں وقت گذریں گے۔ سنسر نے بلا استثنا سب کو بھیج دیا اس لئے کہ اس میں بظاہر کوئی مضائقہ نہ تھا۔ الہ آباد میں گاڑی سات گھنٹے بعد ملتی تھی اس لئے بھائی ظہور رے(دساوات) کو لکھ دیا کہ برادرانم کھانا تمہارے ساتھ کھائیں گے والدہ، بیوی اور بچوں کے لئے ایک گاڑی کا انتظام کردینا کہ الہ آباد جو انھوں نے نہیں دیکھا ہے دیکھ لیں۔ چنتامنی کو لکھ دیا کہ تم سے، سپرو سے اور پنڈت جی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ چلنے سے ایک دن پہلے اطلاع ملی کہ جو سب انسپکٹر ہمراہ جائیگا اُسے ہدایت ملی ہے کہ ہماری پارٹی کا کوئی متنفس کسی اسٹیشن کے باہر نہ جائے۔ گو ہمارے نام کوئی حکم نہیں آیا تھا یعنی جو حکم آیا تھا اس میں یہ شرط نہ تھی۔ اس لئے اس پر کاربند ہونا لازمی نہ تھا اور ہم نے صاف کہہ دیا کہ گورنمنٹ نے ہم کو نظر بند کیا ہے ہمارے متعلق ہدایات جاری کی جاسکتی ہیں مگر ہمارے متعلقین بفضلہ تعالیٰ آزاد ہیں، وہ کسی شرط کو نہیں مان سکتے۔ تاہم ہم نے ارادہ کرلیا کہ الہ آباد اسٹیشن پر رہیں گے باہر نہ جائیں گے۔

ہم ۲۰ کو ۱۰ بجے صبح کے روانہ ہو کر تانگوں میں چلے اور ۲ بجے سہ پہر کو کوٹ دوارہ پہنچے۔ یہاں صبح ہی سے میری ہمشیرہ (والدۂ فاروق) معہ عثمان کے اور شوکت کے بچوں کے ملیں۔ دہلی سے صادق اور سید علی بھی آئے تھے۔ ہمارے ماموں صاحب کے خلیفہ نوشہ میاں صاحب اور ہمارے ماموں زاد بھائی بھی آگئے تھے۔

۴ بجے شام کو ریل چلی۔ ۷ بجے نجیب آباد پہنچے۔ حالانکہ ہم نے کسی کو اطلاع نہ دی تھی مگر لوگوں کو معلوم ہوگیا تو رات کے ۹ بجے تک لوگ جوق جوق آتے رہے اور ملتے رہے نجیب آباد میں چند اور اعزا اور احباب دہلی اور علی گڑھ سے آگئے۔ ۲ بجے صبح کے ان کی معیت میں مراد آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ ۴ کے قریب پہنچے۔ وہاں آنریبل سید رضا علی، یعقوب، مسعود، عبدالسلام وغیرہ تمام احباب ملنے آئے۔ رام پور سے میری اہلیہ معہ حمیدہ اور گلنار اور زاہد کے آگئے تھے، وہ

شریک سفر ہوئے۔ ان کے علاوہ رام پور سے بہت سے عزیز اور دوست آگئے تھے۔ منّ وسلویٰ آئے کوٹ دوارہ ہی پر اترنا شروع ہوگیا تھا۔ مرادآباد پر اور نازل ہوا۔ رام پور صبح کے ۵ بجے پہنچے۔ وہاں پر بھی ہجوم تھا۔ حالانکہ گاڑی تین چار منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ہمارے لئے ایک Composite Carriage تھی اس میں توہم نے عورتوں کو سوار کرادیا تھا۔ خود معہ احباب کے ایک انٹر کی خالی کیرج کو لبالب بھر دیا تھا۔ بریلی پر علی گڈھ کے احباب رخصت ہوئے۔ انصاری رام پور سے مرادآباد آگئے تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن دہلی سے نجیب آباد آگئے تھے اور مرادآباد میں انصاری کے ہمراہ دہلی چلے گئے۔ بریلی میں بھائی ددّو وغیرہ چائے لے کر آئے تھے شاہجہانپور میں بھی احباب ملے اور سنڈیلہ میں بھی۔ لکھنؤ پہنچے تو گاڑی خلاف معمول پل کے اس طرف پلیٹ فارم پر رکی مگر اس کے رک جانے کے بعد بہت سے احباب مع تقدس مآب مولانا عبدالباری صاحب قبلہ و مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی مدظلہ تشریف لائے۔ قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ معلوم ہوا کہ خواہش نہ تھی کہ لوگ کثرت سے ملیں مگر چونکہ یہ منشا نہ ہمارا تھا نہ ہمارے دوستوں کا تھا کہ ایک جم غفیر کو نمائش کے لئے جمع کیا جائے اس لئے وہی اصحاب آئے تھے جن کو ہم نے اطلاع دی تھی یا دلوائی تھی۔ کانپور سے، علی گڈھ سے اور بارہ بنکی سے احباب آئے تھے۔ راستے کے لئے کھانا، میوہ اور مٹھائیاں اس کثرت سے آئیں کہ دونوں درجے لبالب بھر گئے اور بیٹھنے کو جگہ نہ رہی۔ بلامبالغہ تین چار سو آدمیوں کے لئے کھانے کا سامان کافی تھا۔ راستے بھر لوگوں کو کھلاتے آئے پھر بھی ختم نہ ہوا اور یہاں تین چار دن کھایا اور بعض چیزیں تو اب تک ساتھ دے رہی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ کھانوں کی نوعیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض رسمًا تیار نہیں کرائے گئے تھے، بلکہ سوچ سوچ کر یہ مزے کی چیزیں خود تیار کی تھیں۔ مولانا عبدالباری صاحب قبلہ معہ متعدد احباب لکھنؤ و بارہ بنکی و علی گڈھ کے راستے بریلی تک ہمراہ تشریف لائے۔ مولانا الہ آباد کا قصد رکھتے تھے مگر وہاں جاتے تو ایک دوست چند دن رکھے بغیر نہ چھوڑتے اس لئے راستے ہی سے واپس ہوگئے کیونکہ زیادہ قیام کے لئے وقت نہیں بچا سکتے تھے۔ مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے سے بزرگ ہیں۔ ان پر عجب کیفیت طاری تھی۔ ان بزرگوں کی تحسین ہر لمحہ ہم کو شرمسار کرتی تھی۔ برادرم ہزاروں سپاہی اور افسر اپنی اپنی قوم اور ملک کے لئے بے دریغ جانیں دے رہے ہیں۔ جو اپنے ملک و قوم اور مذہب کے لئے سر بکف نہیں ہیں وہ بھی ایک حقیر سے مشاہرے کے لئے جانیں دے رہے ہیں۔ ہم نے جن کا اس قدر غلغلہ چار دانگ عالم میں ہے ابھی کیا کیا ہے کہ مولانا عبدالباری صاحب اور مولانا محمد ابراہیم صاحب جیسے بزرگ ہمارا استقبال فرمائیں اور تحسین و آفریں کریں یا ہمارے بے شمار دوست اتنی محبت کا اظہار کریں۔ صرف یہی تو ہوا ہے کہ اپنے وطن اور کاروبار کو خیرباد کہنا پڑا لیکن یہ سنت رسولؐ ہے۔ فجر کے فرضوں سے پہلے دو رکعتیں پڑھنا تو ہر مسلمان اپنے اوپر لازم سمجھے اور ہجرت کو گوارا نہ کرے، یہ کس قسم کا اسلام ہے۔ اور خصوصاً اُس حالت میں جبکہ ہمارا پروردگار ہم کو تشفی و تسلی دے کہ وَاللہُ عَلیٰ نصرہم لقدیر الذین اخرجوا من دیارہم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ (پروردگارا تونے سچ فرمایا ہے۔ تو ہی ہمارا مولیٰ ہے اور تو ہی خیرالناصرین ہے)۔ برادرم اس سفر سے پیشتر بھی اور اس سفر میں اور ہر جگہ جو خاطر و مدارات ان نظربندوں کی ہوئی ہے اس کے بعد کس کو شک ہو سکتا ہے کہ علاوہ اس اجرِ عظیم کے جس کی بشارت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم (روحی فداک یا رسول اللہ) دینے ہم کو آئے تھے جو تہِ عاقبت اندیش کو ملے گا خود اس دنیا میں عزت و آرام بھی پابندیٔ قرآن و حدیث میں ہی ہے۔ معظم کے والد (میرے خسر) نے کیا خوب کہا ہے ؎

عظمت بڑے بڑے ہیں مزے راہِ عشق میں
چل تو سہی۔ بڑھا تو قدم۔ دیکھ تو سہی

ناظر، وسیم، ولایت کو ہم الہ آباد تک لے گئے کہ، گھنٹے وہاں بھی خوب گذریں گے۔ اتفاقاً راستے میں آنریبل ڈاکٹر سپرو سے بھی ملاقات ہوگئی کیونکہ وہ ہم سفر تھے اس طرح الہ آباد کی) قدم بندی کا بھی صدمہ نہ ہوا۔ الہ آباد سے چند اسٹیشن آگے مولانا رؤف صاحب (والد ظہور) ملے اور چند اور اصحاب بھی ملے۔ آگے چل کر خود ظہور اور لکھنؤ کے سید ظہور احمد صاحب بھی ملے۔ آگے چل کر

معلوم ہوا کہ الہ آباد کے اسٹیشن پر جاتے ہوئے پرندوں کے پر جلتے ہیں۔ پلیٹ فارم ٹکٹ بند اور اسٹیشن خالی ہے اور غالباً ہم کو ۲ گھنٹے سے قبل ہی وہاں سے کہیں اور لے جائیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ پولیس کے سو سوا سو آدمی پہرہ دے رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ الہ آباد کے لوگوں نے اسٹیشن پر ہمیں garden party دینے کی اجازت چاہی تھی مگر اجازت نہ ملی۔ مجبور ہو کر ظہور کچھ میوہ اور کھانا اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کو دے آئے کہ اسے دیکھ بھال لو۔ اگر کوئی چیز خلاف قانون دستیاب نہ ہو تو ان نظر بندوں کو دے دینا۔ الہ آباد کے اسٹیشن کو سوائے پولیس کے وردی والے و بلاوردی کے خالی پایا۔ پولیس کے دو افسر ایک وردی میں ایک بلاوردی کے طبقۂ یورپین یا یوریشین سے موجود تھے۔ دونوں شوکت کے شناسائی اور ایک تو دوست نکلے۔ تھوڑی دیر بعد ایک ذات شریف نہایت کروفر کے ساتھ تشریف لائے اور پہلے اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ ان لوگوں کو اسٹیشن سے نکال دو۔ یہ لوگ ڈاکٹر ناظر الدین حسن، مسٹر محمد وسیم، مسٹر ظہور احمد بیرسٹران و سید ظہور احمد صاحب بی۔ اے وکیل و شیخ ولایت علی صاحب بی۔ اے وکیل تھے۔ میں ان کی سلامت روی اور متانت کی تعریف کروں گا کہ باوجود سخت غصے اور مایوسی کے وہ خاموشی کے ساتھ چلے گئے۔ چلنے سے پیشتر والدہ نے انھیں بلایا اور گلے لگایا اور کہا کہ بیٹا ان باتوں سے آزردہ خاطر نہ ہونا۔ مرد ان آزمایشوں میں سے ہنستے بولتے گذر جاتے ہیں۔ ہم بھی ان سے رخصت ہوئے۔ اس کے بعد وہ ذات شریف ہماری طرف تشریف لائے اور کہا کہ آپ اپنی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ یہ درخواست شوکت کے دوست پہلے ہی کر چکے تھے مگر ناکام رہے تھے۔ شوکت نے کہا کہ اس کی آخر کوئی وجہ۔ کہا میں آپ سے کہتا ہوں آپ ایسا ہی کریں۔ ہم نے جواب دیا کہ ہم وہیں تک پابند ہیں جہاں تک گورنمنٹ کے احکام موصول ہو چکے ہیں ورنہ ہم بالکل آزاد ہیں اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اتنے لانبے سفر کے بعد ایک تنگ کمرے میں مقید ہو کر بیٹھ جائیں۔ ہمیں یہاں سات گھنٹے قیام کرنا ہے۔ اس پر صاحب موصوف بولے کہ نہیں آپ کو ساڑھے پانچ بجے کی ایک گاڑی میں یہاں سے ستنہ جانا پڑے گا اور وہاں چند گھنٹے تک شب کی گاڑی کا انتظار کرنا پڑے گا جو یہاں سے جبلپور کو تھرو جاتی ہے۔ ہم نے

کہا کہ ہمارے احکام میں یہ داخل نہیں ہے۔ ہمیں احکام ملے ہیں کہ تین بجے کی گاڑی میں الہ آباد پہونچیں اور شب کے دس کی ٹرین میں جبلپور جائیں۔ اس پر وہ بولے کہ نہیں گورنمنٹ نے احکام بدل دئے ہیں۔ آپ کو ابھی جانا ہوگا۔ اس پر ہم نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی احکام اس قسم کے موصول نہیں ہوئے ہیں۔ جو حکم ہم کو ملا ہے اگر ہم اسکی خلاف ورزی کریں گے تو ہم تین برس کی قید بامشقت اور ایک ایک ہزار روپئے جرمانے تک کے مستوجب ہوں گے۔ اس پر فرمایا کہ میں آپ سے کہتا ہوں کہ یہی احکام گورنمنٹ کے ہیں۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ حضور والا کی شناسائی کا بھی ہم کو شرف حاصل نہیں ہے۔ پھر ہم تحریری اور مہر حکومت سے مزین احکام کی عوض محض آنجناب کی زبانی ہدایت کو کیوں کر قبول کرلیں۔ فرمایا کہ میرا نام Murray ہے اور میں یہاں D.T.S. ہوں اور اس اسٹیشن کا چارج میرے پاس ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں آپ سے مل کر محظوظ ہوا مگر اس شرف نیازمندی کے حصول کے بعد بھی ہم سرکاری احکام پر آپ کے ارشادات کو ترجیح نہیں دے سکتے۔ اس پر تیکھے پن سے فرمایا کہ کیوں بے فائدہ بدمزگی پیدا کرتے ہو۔ میں نے تم سے نہایت نرمی سے کہہ دیا کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں نے جواب دیا کہ اس میں بدمزگی کا سوال کچھ بھی نہیں ہے اور میں نے اس قدر نرمی سے آپ سے کہہ دیا کہ ہم گورنمنٹ کے احکام کے خلاف کچھ نہیں کرسکتے۔ اس پر نہایت تند و ترش ہوکر فرمایا کہ کیوں اسی راگ کو الاپے جاتے ہو۔ اس پر شوکت نے آنکھیں دکھا کر کہہ دیا کہ بس اس لہجے میں گفتگو نہ کیجئے۔ اس پر ذرا ہوش میں آئے اور پھر کہا کہ بدمزگی کیوں پیدا کرتے ہو میں تو نہایت نرمی سے کہتا ہوں کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ شوکت نے کہا کہ آپ کی درخواست معقول نہیں ہے میں بھی آپ سے نرمی سے کہتا ہوں کہ ہم سے تعرض نہ کیجئے اور یہاں سے چلے جائیے۔ اس پر حاکمانہ انداز سے فرمایا کہ تم مجھے مجبور کرتے ہو کہ میں اپنے احکام کی تعمیل بجبر کراؤں۔ شوکت نے کہا شوق سے آپ ضرور کوشش کریں مگر برادرم ساڑھے تین من کی لاش اور سوا چھ فٹ کے قد اور ڈیڑھ گز کے سینے والے سے جبریہ تعمیل احکام کرانا آسان نہیں۔ دیکھ کر بولے کہ میں سمجھا تھا کہ آپ لوگ gentlemen ہیں۔ اس پر میں نے عرض کی

کہ ہم سمجھتے تھے کہ آپ بھی gentleman ہیں مگر........ اس "مگر" کے اضافے نے ان بزرگوار کو چکرا دیا۔ پھر کہنے لگے کہ اب میں جبریہ تعمیل کراؤں گا۔ شوکت نے کہا کہ ہم تو کہی رہے ہیں کہ شوق سے کوشش فرمائیے۔ اس قدر گفتگو کے بعد دوسرا پولیس انسپکٹر جو وردی میں تھا آیا اور اس نے کہا کہ جناب والا اس مسئلہ کو آپ ہمیں پر چھوڑ دیجئے۔ مسٹر Murray جن کے initials "P.G" ہیں اور جن کو بقول پولیس انسپکٹر کے Pig Murray کے لقب سے لوگ ملقب کیا کرتے ہیں اس موقع کو غنیمت سمجھ کر بیک بینی و دوگوش جدھرسے تشریف لائے تھے ادھر کو واپس تشریف لے گئے۔ ہم سے پولیس انسپکٹر نے کہا کہ کچھ مضائقہ ہے اگر آپ انھیں کا کہا کرلیں یہ بھی شوکت کا شناسائی تھا۔ شوکت نے جو جواب پہلے انسپکٹر کو دیا تھا وہی اس کو بھی دیا کہ بھائی یہ معاملہ ہمارے تمہارے نج کے تعلقات کا نہیں ہے۔ سرکاری احکام کا ہے۔ ہم معذور ہیں اور جو آزادی اس نظربندی میں باقی رہ گئی ہے ہم قدرتی طور پر اس کی پہلے سے بھی زیادہ قدر کرتے ہیں۔ ہم ہرگز بلا حکم سرکار کوئی کام اپنے خلاف مرضی نہیں کریں گے۔ دوسرے ہمارے معزز ترین احباب کو جس بے جی پن کے ساتھ اس شخص نے یہاں سے جانے کے لئے کہلوایا ہے اس کے بعد ہم سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے مشہور ترین رہنما اور قائم مقام ہیں۔ جو صدمہ ان کو ہوا ہوگا وہ ہمیں محسوس کرسکتے ہیں۔ اس پر پولیس کے دونوں افسروں نے اعتراف کیا کہ اس شخص کا طرز عمل نہایت بے جا تھا اور علاوہ ازیں اسے اس امر سے کچھ بھی سروکار نہ تھا۔ بلا وجہ گھس پڑا اور حکومت جتانے لگا۔ جو پولیس انسپکٹر (Garvin) ہمارے ہمراہ کوٹ دوارے سے آیا تھا جب وہ موقع پر آیا تو اسے بھی بہت برا معلوم ہوا کہ بلا اس کی اطلاع و مشورے کے مسٹر Pig Murray نے دست اندازی کی اور سب خوش تھے کہ خوب منہ کی کھائی۔ اس کے بعد ہم Waiting-room گئے اور وضو کرکے ظہر اور بعدازاں عصر پڑھی۔ نماز سے فارغ ہی ہوئے تو اطلاع ملی کہ شوکت کے پرانے دوست اور میرے بھی کلکتے کے "گہرے شناسا" مسٹر Fremantle کلکٹر الہ آباد ملنا چاہتے ہیں۔ ہم گئے تو ہم سے کہا کہ یہ کیا جھگڑا ہے۔ شوکت

نے تمام کیفیت سنائی۔ اس پر کہا کہ مجھے دو تین دن سے معلوم تھا کہ تمہارے سفر کا پروگرام یہاں سے بدلا جائے گا۔ نہ معلوم تمہیں احکام کیوں نہیں دئے گئے۔ بہرحال میں گھر سے چلتے وقت Burn (چیف سکریٹری) سے ٹیلیفون پر پوچھ آیا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ لوگوں کو ساڑھے پانچ ہی پر چلنا ہوگا۔ ہم نے کہا کہ پھر گورنمنٹ کے احکام کی خلاف ورزی کا کون ذمہ دار ہے۔ ہم برن کے تحریری اور مہردار احکام مانیں یا زبانی احکام جو آپ سے سننے میں آئے ہیں۔ اس پر کہا کہ برن کہتے ہیں کہ پروگرام تو احکام کا جزو نہ تھا صرف تمہاری سہولت کے لیے ہم رشتہ کر دیا گیا تھا۔ اس پر میں نے کہا کہ اگر وہ جزو احکام نہیں ہے تو ہم بیل گاڑی یا گھوڑے پر چھندواڑہ جا سکتے ہیں اور پانچ چھ ماہ کے عرصے میں پہنچ جائیں تو مضائقہ نہیں، اس لیے کہ اگر پروگرام جزو احکام نہیں ہے تو ہمیں صرف اس قدر حکم ملا ہے کہ ۲۰ کو لینسڈ ڈون سے بلا سفر توڑے ہوئے چھندواڑہ پہنچ جاؤ۔ یہاں بھائی Fremantle پھر قائل ہوئے اور کہا کہ بہرکیف اب تو یہی حکم ہے۔ شوکت نے کہا کہ قاعدے کی رو سے چیف سکریٹری کا دستخط شدہ حکم ملنا چاہئے لیکن چونکہ میں تم سے واقف ہوں اس لیے تسلیم کئے لیتا ہوں کہ تم وہی کہتے ہو جو چیف سکریٹری نے تم سے ٹیلیفون پر کہا ہے تاہم اسے ضبط تحریر کردو تاکہ برن تین برس کی قید کرانا چاہیں تو سند ہو اور وقت ضرورت کے کام آئے۔ کہا ہاں مضائقہ نہیں ہے میں لکھ دوں گا کہ برن نے مجھے ہدایت کی ہے۔ اس پر میں نے کہا یہ لکھئے کہ گورنمنٹ نے ہدایت کی ہے۔ کہا ہاں چیف سکریٹری ہی کے دستخط سے گورنمنٹ کے احکام جاری ہوتے ہیں اس پر میں نے کہا کہ یہ درست ہے مگر یہاں تو احکام آپ کے دستخط سے جاری ہوں گے۔ کم از کم حکم لفٹنٹ گورنر کا ہونا چاہئے۔ برن کو بحیثیت چیف سکریٹری گورنمنٹ کے احکام پر دستخط کرنے کا حکم ہے مگر وہ خود حکم دینے کے مجاز نہیں ہیں۔ پچھلا حکم ان کا دستخطی گورنمنٹ کی مہر والا بھی مظہر ہے کہ لفٹنٹ گورنر کی پیشگاہ سے یہ حکم صادر ہوا ہے۔ اس پر کچھ عرصے بعد غالباً برن سے ٹیلیفون پر پوچھ کر ایک حکم لکھ کر لائے کہ پروگرام بدل دیا گیا ہے۔ آپ لوگ بجائے دس بجے شب کے آج شام ہی کو ساڑھے پانچ پر روانہ ہو جائیں۔ یہ حکم پانے پر ہم نے والدہ اور بچوں کو اطلاع کرادی کہ گاڑی ابھی جائے گی۔

ہماری ہی گاڑی جو shunt کر کے ایک siding پر بھیج دی گئی تھی آکر ٹرین میں لگ گئی۔ نوکروں نے سامان اپنے درجوں میں سے جو نکالا تھا وہ انسپکٹر سے کہہ کر بھروالیا۔ مگر بیچارہ سب انسپکٹر (ہرنزوپ) جو لیفٹنڈون میں ہمارے سنسر صاحب کو خط پڑھنے میں مدد دیتا تھا اور ہمراہ جبل پور تک معہ انسپکٹر (Garrim) کے آیا بقضائے حاجت گیا ہوا تھا بڑی مشکل سے چلتی گاڑی میں بیٹھا

اب اس کے بعد فرنمیل سے "دوستانہ گفتگو شروع ہوئی۔ جنگ کا ذکر آیا' ترکوں کی پالیسی' مصر کے واپس دینے یا نہ دینے کا مسئلہ۔ یہ سب معرض بحث میں آئے۔ ہم نے کہا کہ ہم نہ کہتے تھے۔ چار برس سے کامریڈ نے ہمیشہ گورنمنٹ کو یہی سمجھایا تھا کہ دیکھو مسلمان ۳۰ کروڑ ہیں' ہر ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سے نہ بگاڑو۔ ان کے مذہب سے استہزا نہ کرو۔ ان کے مقدس مقامات کی طرف رخ نہ کرو۔ خلیفۃ الرسول خادم حرمین شریفین کی محبت وعظمت ہر مسلمان کے دل میں ہونا لازمی ہے اور ہے۔ ان سے اچھا سلوک کرو اور ان کے دل کو موہ لو تو مسلمانان عالم کے دل تمہارے ہیں۔ کیا یہ بہترین صلاح و مشورہ نہ تھا۔ مگر سر ایڈورڈ گرے پر گلیڈ اسٹون کا بھوت سوار تھا۔ علاوہ ازیں جرمنی کے خوف نے انھیں بوکھلا دیا تھا۔ اس نے ان دونوں باتوں سے فائدہ اٹھایا اور آخرش نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کو تو جنگ سے روک نہ سکے مگر ترکوں کو ہاتھ سے کھو بیٹھے اور عالم اسلام کو آج ایک سخت ہیجان میں ڈال دیا۔ اگر بجائے کامریڈ کی ضمانت ضبط کرنے کے ہم میں سے چند مخلصین کو مقام خلافت کو بھیجا گیا ہوتا اور ترکوں کے ساتھ رشتۂ الفت و اتحاد پھر قائم کیا گیا ہوتا اور مصر انھیں واپس دے دیا گیا ہوتا تو آج دردانیال' مصر' ایران' عراق و یمن میں یہ حالت کیوں ہوتی' سرحد پر کیوں شورش ہوتی اور افغانستان کی طرف سے کیوں کھٹکا لگا رہتا۔ ترک اگر ساتھ بھی نہ دیتے تب بھی خلاف نہ ہوتے اور روس کو سامان جنگ پہنچانے اور وہاں سے غلہ حاصل کرنے میں دقت نہ پیش آتی۔ روس کو قفقاز میں مشکل کا سامنا نہ ہوتا۔ مزے سے جرمنی رہتا۔ فرانس کو الجیریا و ٹیونس سے فوجیں منگانے میں سہولت ہوتی۔ انگریزوں کو مشرق میں بےفکری رہتی اور مغرب میں دشمن کا مقابلہ آسان ہوتا۔ اسی سلسلے میں ہندوستان کی سیاست کا ذکر چھڑ گیا۔

سول سروس کی خود غرضیوں پر دیر تک مباحثہ ہوا اور خصوصاً ان قوانین و افعال کے متعلق جن کا جواز محض جنگ کی وجہ سے ہوا اگرچہ جن کے ذریعے سے سول سروس نے اپنے معترضین سے بدلہ لیا۔ اسی مباحثے میں میں نے کہا "The war has been a godsend to the civilian" - اس پر آبدیدہ ہو کر کہا :-

It is not very generous of you. It is very unkind when you know we are losing our brothers and cousins in such large numbers. Sir Duncan ? has lost 3 sons.

اس کے جواب میں میں نے یقین دلایا کہ میرا اشارہ یورپ کی جنگ کی طرف نہ تھا، بلکہ ان واقعات کی طرف جو سول سروس کی طرف سے ظہور میں آ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے تعجب ہے کہ ان کو میرا مفہوم سمجھنے میں کیونکر مغالطہ ہو سکتا تھا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے مگر آپ کو ان واقعات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جو جنگ میں پیش آ رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ ہمارے لئے کچھ بھی allowance نہیں کرتے۔ شوکت نے اس پر کہا کہ بھائی جان تم نے بھی کبھی ہمارے لئے allowances کیں۔ تم ہمیں نظر بند کرتے ہو مگر کبھی اس کا بھی خیال کیا کہ اس کا ہماری ماں پر، محمد علی کی بیوی پر اور ہماری بہن اور بچوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ محمد علی کی دو لڑکیاں یکے بعد دیگرے سخت بیمار ہوئیں اور بچنے کی امید نہ تھی مگر ان سے ملنے تک کے لئے نہیں جانے دیا گیا۔ ہمارا بزنس تباہ کر دیا گیا اور اس کے بدلے ڈھائی سو ایک کو اور سو روپے ایک کو دئے گئے۔ اس وقت ہمارا اور ہمارے بچوں کا خیال نہ آیا۔ جنگ تو تمہاری اپنی تھی پھر سول سروس نے اتنی بے حیائی کیوں روا رکھی کہ رخصتیں نہ منظور ہونے کے باعث جو acting کا موقع ہاتھ نہ آیا تو اس کا بھی معاوضہ مانگا اور وصول کیا۔ اسی دوران میں allowances کے مضمون پر بھی گفتگو ہوئی اور میں نے بتایا کہ جب گورنمنٹ ضمانت ضبط Choice of the Turks

کررہی تھی میں اسی دن انگلستان کے مشہور ترین Tory اخبارات Morning Post and Daily Telegraph اسی مضمون کی Loyalty کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ سول سروس کمیشن اور ہندوستانیوں کو ۵ فی صدی سے کم جگہیں سول سروس میں ملنے پر گفتگو رہی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ یہ بالکل درست ہے۔ اگر حکومت ہمارے ہی ہاتھ میں رہے تو ہمارا عنصر غالب ہونا چاہیئے۔ اس پر ہم نے کہا کہ Self - government نے کیا نقصان کیا ہے جو ابدالآباد تک حکومت آپ ہی کے ہاتھ میں رہے۔ کہا کہ ہندوستانی ابھی اس قابل نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ تم ایسا نا کہو کہ تم ان کو اس قابل کرنا چاہتے ہو کہ وہ خود حکومت کر سکیں۔ ہم بھی انتظار کے لئے تیار ہیں مگر جہاز کی سست رفتاری کا مضائقہ نہیں بشرطیکہ اس کا رخ بندرگاہ مقصود کی طرف ہو۔ افسوس تو اس کا ہے کہ سول سروس ہماری پالیسی کی مخالف ہے اور خود کوئی پالیسی نہیں رکھتی۔ کچھ لوگ کھلم کھلا ہندوستانیوں کے مخالف ہیں اور کچھ ٹالے بالے کرتے ہیں۔ پھر ہم لوگوں کا ذکر آیا۔ کہا تم چند نفوس ہو۔ تمہاری آواز ملک کی آواز نہیں ہے You represent only yourself۔ اس پر میں نے کہا کہ کرمی اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ ڈیڑھ سو سپاہی پہرے چوکی کے لئے تم نے کیوں جمع کر رکھے ہیں اور الہ آباد کے ہزاروں آدمیوں کو ملنے سے کیوں روکتے ہو۔ قائل ہوئے مگر کہا کہ تم لوگوں کو گمراہ کرتے ہو۔ ہم نے کہا کہ خیر تم اس کے تو قائل ہوئے کہ لوگ ہمیں رہنما سمجھتے ہیں۔ اب سوال بیراہ روی اور سچی ہدایت و رہنمائی کا ہے۔ مگر اس کا فیصلہ کون کرے۔ ایک فریق خود غرض تم ایک ہم۔ خود غرضی میں زیادہ سے زیادہ دونوں یکساں۔ مگر ہم ملک کی حالت سے واقف ہیں کیونکہ رات دن کا لوگوں کا ساتھ ہے اور تم ایک دوسری دنیا میں رہتے ہو ناواقف ہو۔ اس لئے تمہارا قول تو کسی طرح معتبر ہو نہیں سکتا۔ غرض اسی طرح گفتگو رہی یہاں تک کہ گاڑی روانہ ہوئی اور ہم رخصت ہوئے۔ سب مسافر پولیس کے لوگ، انگریز ہندوستانی اور ہمارے دوست مسٹر قمر احمد بی۔ اے، ایل ایل۔ بی (علیگ) جن کی طرف بعض لوگ وہ شعر منسوب کرتے ہیں "ہو گئے پاس ایل ایل بی میں اگر ہم اب کے" ابھی جو غازی پور سے ملنے آئے تھے اس دلچسپ مباحثے سے مستفیض ہوئے۔

رات کو ہم بارہ بجے شتنہ پہنچے۔ گاڑی وہیں تک جاتی تھی۔ نوکر اتر گئے ہم سوتے رہے جب دس بجے والی گاڑی الہ آباد سے آئی تو ہم پھر روانہ ہوئے۔ صبح کو جبلپور پہنچے۔ اسٹیشن پر Mr. Latham ملے اور Supdt. Police ملے اور C.P. Government کے احکام دئے۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ ہم اسٹیشن ہی پر اور اپنی گاڑی ہی میں رہیں لیکن ہم نے کہا کہ ہمیں اس قدر آزادی ضرور حاصل ہے کہ جبل پور کی سیر کریں اور جب تک اس کے خلاف حکم نہ ہوگا ہم اپنے حقوق کا استعمال کریں گے۔ یہ شخص نہایت معقول ہیں۔ خود ہی ایک نہایت نفیس موٹر منگائی جو "کنبہ پرور" تھی۔ ہم آٹھ دس بھر گئے۔ ہم نے خود ہی درخواست کی کہ کوئی پولیس کا افسر ہمارے ساتھ چلے تاکہ رہنمائی بھی ہو اور آئندہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ کہیں جاکر "بغاوت" پھیلائی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ہمارے D.S.P بلا یونی فارم کے ہیں (ہم نے کہا کہ ہم کو عذر نہیں اگر وردی پہنے ہوئے بھی کوئی شخص ہمارے ساتھ ہو) اور وہ آپ کو جانتے بھی ہیں۔ علی گڑھ کے پرانے طالب علم ہیں۔ وہ ساتھ چلے جائینگے۔ یہ میرے ہم جماعت نکلے۔ خوب سیر دکھائی۔ راستے میں مرزا اکرم خاں بی۔ اے (علیگ) بلاسپور کے D.S.P. جو Hockey کھیلنے اپنی ٹیم کے ساتھ آئے تھے مل گئے۔ وہ بھی موٹر پر آگئے۔ خوب گپیں ہوئیں اور ہمارے ساتھ ہی رہے جب تک کہ ہم رخصت ہوئے Mr. Latham بھی ہمیں رخصت کرنے آئے۔ ان سے بھی گفتگو رہی۔ گر آدمی لائق اور خلیق ہیں اور معقول پسند۔ راستے میں ایک مقام Nanipur پر گاڑی بدلی جاتی ہے۔ یہاں چند لوگ ملے جو Mundla ضلع سے ہم نے ملنے آئے تھے ترجمان میں جو پروگرام چھپا تھا اس کے باعث جبلپور بھی لوگ اسٹیشن پر آئے اور ملے۔ راستے میں متعدد اسٹیشنوں پر لوگ جوق جوق آئے۔ شب کو یہاں پہنچے۔ محمد عبدالولی خاں "مجاہد طرابلس" جو یہاں نظر بند تھے ملے اور چار پلائی۔ چونکہ کوئی شخص حکام میں سے رہنمائی کے لئے نہ تھا اس لئے شب کو ہم نے اور ہمراہی یورپین انسپکٹر نے جو جبلپور سے آیا تھا گاڑی ہی میں آرام کیا۔ صبح کو ایک پولیس جمعدار کے کہنے پر کہ بنگلہ تیار ہے اور سب سامان سے آراستہ ہے یہاں آئے تو بنگلہ خالی پایا۔ صرف دو کرسیاں اور ایک میز استقبال کے لئے موجود تھیں۔ مجبوری

ڈاک بنگلہ گئے۔ اتفاقاً دو کمروں میں سے ایک گھرا ہوا تھا۔ ایک میں یہ سارا کنبہ جا پڑا جا۔ یہاں سب سے پہلے اشتیاق علی صاحب E.A.C سے ملاقات ہوئی۔ معذرت کرتے تھے کہ ہم کو بالکل خبر نہ تھی یہاں کے ڈپٹی کمشنر میرے شناسا نکلے۔ مسٹر گنگا دھر چٹنویس کے سگے بھائی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمکو علم تو تھا مگر گورنمنٹ ہند کی طرف سے ایک ڈیڑھ مہینہ ہوا کہ عبدالمجید C.I.D کا D.S.P. شملہ سے آکر مکان کا انتظام کر گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں کوئی حکم نہ ملا تھا۔ بہرحال مسٹر چٹنویس نے بہت عنایت کی اور ہم ان کے سخت مشکور ہیں۔ C.P. Government نے سامان کے لئے فوراً منظوری ان کے لکھنے پر دیدی اور کلکتے سے فرنیچر اور کانپور سے دریاں آرہی ہیں۔ پلنگ وغیرہ عاریتاً مل گئے تھے اب یہاں مسہریاں تیار ہوگئی ہیں فرنیچر بھی جلد آجائے گا۔ بہرحال مردہ بدست زندہ اگر یہ نہ بھی ہوتا تو ہم شاکر و صابر رہتے۔ یہاں لوگوں کو اسلامی حمیت سے پُر پایا۔ ہندو اور مسلمان سب ہم سے اچھی طرح ملتے ہیں۔

برادرم۔ غربت میں وطن کا مزا ہے۔ باقی آئندہ۔

تم آؤ تو ناگپور ہو کر آنا۔ وہاں سے صبح کو ۸ بجے گاڑی چل کر شام کو ½ ۵ یہاں پہنچ جاتی ہے۔ واپس ہو کر ناگپور سے بمبئی چلے جانا۔ شوکت اور بچوں کا سلام۔ والدہ کی دعا۔ میری اہلیہ سلام کہتی ہیں۔ والسّلام۔

تمہارا خیر طلب اور مدّاح

محمد علی

گیتا کے فارسی تراجم

گیتا یا بھگوت گیتا کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں حقائق و معارف کی جو باتیں ہیں وہ درحقیقت میرے قلم سے توضیح کی محتاج نہیں۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کی تمام زندہ زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔ مختلف ہندوستانی زبانوں کے تراجم سے قطع نظر کرکے جرمنی، فرانس اور انگلستان جیسے غیر ممالک کی زبانوں میں بھی اس کے تراجم کی تعداد کچھ کم نہیں۔

ہندوستان میں مدتوں فارسی کا زور رہا ہے۔ اس عرصے میں بہت سے ارباب علم کی بدولت بے شمار سنسکرت کتابوں نے فارسی کا جامہ زیب تن کیا۔ اور بعض کتابوں کے متعدد تراجم ہوئے۔ گیتا جیسی مشہور و معروف کتاب کے جو مختلف فارسی ترجمے میری نظر سے گذرے ہیں فی الحال ان ہی کا مختصر بیان ہدیۂ ناظرین ہے۔

(۱) ترجمۂ فیضی

اکبری دربار کے ملک الشعراء شیخ ابوالفیض فیضی فیاضی کے تعارف کی چنداں ضرورت نہیں۔ اسی صاحب کمال شاعر کا ایک منظوم ترجمہ موسوم بہ شری بھگوت گیتا ہے۔ سنسکرت نسخے میں ۱۸ ادھیائے (باب) ہیں۔ اسی طرح اس فارسی نسخے میں بھی ۱۸ باب قائم کئے گئے ہیں اور سنسکرت کے ۷۰۱ اشلوکوں (اشعار) کا مضمون فارسی کے ۱۲۸۲ اشعار میں ادا کیا گیا ہے چنانچہ ہر ایک ادھیائے کے اشلوک اور فارسی اشعار کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ادھیائے	تعداد اشلوک	تعداد اشعار
۱	۴۷	۷۴
۲	۷۲	۱۱۷

ادھیائے	تعداد اشلوک	تعداد اشعار
۳	۴۳	۷۵
۴	۴۲	۴۳
۵	۲۹	۵۸
۶	۴۷	۶۴
۷	۳۰	۵۹
۸	۲۸	۵۴
۹	۳۴	۸۲
۱۰	۴۲	۷۶
۱۱	۵۵	۹۱
۱۲	۲۰	۳۲
۱۳	۳۵[له]	۷۸
۱۴	۲۷	۴۶
۱۵	۲۰	۴۳
۱۶	۲۴	۶۳
۱۷	۲۸	۵۶
۱۸	۷۸	۱۷۰
	۷۰۱	۱۲۸۲

له سنسکرت کے بعض نسخوں میں صرف ۳۴ ہی اشلوک شمار کئے گئے ہیں۔ اس حساب سے تمام سنسکرت اشلوکوں کی مجموعی تعداد صرف ۷۰۰ ٹھہرے گی۔

ادا کرنے میں بعض اوقات تفصیل اور بعض اوقات اختصار سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے
یہی سبب ہے کہ سنسکرت اشلوکوں اور فارسی اشعار کی تعداد میں کوئی خاص تناسب نہیں ہے۔
اب سنسکرت کے ابتدائی ۵۰ اشلوکوں کا ماحصل ذیل میں علیحدہ علیحدہ دیا جاتا ہے اور ہر
ایک کے پہلو میں فارسی اشعار درج کئے جاتے ہیں تاکہ ناظرین ملک الشعرا فیضی کے ترجمے کی
صحت اور قادرالکلامی کا کم و بیش اندازہ لگا سکیں۔

نمبر اشلوک	اشلوک کا خلاصہ	اشعار فیضی
(۱)	دھرتراشٹر[1] نے سنجے سے پوچھا کہ جب کوروں اور پانڈوں کو رکشیتر کے میدان جنگ میں صف آرا ہوئے تو کیا ہوا۔	طرازندۂ داستان کہن بدیں سان بفگند طرح سخن کہ پرسید دھرتراشت[2] از سنجے ایں کہ کرکھیت رشک بہشت بریں بود مزرعۂ آخرت در جہاں درآں جا رسیدند چوں کوروان دگر پانڈواں از پے کارزار چہا رفت ایں قصہ لے ہوشیار
(۲)	سنجے نے جواب دیا کہ دریودھن نے جب پانڈوں کی صف آرائی	جوابش چنیں گفت کاے بادشاہ بہ بستند از ہر دو سو صف سپاہ

[1] دھرتراشٹر اور ان کے علاتی بھائی پانڈو کی اولادوں کے درمیان مہا بھارت نامی جنگ عظیم واقع ہوئی ہے جس پر درحقیقت گیتا کا دارومدار ہے۔ دھرتراشٹر کی اولاد کوروں کے نام سے موسوم ہے۔ ان میں سب سے بڑا دریودھن ہے اور پانڈو کی اولاد پانڈوں کہلاتی ہے جو یدھشٹر، بھیم، ارجن وغیرہ پر مشتمل ہے۔

[2] اصل سنسکرت لفظ دھرتراشٹر ہے۔ اسی طرح دیگر بہت سے اسمار اکثر فارسی تراجم میں اپنے ڈھنگ پر مناسب قالب میں ڈھال لئے گئے ہیں۔

نمبر اشلوک	اشلوک کا خلاصہ	اشعار فیضی
	ایک خاص وضع پر دیکھی تو اپنے پیرومرشد درونا چارج کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا۔	چو فرزند تو فوج دشمن بدید بہ نزد درونا چارج رسید
(۳)	محترم استاد آپ کے شاگرد رشید نے جس خاص وضع پر صف آرائی کی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیے۔	بگفتش بریں لشکر پانڈواں نظر کن کہ ترتیب دارد چناں درشٹدومن ہست سالار فوج جگرداریش رونق کار فوج
(۴)	اس جنگ میں بھیم اور ارجن ایسے عدیم المثال تیر انداز ہیں۔ یودہان براٹ اور دروپد ایسے سرداران لشکر ہیں۔	یلے ہمچو بھیمے بہ پہلوئے او دگر نکل و سہدیو بازوے او دگر ارجن آں چناں پہلواں کہ لرزد بخوفش بخود آسماں سرجادواں سانک نامدار قوی پنجہ براٹ دشمن شکار دگر راجہ مجد ثقاں بفوج گراں مہیائے کیں ہمچو شیر ژیاں دروپدیل عرصۂ رزمگاہ کند گرد فوجش جہاں را سیاہ
(۵)	دھرشٹ کیتو۔ کاشی راج۔ کنت بھوج۔ پرجت اور شیو سرداران	رئیس رئیساں دگر کاشی راج شہاں را ازو چشم اکلیل و تاج

لہ مراد یودھان۔

نمبر اشلوک	اشلوک کا خلاصہ	اشعار فیضی
	لشکر ہیں۔	دگرگنت بعوج و دگر شیو یار دگر ابھمن[1] مرد میدان کار بصد زور و طاقت دگر پرجت است بدلہائے شیران از و ہیبت است جہاں پہلوان اُتموجا[2] دلیر دگر دھرشٹ کیت است مانند شیر

دوسرے ادھیائے کے اشلوک ۱۲ لغایت ۲۴ کا مبحث یہ ہے کہ جسم فنا ہو جاتا ہے روح فانی نہیں۔ جس طرح کوئی شخص بوسیدہ لباس کو ترک کر کے نیا لباس پہن لیتا ہے اسی طرح یہ روح بھی درحقیقت ایک جسم کو چھوڑ کر دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ روح آلات حرب سے کاٹی نہیں جا سکتی، یہ نہ تو پانی میں گل سکتی ہے اور نہ ہوا میں سوکھ سکتی ہے وغیرہ۔

مذکورہ بالا خیال کو ملک الشعرا نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

تغیر بجسم است و جاں فارغ است — حوادث بر یں است و آں فارغ است
بگرمی و سردی تنت آشنا ست — نہ جانت کہ فارغ ز ہر دو سرا ست
بوقت معین اجل میرسد — بہر نیک و بد بے خلل می رسد

---

[1] مراد ابھمنو پسر ارجن۔ یہ نام اصل پانچویں اشلوک میں نہیں آیا مگر حق یہ ہے کہ اس نے میدان کارزار میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

[2] اُتموجا نام چھٹے اشلوک میں آیا ہے۔

بسے پادشاہان لشکر کشاں — بخاک اوفتادند از دست شاں
زمانہ بیک وضع بودے اگر — نمی یافت فرزند جائے پدر
غم ایں عزیزاں چرا مے خوری — چرا پردۂ راز را مے دری
تن ہر کسے ہم چو جامہ بود — شود پارہ ہر گاہ کہنہ بود
بپوشندۂ جامہ جانست نام — خیالِ فنا گشتنش ہست خام

القصہ میں نے سنسکرت کے جستہ جستہ مقامات کا مقابلہ فارسی سے کیا اور یہ نتائج نکلے :-

(۱) ملک الشعرا نے سنسکرت گیتا کو کما حقہ سمجھا تھا۔

(۲) فارسی میں کہیں کہیں اصل سنسکرت کے بعض مؤخر امور کو مقدم یا یوں کہنا چاہیئے کہ بعض مقدم امور کو مؤخر کر دیا گیا ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ جس طرح کوئی سنسکرت داں سنسکرت گیتا سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے اسی طرح ہر ایک فارسی داں فارسی نسخے سے صحیح معنوں میں مستفید ہو سکتا ہے۔

پھر یہ امر بھی کچھ کم اہم نہیں کہ فیضی نے جس بحر میں گیتا کو نظم کیا ہے وہ اس کے لئے نہایت موزوں ہے اور جس دلکش اور زوردار پیرایے میں تمام کتاب ہے اس کی بنا پر میرا یہ قیاس ہے کہ اگر کوئی صاحب ذوق کتاب کو شروع کرے تو اس کو ختم کئے بغیر نہ چھوڑے گا۔ فیضی نے گیتا کو اس شعر پر ختم کیا ہے۔

بکن سجدۂ شکر پروردگار
کہ آمد ز دست تو ایں گونہ کار

فیضی نے یہ عدیم المثال ترجمہ کب کیا تھا اس امر کا صحیح پتہ نہ تو اس کتاب سے لگتا ہے اور نہ اب تک اس بارے میں دوسرے ذرائع سے کوئی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اپنی ہر دلعزیزی کے باعث یہ ترجمہ مختلف مطابع سے شائع ہو چکا ہے چنانچہ مفصلہ ذیل

مطابع کے نسخے میری نظر سے گذرے ہیں۔

۱۔ مطبع آئینی الہ آباد۔ سنہ طباعت درج نہیں۔

۲۔ مطبع ست دھرم پرچارک جالندھر ۱۹۰۱ء۔

۳۔ جارج اسٹیم پریس لاہور۔ سنہ طباعت درج نہیں۔

ان کے سوا دو اور نسخے بھی بتائے جاتے ہیں:۔

۱۔ عالیجاہ دربار پریس گوالیار ۱۹۲۴ء۔

۲۔ ہندوستان پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۲۶ء۔

(۲) ترجمۂ ابوالفضل

اہل ہنود کا عقیدہ ہے کہ کاشی میں مرنے سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ اسی خیال سے بہت سے لوگ آخری عمر میں کاشی آجاتے ہیں اور بقیہ عمر کو زیادہ تر مذہبی مشاغل میں صرف کرتے ہیں چنانچہ جو فارسی داں اصحاب یہاں آئے ان کی بدولت اکثر مذہبی کتابوں کی نقلیں یا ترجمے کاشی میں پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک گیتا کا ترجمہ ہے جو ملک الشعرا فیضی کے برادر خورد شیخ ابوالفضل الملقب بہ علامی کا کیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور مذہبی کتابوں کے بھی قلمی نسخے دیکھنے میں آئے ہیں جن کا ذکر آیندہ حسب موقع کیا جائے گا۔

شیخ ابوالفضل کے ترجمے کا نام "ارجن گیتا" ہے۔ اس کے شائع ہونے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی اور نہ غالباً اس کا ذکر کسی کتاب میں آیا ہے۔ اسی سبب سے بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے۔ میں نے اس نایاب ترجمے کا ایک قلمی نسخہ بنارس کی 'مالتی سدن' نامی لائبریری میں دیکھا ہے جس کی مختصر کیفیت یہ ہے۔

یہ نسخہ تقریباً ۹۶ صفحات تقطیع ۱۰ × ۶½ انچ پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے میں تقریباً ۲۳ سطریں اور ہر سطر میں ۲۴ الفاظ کا اوسط ہے۔ خط معمولی ہے۔

کاتب کا نام و پتہ یہ ہے "کنور سنگھ ولد گلزاری مل ابن پرتھی مل قوم اگروالہ، ساکن شاہجہاں آباد"۔

کاتب موصوف مرزا شگفتہ بخت بہادر ولد مرزا جہاندار شاہ بہادر کے یہاں ملازم تھے۔

مقام و وقت کتابت بھارج دواجی ٹولہ شہر بنارس تاریخ سلخ صفر المظفر ۱۲۱۴ھ مطابق سنہ ۴۲ جلوس والا بادشاہ شاہ عالم غازی۔

کاتب موصوف نے اس ترجمے کو جس نسخے سے نقل کیا تھا اس کا کوئی حوالہ درج نہیں۔

اس نسخے کے متعلق ضروری امور ذیل میں دئے جاتے ہیں۔

۱۔ ابتدا میں ایک مختصر مقدمہ منجانب فاضل مترجم ہے جس کے کچھ الفاظ یہ ہیں:-

"این نسخۂ گیتا کہ در انکشاف سرایر قدرت ذوالجلال و اشکشاف حقیقت معرفت لایزال است آں را باجازت سلطان عادل و برہان کامل دلیل قاطع خداوانی حجت ساطع رحمانی قافلہ سالار راہ حقیقی و مجازی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلداللہ ملکہ و سلطانہ شیخ ابوالفضل از زبان سنسکرت ترجمہ بعبارت فرس دعربی نمود"

مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ ترجمہ دراصل شہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوا تھا۔

۲۔ نفس مضمون کی ابتدائی عبارت یوں ہے:-

"دھرتراشٹ پرسید کہ اے سنجے مردم ما و جماعت پانڈواں در وقت روبرو شدن اول بچہ کار مشغول شدند۔ سنجے گفت کہ جرجودھن فوجہائے پانڈواں ایستادہ دید نزد درونہ چارج آمدہ گفت اے استاد ایں لشکر عظیم کہ پانڈوان آراستہ اند عمدۂ ایں سپاہ بھیم و ارجن اند"

مذکورہ بالا اقتباس و ترجمے کی دیگر عبارتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ منثور فارسی گیتا درحقیقت منظوم سنسکرت گیتا کا چربا ہے۔

۲- تمام ترجمے میں فاضل مترجم کے مخصوص طرز ادا کا رنگ ہے مگر کہیں کہیں کسی سنسکرت لفظ کو بعینہٖ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً دوسرے باب میں آیا ہے:-

"چوں سری کرشن ارجن را با دیدۂ پرآب دیدند از روئے مہربانی فرمودند کہ اے ارجن ترا درچنیں محل مشکل اندیشہ کہ از نقصان عمل خبر می دہد از کجا پیدا شدہ و ایں روش بسرگ لوک[1] نمی رساند۔"

۴- ترجمے کا بیشتر حصہ نثر میں ہے مگر کہیں کہیں اشعار بھی ہیں چنانچہ ایک شعر ذیل میں دیا جاتا ہے۔

ہر کہ آمد بجہاں اہل فنا خواہد بود
وانکہ پایندہ و باقیست خدا خواہد بود

(۳) ترجمہ مول چند

یہ ترجمہ موسوم بہ "سری بھگوت گیتا" رائے مول چند صاحب متوطن ڈیرہ اسماعیل خاں کا ہے۔ مطبع کوہ نور لاہور سے ۱۸۶۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مترجم کون تھے۔ انھوں نے کب ترجمہ کیا۔ ان امور کا ہنوز مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔

پورا مطبوعہ نسخہ معمولی تقطیع کے ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ سیدھی سادی فارسی نثر میں ہے مگر ترجمے میں سنسکرت الفاظ کا بعینہٖ استعمال جا بجا کیا گیا ہے۔ اب بطور نمونہ اس گیتا کی تھوڑی سی ابتدائی عبارت ذیل میں دی جاتی ہے۔

"آغاز سری بھگوت گیتا

دھرتراشٹ پرسید اے سنجے مردم من و جماعت پانڈواں در زمین

---

[1] سرگ لوک سے مراد بہشت بریں۔

دھرم کھیتر کورکھیتر بقصد جنگ جمع شدہ چہ کردند۔ سنجے گفت کہ درجودھن فوجہا
پانڈوان را استادہ دیدہ نزد درونا چارج آمد وگفت لے اوستاد ایں
لشکر عظیم پانڈواں کا درشٹدومن درپد کہ شاگرد خردمند تست بہ صفوف
آراستہ نیک ملاحظہ کن :

آخر میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ گیتا جیسی گراں بہا کتاب کے دوسرے
ترجمے بھی ہوئے ہوں جو میری نظر سے نہیں گذرے۔ پس اگر کوئی صاحب ذوق کسی دیگر نسخے
یا نسخوں کا حال تحریر فرمائیں یا مجھے ان کا پتہ دیں تو میں بہت ممنون احسان ہوں گا۔

رام پور کا ایک ملک الشعرا

ایسا کم دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی ہستی ایک ہی وقت میں صاحب افسر دیہیم بھی ہو اور صاحب قرطاس وقلم بھی، انتظام مملکت اور کشور آرائی کے مراحل بھی درپیش ہوں اور افواج معانی کی سپہداری بھی ہو رہی ہو، دنیا دی دلفریبیاں "خوش باش دمے کہ زندگانی اینست" کی دعوت دے رہی ہوں اور فقر و قناعت کے بوریے پر لطف درویشی بھی حاصل کیا جا رہا ہو، ایک طرف نگار ہائے شوخ وشنگ "دشمن ایمان و آگہی" اور "رہزن تمکین و ہوش" ہوں اور دوسری طرف چشم بینا "جامۂ ہستی کی آستینوں" کو نمایاں کر کے بساط عیش برہم کر دیتی ہو، کسی وقت مطرب و ساقی نغمہ وے، چنگ ورباب کیف سرور میں محو کر دیں، تو کبھی کبھی حقیقی جذبات کی تراوش وہ درد بھی پیدا کر دے کہ "نغمۂ شادی" "نوحۂ غم" میں بدل جائے۔

نواب یوسف علی خاں ناظم فرماں روائے "دارالسرور رام پور" انھی مستثنیات میں تھے۔ وہ صاحب تخت و اورنگ بھی تھے اور ایک جادو نگار شاعر بھی، وہ مالک چتر شاہی بھی تھے اور اقلیم سخن کے تاجدار بھی۔

ان کے ماحول پر نظر ڈالیے تو اور حیرت ہوتی ہے کہ ان کے دل میں جذبات کا یہ ترفع، تخیل کی یہ قدرت، انداز بیان کی یہ پاکیزگی پیدا کیوں کر ہوئی! جس شخص کو بگاڑنے کے لیے مصاحبوں اور ندیموں کا جمگھٹ ہو، خوش باشوں اور خوشامدیوں کا اجتماع ہو، بڑے سے بڑے نقاد فن اور ماہر زبان کی زبان بھی جس کے حضور میں گنگ ہو جاتی ہو، تعریف و توصیف، مدح و ستائش، اور "عمرت دراز باد" کے نعرے جس کے کانوں میں ہر وقت گونجتے ہوں، اگر اسے اپنے متعلق "غلط فہمی" نہ ہو تو کس کو ہو؟ وہ اپنے ہر عیب کو ہنر نہ سمجھے تو کون سمجھے؟ اگر اس پر بھی کسی شخص کو عیب و ہنر میں تمیز باقی رہے تو اس سے بڑھ کر عاقل و فرزانہ کون ہے؟

ناظمؔ اگرچہ ایک فرمانروا تھے، اظہارِ خیال میں بے باک تھے، نہ ان کی کوئی گرفت کرسکتا تھا نہ صحیح مشورہ دے سکتا تھا، لیکن باایں ہمہ انھوں نے وہ حسنِ ذوق اور کمالِ فن پیدا کیا کہ ان کا کلام صاحبِ ذوق سلیم کو وجد وکیف میں سرشار کردیتا ہے۔

ان کا اشہبِ قلم اصنافِ شاعری کے ہر میدان پر یلغار کرتا ہے، لیکن تغزل ان کا حصہ ہے، اس کی آپ جتنی تحلیل کرسکتے ہوں کرلیجئے، پھر ناظمؔ کو اس کسوٹی پر کسیے، تو آپ اسے اپنے معیار سے زیادہ ہی پائیں گے، بالخصوص محاکات اور حسنِ بیان میں تو اسے یدطولیٰ حاصل ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس انداز سے کہتا ہے کہ گویا سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے، وہ جب درد والم کا اظہار کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دل کی ترجمانی ہو رہی ہے، وہ جب کسی کی بے اعتنائیوں اور تنک مزاجیوں کا تذکرہ کرتا ہے تو اس حسرت وتاسف سے کہ اگر پتھر کا دل ہو تو وہ بھی موم ہو جائے، اور چونکہ وہ ایک باعظمت وجبروت شخصیت کا مالک ہے، صاحبِ اقتدار وصاحبِ اختیار ہے، حرم سرا بھی رکھتا ہے اور محلات بھی اس لئے کبھی کبھی شاہانہ تمکنت کا اظہار بھی زبانِ شعر سے ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ جب ناظمؔ ایک عاشقِ ناکام نہیں تھے، فراق زدہ نہیں تھے، جورِ فلک کے شاکی نہیں تھے، "کسی" کے شکوہ سنجِ جور وستم نہیں تھے، تو ان کے ہاں اس درد واثر، سوز وگداز اور بے تابی وبے قراری کے کیا معنی؟ انھیں تو امراء القیس کی طرح "شبِ وصل" کا نقشہ کھینچنا چاہئے تھا، اپنی لغزشِ رندانہ کی حکایتیں مزے لے لے کر بیان کرنی چاہئے تھیں، لیکن یہ عنصر تو کم ہے، ہے تو درد وغم کی داستان، "بے قراری ہائے فرقت کا بیان"۔ اسے اگر آورد نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے؟

یہ خیال صحیح نہیں، یہ کیا ضرور ہے کہ ناظمؔ اگر رامپور کے فرماں روا تھے تو کشورِ دل بھی تسخیر کرچکے تھے؟ ہو سکتا ہے کہ دل پر ایسی چوٹ لگی ہو جس نے ان سے نشاط ومسرت کے جذبات چھین لئے ہوں، دربار میں، حرم سرا میں، مصاحبوں کے مجمع میں، کاروبارِ سلطنت میں وہ اپنا

درونماں ہوں جاتے ہوں لیکن جب رات کی تاریکی مسلط ہوتی ہو تو وہ اپنے دل میں ایک خلش محسوس کرتے ہوں، جب لوگ مصروف خواب ہوئے ہوں، وہ کروٹیں بدلتے ہوں، جب فانوس کی روشنی کاشانۂ سلطانی کو بقعۂ نور بنا دیتی ہو، تو پریم کی "اندھیری نگری" میں یاس و حسرت کے بادل چھا جاتے ہوں، جب شب ماہ کی کرنیں بام و در کو جگمگا دیتی ہوں تو ان کا دل ویران و سنسان رہتا ہو اور اس وقت ہجوم جذبات میں ان کے منہ سے نالۂ موزوں نکلنے لگتا ہو جو ہر سننے والے کے لئے دعوت درد و اثر ہو۔ میرے اس خیال کی اس سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کا کلام اٹھا کر دیکھئے تو جس جگہ وہ دل کی بیتی بیان کرتے ہیں، سماں بندھ جاتا ہے، سننے والا یا پڑھنے والا ایک عجب خلش محسوس کرنے لگتا ہے، ورنہ اگر خالی خولی الفاظ ہوتے جیسے

طلوع صبح محشر چاک ہے میری گریباں کا

تو آپ لاکھ بار سنتے اور کچھ اثر نہ ہوتا، "استادانہ پختگی" "بلند پروازی" اور اسی قبیل کے دو چار الفاظ آپ کے منہ سے یہ سمجھ کر نکل جاتے کہ یہ ناسخ کا مطلع ہے، اس لئے ضرور لاجواب ہوگا۔ لیکن اگر کوئی ایسا شعر سنیے کہ سنیے اور سر دھنیے، تو اسے آپ آورد کیسے کہہ سکتے ہیں؟

اس تمہید کے بعد اب میں اپنے اصل موضوع پر توجہ کرتا ہوں اور کلام ناظم کے کچھ نمونے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

عام عاشقانہ مضامین | ناظم کا کلام بھی ان جذبات و خیالات سے معری نہیں ہے جو "قدر مشترک" کے طور پر تقریباً ہر شاعر کے ہاں باختلاف قوافی و ردیف ملے گا۔ اس ذیل میں ان کے جو اشعار آتے ہیں ان میں کوئی خاص بات سوا اس کے نہیں ہے کہ وہ موزوں ہیں۔ ہر شاعر کے ہاں "مزخرفات" کا ایک جزو ضرور ہوتا ہے۔ فی البدیہہ کہنے سے، فرمایشی اشعار کہنے سے، خواہ مخواہ طبیعت پر زور ڈالکر کہنے سے دیوان تیار ہو رہا ہو اور کوئی ردیف اس وقت تک نہ کہی گئی ہو تو اس کی "خانہ پری" کرنے سے ایک مجموعہ تیار ہو جاتا ہے جسے حذف ہی کر دیا جائے تو اچھا ہے۔ لیکن اسے کیا کیجئے۔ ہمارے ہاں کا دستور یہ ہو گیا ہے کہ موزوں صورت میں جو کچھ، جس موقع پر بھی زبان سے نکل جائے اُسے

"زیب کلیات" ضرور بنایا جائے۔ غالب بیچارے نے شارعِ عام سے ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی تھی کہ اپنے اشعار کا انتخاب شائع کرایا، باقی غیر ضروری اشعار حذف کر دئے لیکن وہ حذف شدہ اشعار اتنے سخت جان نکلے کہ ہنگامۂ غدر میں بھی صحیح سلامت رہے۔ بالآخر نواب صاحب بھوپال کے کتبخانے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم اس "مجموعۂ بے رنگ" کو بھی نکال ہی لائے اور ستم یہ کیا کہ شائع بھی کر دیا۔

حاصل کلام یہ کہ ناظم کے ہاں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جو ان کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتے مثلاً:۔

آنے کو کہا ہے اس نے ناظم ‏ ‏ ‏ کچھ تم کو ہی اعتبار ہو گا

سنا بھی تم نے تو کس سے سنا خدا کی پناہ ‏ ‏ ‏ کہا ہے غیر نے جو کچھ وہ میرا حال نہیں

اک جہاں تشنۂ انداز خود آرائی ہے ‏ ‏ ‏ آپ جو چاہیں کریں آپکی بن آئی ہے

آگے ہی کا سا طور ہے کیا اب کی بار بھی ‏ ‏ ‏ باندھا ہے تم نے عہد یہ ہے استوار بھی؟

ملے گی محشر میں داد ہم کو، بندھا ہے یہ اعتقاد ہم کو ‏ ‏ ‏ ملی نہ واں بھی مراد ہم کو تو پھر بتاؤ کہ کیا کرینگے!

جلد جم جاتا ہے ہر شخص کا نقشہ کیسا ‏ ‏ ‏ سادہ دل ہے وہ بت آئینہ سیما کیسا؟

مایوسی | لیکن ان مہملات سے قطع نظر کر کے ان کے اصل کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ کیجیے، تو ناظم کی خصوصیات خاصہ آپ کو رفتہ رفتہ متاثر کرتی جائیں گی۔ درد و اثر، سوز و گداز اور وفا و جفا کے

انسانے آپ نے شعرا کی زبان سے اکثر سنے ہوں گے، لیکن ناظم کی آہ جگر گداز بزم و انجمن میں صاعقے کا حکم رکھتی ہے اس کا درد دل جیسا بے نیاز دعا و دوا ہو جاتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے:-

عیسیٰ کا بھی علاج کئی بار ہو چکا　　　اچھا غم فراق کا بیمار ہو چکا
اب کیوں کمی کرے تجھے کس کا لحاظ ہے　　　رونے کا نام دیدۂ خونبار ہو چکا

یہاں غم فراق نے جان پر بنا دی ہے، "اس کی" کج ادائیوں اور سرد مہریوں نے مایوس کر رکھا ہے، لیکن دل ہے کہ محبوب کی طرف سے "صفائی" پیش کر رہا ہے۔ آخر خود اپنے تئیں مخاطب کر کے کہتے ہیں:-

ناظم غلط ہے مہر و محبت سے چشم داشت　　　واقف نہیں ہیں اس صنم حیلہ گر سے آپ

"اس نقش پا کے سجدہ" نے کیا کیا نہیں کرایا، آخر ناظم صاحب

شاعر بنے، ندیم بنے، قصہ خواں بنے　　　پائی نہ انکے دل میں مگر جا کسی طرح

یہاں پر تو جان پر بنی ہوئی ہے مگر ناصح صاحب ہیں کہ "فلسفۂ عشق" پر تقریر فرمائے جا رہے ہیں۔ ایسے وقت میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ

نصیحت کا نہیں اب وقت ناصح　　　اٹھا ہاتھ ایسی باتوں سے دعا کر

اس "پاپ کی دنیا" میں ناظم کسی کو اپنا ہم زبان و ہم نشیں نہیں پاتے اور پائیں کیونکر جب صورت مسئلہ یہ ہو،

خدا بے نیاز اور بت سنگ دل　　　کہو کس سے ہم راہ پیدا کریں!

یہ شعر ملاحظہ فرمائیے، رنجوری عشق کا کتنا باکمال مرقع پیش کیا ہے،

قاصد شکستہ پا و کبوتر شکستہ بال　　　جانے کا خط کے واں کوئی عنوان ہی نہیں

دل لاکھ لاکھ سمجھاتا ہے کہ محبوب کی سردمہری وقتی ہے، اس کی کج ادائی، التفات پنہاں کی غماز ہے، لیکن

توقع اس سے کیونکر غمگساری کی پڑے ناظم　　　کبھی بھولے سے بھی جس نے نہ پوچھا ہو کہ "کیونکر ہو"

یہ حیات مستعار تو کشمکش اضطراب و اضطرار میں گزری، شاد کامی کا زمانہ ناکامی میں بسر ہوا، اب تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "وہ"

پوچھنے آئیں گے پر جب کہ مجھے بات کرنے کی نہ طاقت ہو گی

"وعدۂ یار" شرمندۂ ایفا کب ہوا ہے؟ لیکن ناظم فریب میں آ گئے۔ محبوب ستم گار نہ اب آتا ہے نہ جب آتا ہے، آخر بے قرار ہو کے کہتے ہیں،

وہ اپنی ضد کے ہیں پورے نہ آئیں گے ہرگز بس ان کی راہ ہم اے غم گسار دیکھ چکے

ان کا حال زار دیکھ کر ہر شخص انھیں تسلی دیتا ہے لیکن وہ بھی "اس کی "طینت سے واقف ہیں بالکل بجا طور سے جواب دیتے ہیں۔

یہ تیری سخن سازیاں ہیں ندیم کسی پر وہ کیوں رحم کھانے لگے

عرض حال | ایک ناکام تمنا حصول مقصد کے لئے ہر امکانی کوشش صرف کر ڈالتا ہے، ناظم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے، انھیں بھی "کوچۂ رقیب" میں "سر کے بل" جانا پڑا، منت اعدا کرنی پڑی، اپنی خودداری کا خون کرنا پڑا، اور یہ سب کچھ محض اس لئے کہ کسی کے حریم ناز میں باریاب ہو سکیں، لیکن جب ان باتوں سے بھی کام نہ نکلا تو انھوں نے ایک بالکل نیا طریقہ نکالا جسے بظاہر کامیاب ہونا چاہئے تھا۔ اب یہ خدا کو معلوم ہے کہ وہ اس میں کامیاب کہاں تک ہوئے؟ وہ طریقہ یہ کہ انھوں نے مختلف پیرایوں میں محبوب کے جذبات پر اثر ڈالنا شروع کیا کبھی رقیب روسیہ کے معائب چن چن کے بیان کئے، کبھی اپنی وفاداریوں اور جاں سپاریوں کو شفیع لائے، کبھی حسن وفا پر لیکچر دے کہ اس زمانے میں وفا عنقا کا حکم رکھتی ہے۔ اگر کسی میں یہ گوہر نایاب پایا جائے تو اس کی قدر کرنی چاہئے۔ کبھی کبھی رفع غلط فہمی کے خیال سے یہ بھی سنا دیتے ہیں کہ اگر جفا کاریوں کا یہی عالم رہا تو ایسا مخلص اور بے ریا دل کاہے کو ملے گا؟ غرض ہر ہر طرح سے سب سے پہلے تو اپنی جاں نثاری اور وفاداری کا "سکہ" یوں بٹھاتے ہیں،

دیکھ تو بھی کہ گلا ہے نہ خنجر لیکن تجھ کو اے یار کس ارمان سے ہم دیکھتے ہیں

"صفائی" دے رہے ہیں کہ میری زبان آلودۂ شکوہ سنجی نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی اپیل کئے جا رہے ہیں کہ میری حالت تو یہ ہے کہ بات بھی نہیں کر سکتا اور تم ہو کہ "شکوہ" کی شکایت کر رہے ہو،

اس پہ کیجے گمان شکوے کا ۔۔۔ بات کرنے کی جس میں طاقت ہو

کنایہ یہ ہے کہ ہم نے شکایت نہیں کی لیکن انداز بیان ملاحظہ ہو کہ خواہ مخواہ رحم آجائے۔

منہ ترا دیکھنا نصیب نہ ہو ۔۔۔ منہ سے نکلی اگر شکایت ہو

یہ شعر ملاحظہ ہو،

جان دی گو تڑپ کے پر تم کو ۔۔۔ اک تماشہ دکھا دیا میں نے

محبوب پر احسان جتاتے ہیں

طعن عدو، ملامت احباب، جور خلق ۔۔۔ دیتے نہ تم کو دل نہ یہ آزار کھینچتے

مسیحائی کا دم بھرتے ہو، سچ ایسا ہی ہے لیکن ۔۔۔ کبھی اپنے مریض غم کو بھی پوچھو کہ کیسا ہے؛

اپنی کارگزاریوں کو بھی وہ قیس و فرہاد سے کم نہیں سمجھتے اور بلا کسی انکسار کے صاف صاف "عرض" کرتے ہیں۔

افسانۂ مجنوں سے نہیں کم مرا قصہ ۔۔۔ اس بات کو جانے دو کہ مشہور نہیں ہے

پوچھتے ہیں کہ بتلایئے سوا "خاکسار" کے اور

وہ کون ہیں کہ جو محبوب کے ستم سہہ کر ۔۔۔ زباں کو زمزمہ سنج دعا نہیں کرتے؛

سب سے بڑی شکایت تو یہ ہے کہ ناظم صاحب کی طرح

نہ بذلہ سنج، نہ شاعر، نہ شوخ طبع رقیب ۔۔۔ دیا ہے آپ نے صحبت میں اپنی بار کسے؛

"احتیاطاً" کبھی کبھی یہ بھی سنا دیتے ہیں کہ

جفا اُدھر سے اگر بے شمار باقی ہے ۔۔۔ ادھر بھی دل پہ ابھی اختیار باقی ہے

ہوا و ہوس کے جتنے بندے تھے وہ تو جفائے یار سے آشفتہ خاطر ہوکر اٹھ گئے، لیکن ایک ناظم صاحب کا دم تھا جو خلوص و وفا کا نام لئے بیٹھا تھا، اطلاعاً عرض کرتے ہیں،

سب اٹھ گئے ترے در سے خبر ہے ناظم کی　　ستم کشوں میں یہی دل فگار باقی ہے!

درد و اثر درد و اثر، سوز و گداز، اور یاس و حرماں کے جذبات بھی کلام ناظم کا ایک مخصوص حصہ ہیں، جذبات جب حقیقی ہوں، درد دل جب سچا ہو، منہ سے جو لفظ نکلتا ہے اس میں درد و حسرت کا ایک جہان پوشیدہ ہوتا ہے، کیف و اثر کا ایک مے خانہ ہوتا ہے کہ اس شراب ناب کا ایک قطرہ بھی جس کے کام و دہن تک پہنچا وہ اپنے دل کی دنیا میں ایک انقلاب محسوس کرنے لگتا ہے۔

غالب کشور سخن کا فرماں روا تھا۔ جس زمین کو اس کی جولانیٔ سخن نے پامال کر دیا پھر ہر شخص کے لئے خواہ وہ کتنا ہی قادر الکلام ہو اس کا تسخیر کرنا ناممکن ہو جاتا ہے اور اس قسم کی جرأت اگر کسی سے ہو بھی تو اصل اور نقل کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے لیکن ناظم اپنے استاد غالب کی ایک مشہور و معروف زمین پر قدم رکھتے ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں انھوں نے کوئی ٹھوکر نہیں کھائی۔ ملاحظہ ہو،

وہی تم ہو، وہی خنجر ہے، پر انصاف کرو　　ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ

جب نہ ہو کوئی جفا کش تو جفا کا کیا لطف　　کیا کرو گر نہ کرو ترک جفا میرے بعد

خط مرا پڑھ کے تمہیں رحم تو آیا لیکن　　یہ بھی قسمت کا لکھا تھا کہ پڑھا میرے بعد

اس شعر میں گو توارد کی بو آتی ہے لیکن پھر بھی سن لیجئے،

کس نے اس حلقۂ کاکل میں پھنسایا دل کو　　کون اس چشم کا بیمار ہوا میرے بعد

یہ شعر طالب و مطلوب کی نفسیات کا صحیح مرقع ہے کہ

مل جاتے ہیں تو کہتے ہیں اچھی طرح تو ہو　　گویا ہمارے جی میں کچھ ارمان ہی نہیں

دربار کی رسائی تک جب کوئی صورت نہیں نکلتی تو کہہ اٹھتے ہیں،

ان کی خلوت میں مجھے بار کہاں ہے ناظم قصہ خواں کاش سنادے مرے افسانے کو

ناصح کے طوفان تکلم سے ہر شخص واقف ہے۔ ناظم کو جب سابقہ پڑا تو یہ کہہ کے اپنا پیچھا چھڑاتے ہیں،

بکے جو اس طرح کون اس کو دانشمند جانیگا مجھے سودا سہی ناصح۔ یہ کیا تجھ کو بھی سودا ہے؟

ہجر و انتظار کی کتنی صحیح تصویر کشی کی ہے،

وہ اپنے وعدے کے سچے ہیں آئیں گے لیکن مجال صبر کسے تاب انتظار کسے؟

عاشق کے حال زار کا کس قدر دردناک نقشہ کھینچا ہے،

نہ دانش درست اور نہ بینش بجا دل و دیدہ دونوں ٹھکانے لگے

جفائے یار اور جور دلدار سہتے سہتے امید ہو چلی تھی کہ وہ بت خود راہ راست پر آئے گا اور تلافی ستم کرے گا، عذر جفا کرے گا، پیمان وفا باندھے گا، محبت کے جام چلیں گے، الفت کے ساغر چھلکیں گے، لیکن نتیجہ نکلا تو یہ کہ

یاں آرزوئے عذر ستم اور وہاں ہنوز اپنے کئے پہ یار پشیمان ہی نہیں

ناظم کی وفا کیشیوں کا صلہ بارگاہ حسن سے ملا تو یہ کہ وہ اور زیادہ ہدف ستم بنائے گئے

بعض لوگ ہیں کہ تسکین دے رہے ہیں کہ تمہارا خیال ہی غلط فہمی پر مبنی ہے، وہ صنم حیلہ گر اب آیا اور اب آیا، لیکن دل کی آواز کہہ رہی ہے،

مجھ سے بگڑے ہوئے مدت ہوئی ان کو ناظم بیچ والے ہیں ابھی بات بنائے جاتے

سہل ممتنع | شعر و شاعری میں ایک اہم چیز سلاست و روانی یا بالفاظ اصطلاح سہل ممتنع ہے۔ ناظم اس میدان کے بھی شہسوار، یکہ تاز اور مرد میداں ہیں۔ سہل ممتنع کی تعریف یہ ہے کہ کلام روزمرہ سے اس قدر مرصع ہو کہ گمان یہ کیا جائے کہ اس سے بڑھ کر آسان اور سلیس کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ پڑھنے والے کو یہ غلط فہمی ہو کہ یہ تو کیا ہے میں خود اس سے کہیں بہتر کہہ سکتا ہوں لیکن دعویٰ ثابت کرنے کے لئے جب ہاتھ قلم دوات سے آشنا ہوں تو معلوم یہ ہو کہ

دل کی مٹی دل سے کہنا سہل ہے پر آسان نہیں

خیال کرلینا جتنا آسان تغافل کرکے دکھانا اس سے کہیں مشکل ہے۔ دوسری سب سے اہم خصوصیت اس کلام کی یہ ہے کہ پانی کی طرح رواں ہو، تیر کی طرح بے پناہ ہو اور محبت کی طرح دل میں گھر کرتا ہو۔

کلام ناظم کا آپ مطالعہ کیجیے، تو محسوس کریں گے کہ ناظم اس میدان کا بھی مرد میداں ہے۔

گ و ظ کی ردیف بہت سخت ہے، بالعموم ایسی زمینوں میں طبع آزمائی اس وقت کرتے ہیں جب "خانہ پری" مقصود ہوتی ہے۔ لیکن ناظم کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ الفاظ وضع اسی ردیف اور ناظم کے لئے کئے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو

ہم سے چھٹتی ہے کہیں بادہ پرستی ناظم — منہ پر واعظ کے کیا کرتے ہیں ناچار لحاظ

کیا غضب ڈھائے دیکھئے ناظم — ہے برا چشم خوں فشاں کا رنگ

یہ اشعار ملاحظہ ہوں،

وصال دائمی کا ہے تصور — بہار بے خزاں ہے اور میں ہوں

مزا دیتا ہے تنہائی میں رونا — کہ اک دریا رواں ہے اور میں ہوں

تحمل کی نہیں اب تاب زنہار — نبرد آسماں ہے اور میں ہوں

یہ حسن اتفاق ملاحظہ ہو،

خوش ہو رہے تھے ہم کہ بنایا ہے ہم نے یار — دیکھا تو ان کے در پہ وہ دربان ہی نہیں

یہ شعر بغیر کسی تشریح کے سنئے،

وہ سن کر درد دل کہتے ہیں پھر میں کیا کروں ناظم + خلاصہ آپ کی تقریر کا یہ ہے کہ "مرتے ہیں"

روانی کے ساتھ جذبات کی لطافت ملاحظہ ہو،

ہم نہیں چاہتے کہ دولت ہو — کون ممنون بخت و قسمت ہو

آستیں بھی نچوڑ ڈالیں گے　　　اشک کے پوچھنے سے فرصت ہو

شاعرانہ مبالغے کے ساتھ جذبات کی یہ تصویر کشی کتنی خوب ہے،

شب غم کی درازی قصہ کوتہ یوں سمجھ لیجے　　　کہ یہ وہ شب ہے جس کے بعد صبح روز محشر ہو

باتوں باتوں میں کتنے پتے کی بات کہہ رہے ہیں،

وفا کی ہم نے اور تم نے جفا کی　　　تم اچھے، ہم برے، قدرت خدا کی

جنون عشق کے باوجود یہ "حکمت عملی" کتنی داد طلب ہے؟

پڑھ کے خط نام غیر سے ان کو　　　حال اپنا سنا دیا میں نے

بہ ذیل "خمریات" یہ شعر بھی خوب ہے،

ناظم ہمیں نظر نہیں آتا وگرنہ آج　　　اس کو بھی سوئے خانۂ خمار کھینچئے

ملا ہے مے کدے کا در کھلا ہوا ناظم　　　پھر اور کہتے ہیں تائید کردگار کسے؟

قطعۂ ذیل روانی، سلاست، ہجوم جذبات اور وفور محبت کا کتنا کامیاب مرقع ہے!

کل کہا میں نے کہ اے نامہرباں　ق　آدمی کو آدمی سے کام ہے

دیکھ تو کب سے یہ تیرا دردمند　　　عشق میں رسوائے خاص و عام ہے

جانتا ہے تو بھی آیا یا نہیں　　　کوئی تیرا عاشق ناکام ہے؟

سن کے ساری داستاں بولے کہ "ہاں　　　آپ کا یوسف علی خاں نام ہے"

اشعار ذیل بھی اپنی سادگی اور کیف و اثر کی آپ ہی نظیر ہیں:-

یوں تو چھیڑ ان کو ہر کسی سے ہے　　　پر عداوت فقط مجھی سے ہے

دوست بن کر ہمیں بناتے ہیں　　　دعویٰ دوستی ہنسی سے ہے

کیوں چھپاتا ہے حال رنجش غیر　　　ہم نے بھی سن لیا کسی سے ہے

میرا ان کا معاملہ ناظم　　　کچھ جدا جنگ و آشتی سے ہے

اپنے دل کی خود "مخبری" کرتے ہیں،

نہ بیاباں نہ خیاباں کوئی کوچہ ہوگا　　جانتا ہوں دل صد پارہ جہاں رہتا ہے

یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔ ادائگی مفہوم کے ساتھ بے تکلفی زبان کا اتنا نادر نمونہ شاید ہی کہیں مل سکے،۔

جب کہوں کیوں خفا ہو کیا باعث؟　　کہتے ہیں "پوچھنے کا کیا باعث؟"

اس سلسلے میں یہ آخری شعر بھی سن لیجئے،۔

کسے یہ کون کہ تم کیوں وفا نہیں کرتے؟　　وہ کیا کہیں گے مگر یہ کہ "جا' نہیں کرتے"

زور زبان و حسن بیان | ناظم جب روانی و سلاست کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ غالب کے شاگرد نہیں معلوم ہوتے بلکہ میر تقی میر کے اسکول کے طالب علم یا میر درد کے حاشیہ نشیں، یا خواجہ اثر کے زلہ ربا معلوم ہوتے ہیں یا مومن کے رنگ سے ان کا رنگ مل جاتا ہے جس کے مختلف نمونے آپ سطور بالا میں ملاحظہ کر چکے ہیں لیکن جب وہ اپنی طاقت لسانی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں، اپنی خطابت کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں، اپنے جوش بیان اور زور زبان کا لوہا منوانا چاہتے ہیں تو ذوق و سودا کے ہم عصر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ جن باتوں کو وہ صاف، سادہ اور دلنشیں الفاظ میں ادا کرتے ہیں اسی مفہوم کو وہ پرجوش، زوردار اور خطیبانہ لب ولہجے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ بطور ثبوت ملاحظہ ہو۔

نوبت ہو تیری گردش چشم سیاہ کی　　دنیا میں دور گنبد دوّار ہو چکا

ہو ناوک نگہ کے مقابل خدنگ آہ　　اب میرا وار روک، ترا وار ہو چکا

چاہئے تجھ سے رہیں بندہ و آزاد ملول　　چاہئے تجھ سے کریں کافر و دیندار لحاظ

نہ تجھے حشر کا اے فتنۂ ایام خیال　　نہ تجھے خلق کا اے شوخ ستمگار لحاظ

کتنے پرشکوہ الفاظ ہیں۔ اپنے عشق کے متعلق اظہار رائے کرتے ہیں۔

• ابتداءِ عشق میں ہوں منتہی میرا آغاز اور کا انجام ہے

اور لوگ کہتے کم

سن تو لیتے ہیں نہ مانیں گرچہ بات کیوں نہیں سنتے ہو یہ کیا بات ہے.؟

اپنے محبوب سے مطالبہ کرتے ہیں،

ستم کرو ہم پہ بے تحاشا، لحاظ کس کا ہے، خوف کیا ہے؟

اگر ہے گریہ تو بے اثر ہے، اگر ہے نالہ تو نارسا ہے

رندِ تشنہ کام ساقیِ جرعہ بخش سے مخاطب ہے،

ختم بھی ہوتا تو تسلی مری ہوتی ساقی بس یہی بادہ کہ کچھ شیشے میں کچھ جام میں ہے

افسانۂ غم ختم نہیں ہوتا تو کہتے ہیں،

حکایتِ غمِ ہجراں ابھی سنے جاؤ شکایتِ تعبِ انتظار باقی ہے

اپنے تئیں تسلی دیتے ہیں،

عبث ہے اے دل فغان و زاری عبث ہے لے دیدہ اشکباری

عدو سے مانا کہ ہے لگاوٹ، مگر وہ کس سے وفا کریں گے؟

بڑھا ہے درباں سے ربط باہم، یقیں ہے اب سب رقیب اپنے

گلی میں ان کی پھرا کریں گے، ہم ان کے در پر رہا کریں گے

محاکات | ماہرینِ سخن اور نقادانِ فن کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ شاعری محاکات کا دوسرا نام ہے یا محاکات کو شاعری کہتے ہیں یعنی کسی واقعے کو بالخصوص کسی ایسے واقعے کو جو محبوب سے متعلق ہو اس طرح بیان کرنا کہ آنکھوں کے سامنے تصویر پھر جائے، یہ معلوم ہو کہ یہ واقعہ اپنی تمام جزئیات و تفاصیل کے ساتھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں اور حظ حاصل کر رہے ہیں۔ ناظم محاکات کے بھی بادشاہ ہیں، وہ جذبات کے بھی بہترین مصور ہیں، وہ احساسات عشق کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سماں پھر جاتا ہے مثلاً،

ہوتے ہی درد دل کا بیاں اٹھ کھڑے ہوئے　　　یعنی یہ ایسے ہیں کہ نہ ان سے سنا گیا

آج پھر ان سے میں احوال دل زار کہوں گا　　　کہتے ہوئے ڈرتا ہوں یہ ناچار کہوں گا
غصہ میں کہا ہوسکے ہم اب کچھ نہ کہیں گے　　　گر آپ سنیں گے تو میں سو بار کہوں گا
پہلے کہے دیتا ہوں تم آزردہ نہ ہونا　　　دلچسپ لطیفے بھی ہیں دو چار کہوں گا

ایک بار ناصح اپنی رو میں ناظم کے سامنے اس غارتگر صبر و شکیب کا نام لے گئے، ناظم ابل پڑے۔

روکو تو سہی اب مجھے۔ لو۔ حضرت ناصح　　　لینا ہی نہ تھا نام "کسی کا" مرے آگے

شعر ذیل دیکھئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہمارے سامنے ہی ہو رہا ہے۔

کب میں نے کسی بات پہ تکرار نکالی　　　دیکھا مجھے اور آپ نے تلوار نکالی

ناظم ایک بار حریم ناز میں باریاب ہوئے، وہاں جو کچھ پیش آیا ان کا موئے قلم اس کی نقاشی کرتا ہے۔

گیا تھا کہ ان کی خوشامد کروں　　　وہ الٹا مجھی کو بنانے لگے
کبھی خیر مقدم، کبھی مرحبا　　　زباں پر یہ الفاظ لانے لگے
کبھی میرے قربان ہوتے رہے　　　کبھی مجھ کو پنکھا ہلانے لگے

.. ..

وہ محفل میں آئیں تو ناظم ضرور　　　مغنی یہ اشعار گانے لگے

یہ سوال و جواب ملاحظہ ہوں،

کہئے اگر کہ طرز ستم ناپسند ہے　　　کہتے ہیں واہ آپ کی بھی کیا پسند ہے

ظلم وہ کچھ اور پھر یہ عذر بدتر از گناہ　　　کہتے ہیں مجبور ہوں ناظم تری تقدیر سے

عاشقانہ فروگزاشتیں عشق و محبت کی دنیا ایک عالم ہے ماورائے عقل و ہوش۔ ایک عاشق ناکام جو ہجر و فرقت کے مصائب جھیلتا ہے، ہزیمت و پسپائی سے دوچار ہوتا ہے اور حسرت و الم سے آشنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے نفس و جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتا، عالم خیال میں اس کا صدر نشین بزم تخیل بصد ناز و ادا جلوہ فرما ہوتا ہے، تو وہ سوچتا ہے کہ آلام ہجر کی شکایت یوں کرنا چاہیئے، درد فرقت ایسے مؤثر انداز میں بیان کرنا چاہیے کہ اس کا دل بھی موم ہو جائے، دل کی بپتی کچھ اس طرح پیش کرنی چاہیئے کہ "وہ" جفا کار بھی تڑپ اُٹھے لیکن حسن اتفاق سے جب وہ موقع حاصل ہو جائے، جب حسرت تکلم پوری ہو رہی ہو، جب آنکھیں لطف دید سے آشنا ہو رہی ہوں، اس وقت دماغ کے تیار کئے ہوئے سارے نقشے درہم برہم ہو جاتے ہیں، زبان گنگ ہو جاتی ہے، اور بیان مدعا کی جرأت نہیں پڑتی لیکن اس منظر کے اختتام کے بعد پھر یاد آتا ہے کہ ہم نے کہا کیا؟ صرف حسرت دید پوری کرتے رہے، زبان حرف شکایت سے آشنا نہ ہو پائی۔ یہ احساس حد درجہ ہوش ربا اور تکلیف دہ ہوتا ہے، لیکن چونکہ "بعد از وقت" ہوتا ہے، اس لئے لاحاصل۔

یہ مواقع ناظم کو بھی پیش آئے اور اپنی حسرت کو انھوں نے بھی مختلف اسالیب سے بیان کیا ہے مثلاً

کل ہم ان سے مل کے کہہ آئے سب اپنا درد دل
پھر بھی ناظم شکوۂ بیداد درباں رہ گیا

رہ تو آیا اس سے لیکن ہم نشیں دل میں کہتا ہوں کہ ناظم کیا کیا؟

وعدہ پر اس سے کیوں قسم مانگی مفت بگڑی، بنی بنائی بات

بت سے ناخوش ہے تو کیوں اٹھ نہیں جاتا ناظم

دیر میں تذکرۂ کعبہ و زمزم کب تک ؟

اس ستم گر کے ظلم سہہ سہہ کر اور ظالم بنا دیا میں نے

وہ عذر ہائے موجّہ سنے کہ کیا کہئے ہوئے ہم ان سے گلہ کرکے شرمسار بہت

محبوب سے اختلاف | اگرچہ جذبات محبت، والہانہ حد تک پہونچے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھی اپنے محبوب سے اختلاف بھی کرجاتے ہیں۔ اشعار ذیل ملاحظہ فرمایئے، ان میں حسن بیان، لطف زبان، بے ساختگی الفاظ، اور واردات قلب کا جتنا مکمل نقشہ کھینچا ہے وہ تعریف و توصیف سے قطعاً بے نیاز ہے۔

تم دیدۂ گریاں کو کہا کرتے ہو ناسور میں ضد سے اسے ابر گہر بار کہوں گا
آوارہ و سرگشتہ مجھے کہتے ہو اچھا میں بھی تمھیں بے مہر و ستمگار کہوں گا
گھر بیٹھے ہوئے تم جو مجھے کہتے ہو مجنوں میں تم کو نہ لیلیٰ اسیرِ بازار کہوں گا؟
تم چاند سے مکھڑے پہ کیا کیجیو ناز ش میں کاکلِ مشکیں کو شب تار کہوں گا

ایک بار بزم محبوب میں جو پہونچے تو بازپرس ہوئی اور حکم دیا گیا کہ تشریف لے جایئے، ناظم رخصت ہونے سے پیشتر بالفاظ ذیل "صدائے احتجاج" بلند کرتے ہیں:۔

مجلس کو توڑ دیجئے میں سب کے ساتھ ہوں لیکن مجھے نہ بزم سے تنہا اُٹھایئے

شانِ عاشقانہ | ناظم کو اپنی عاشقانہ شان پر پندار ہے، فخر ہے اور بلا کسی تامل کے وہ صاف صاف الفاظ میں ظاہر بھی کرتے رہتے ہیں اس لئے کہ محبوب کو "غلط فہمی" نہ ہو اس لئے وعدہ خلافیوں اور اپنی انتظار آزمائیوں کو ظاہر کرتے ہیں،

وعدہ گر رد کرئے جایئے گا روز سمجھوں گا کہ آج آیئے گا

اپنے متعلق "صفائی" دیتے ہیں،

عبث ہے خوف شکایت بس آکے مل جاؤ　　رہے ہیں یاد ستم ہائے بے شمار کسے ؟

بزم حسن میں بلا اذن و اجازت باریاب ہونا چاہتے ہیں، اس لئے چاہتے ہیں کہ تقریب ملاقات کے لئے کچھ فکر کریں، اسی کشمکش میں یہ شعر ہوگیا،

گزرے گی شغل حیلہ تراشی میں شب مجھے　　جانا ہے بزم یار میں کل بے طلب مجھے

کہتے ہیں،

تمہاری ہر بات دلنشیں ہے، کسی طرح کا گلہ نہیں ہے

جو داد دیجے تو آفریں ہے، جو ظلم کیجے تو مرحبا ہے

لے ہم بھی جھوٹا سمجھتے ہیں لیکن　　خوش آتی ہیں باتیں بنانی کسی کی

پھر رہا ہے وہ آج کچھ خوش خوش　　تو نے ناظم سے کیا کہا ہوگا ؛

تسلی | "اس کی ستم رانیوں اور جفا کاریوں کا جواب خود دیتے ہیں۔ جب ہم نشیں نہیں ملتا، ہمدرد و غم گسار نہیں ملتا، تو اپنے دل میں خود توجیہیں اور تاویلیں کرتے ہیں، اور دل کو مطمئن کرتے ہیں۔ یہ توجیہہ و تاویل بھی اپنے اندر حسرت و الم کا نہایت ممتاز رنگ رکھتی ہے۔

خوبی قسمت سے خبر ملی کہ وہ کشور دل کا خسرو بصد شان کجکلاہی آرہا ہے، دل بانسوں اچھلنے لگا، ہوش و حواس رخصت ہوگئے، قوت فہم و فکر زائل ہوگئی، اور مبہوت سے ہوکر رہ گئے، تو اپنے تئیں تسلی دیتے ہیں کہ اس قدر اضطراب کی کیا بات ہے،

ترے گھر وہ آئے ناظم تو یہ اضطراب کیا ہے　　کوئی بادشاہ آیا کوئی شہریار آیا ؟

یہ مانا کہ نالہ نارسا ہے، آہ بے اثر ہے لیکن

ناظم تم ان سے رو رو کے جاؤ حال دل　　کب تک نہ دیں گے ازرہ شرم و حیا جواب

غلط سہی اثر آہ و نالہ پر ناظم　　ہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

اچھا ہوا کہ موسم گل میں ہوئے اسیر　　چھوڑا ہے ہم نے باغ کو برگ و نوا کے ساتھ
رد و قبول خلق سے ناظم غرض نہ رکھ　　اچھا ہے گر معاملہ تیرا خدا کے ساتھ

لگاوٹ غیر سے اس کی جلا کر خاک کر دیتی　　سمجھتے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر کس کا ہے؟

خوف اثر تو نالہ سے ہے گو اثر نہیں　　سنتے ہیں ہم کہ ان کو ہمارا خیال ہے

شکوہ | زبان کبھی کبھی حرف شکایت سے بھی آشنا ہو جاتی ہے، لیکن نہایت بے کسانہ لب و لہجے میں،

میں تو اٹھنے ہی کو تھا بزم سے کیا ہو جاتا　　جام سے غیر کو دیتے تم اگر میرے بعد

شکوہ بطور طنز

میری وفا کی داد نہ جرم عدو سے بحث　　کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں

شبستاں میں رہو، باغوں میں کھیلو، مجھ سے کیوں پوچھو
کہ راتیں کس طرح کٹتی ہیں دن کیوں کر گزرتے ہیں

طنز | بایں دعوائے الفت و محبت، محبوب پر کبھی کبھی "چوٹ" بھی کر جاتے ہیں،

ان کو خیال تھا کہ نہیں گے خبر کبھی اور　　اچھا ہوا مریض محبت، برا ہوا

خدا کا خوف ہو تو دل کی بیتابی پہ رحم آئے　　وگرنہ رقص مرغ نیم بسمل بھی تماشا ہے

ہوتے ہی درد دل کا بیاں اُٹھ کھڑے ہوئے
یعنی یہ ایسے ہیں کہ نہ ان سے سنا گیا
تم خوش ہوئے ہو بزم میں آنے سے غیر کے
یہ بھی خبر نہیں ہے کہ ناظم خفا گیا

آپ تو
آئے تھے پوچھنے مرے آنسو کدھر چلے
گھبرا گئے تراوش خون جگر سے آپ ؟

عذر ستم فریب و تمنائے صلح جھوٹ
صحبت بگڑ گئی تو بناتے ہیں اب مجھے

پتے کی باتیں | ناظم چونکہ ایک تجربے کار عاشق ہیں، راہ محبت کے گرم و سرد سے واقف ہیں، اس لئے اس معاملے پر جو بات کہتے ہیں وہ اس شان سے کہ

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے

مثلاً

ملتا ہے امتحان وفا میں مزا ہنوز
ناظم اگرچہ تجربہ سو بار ہو چکا

ناظم وفائے وعدہ کی امید ہے کسے
مرنا بھی اس فریب میں دشوار ہو گیا

بھید کے معلوم کرنے کے لئے غم خوار ہیں
عاشق زار اس کے ہیں کہنے کو میرے یار ہیں
سادہ رویوں کو غلط کہتے ہو ناظم سادہ دل
ان کو بھولا کون کہتا ہے بڑے ہشیار ہیں

ہے وہ تقریب فراق اور یہ تمہید وصال
وصل سے لطف سوا نامۂ و پیغام میں ہے

چھیڑ چھاڑ | ناظم ایک شوخ و شنگ طبیعت کے مالک ہیں، عشق و محبت میں یکسر بلکہ تمام تر نتادگی و نیازش سے کام لینا پڑتا ہے، خوش طبعی اور پر لطف سخن آرائیاں اور زیادہ باعث کلفت

تی ہیں، لیکن ناظم اس غم والم کی فراوانی کے باوجود کبھی کبھی ہنس لکھ بھی نظر آتے ہیں اور صرف
ں نہیں بلکہ محبوب پر بھی کبھی کوئی فقرہ کس دیتے ہیں، کبھی کسی اور انداز سے لے چھیڑتے ہیں،
نں اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا کوئی نہ کوئی موقع نکال ہی لیتے ہیں، فرماتے ہیں،

بست چپ بیٹھا ہے آخر شکوۂ بیجا کریں ۔۔۔ اس بہانے سے وہ گرم گفتگو ہو جائے گا

ہیں اب منع کریگا ہمیں کیوں کر درباں ۔۔۔ طرح سے خانہ پڑی ہے در دلدار کے پاس

ہنے مقصد کے لئے تو بھی اگر لائے رجوع ۔۔۔ کاش مجذوب کہیں سب ترے دیوانے کو

ف کیا ہے گر صورت میں مہر و مہ سے بہتر ہو ۔۔۔ طریق ظلم میں بھی دو قدم گردوں سے بڑھ کر ہو

رہا ناظم کوئی دن اور زندہ ۔۔۔ ترے ناوک نے سنتا ہوں خطا کی

ظم کبھی نہ کوچے میں تیرے قدم رکھے ۔۔۔ بیچارہ کیا کرے کہ یہی رہ گزار ہے

کیوں چھپاتا ہے حال رنجش غیر ۔۔۔ ہم نے بھی سن لیا کسی سے ہے

یو تو کہ وہ غصہ میں کیا کرتے ہیں ناظم ۔۔۔ کیوں ان سے کبھی شکوۂ بے جا نہیں کرتے

بخی | شعرا کا ایک اہم موضوع رندی و سرمستی، شوخی و بذلہ سنجی اور واعظ و ناصح کے ساتھ
ک وجدل ہے۔ بلا استثنا ہر شاعر نے بقدر زور طبیعت واعظ و ناصح کی پگڑی اچھالی ہے،
ازے کسے ہیں اور ان بے چاروں کو ہر طرح آماجگاہ زور طبع بنایا ہے۔ ناظم بھی کسی سے

پیچھے نہیں ہیں۔ وہ بھی اپنی رندی و سرمستی کی حکایتیں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں انھیں بھی جب واعظ یا ناصح سے پالا پڑتا ہے تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے وہ فقرے کستے ہیں کہ شاید ناصح صاحب یا واعظ صاحب بھی ہنسے بغیر نہ رہتے ہوں۔ لیکن اس کا خیال رکھا ہے کہ ابتذال و سوقیت کی اپنے دامن کو ہوا کبھی نہیں لگنے دی، حالانکہ اس میدان میں "بڑے بڑے شعرا" سے "بڑی بڑی لغزشیں ہو چکی ہیں۔ درحقیقت یہ وادی بھی ہے بہت خارزار۔ ابتذال و شوخی میں بہت کم فرق ہے، یوں تو شوخی نہایت پسندیدہ چیز ہے لیکن ذرا ابتذال کا رنگ آیا کہ شعر نظر سے گرا بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ شاعر نظر سے گرا۔

لیکن ناظم نے سنجیدگی اور ظرافت کو ساتھ ساتھ نباہنے کی کوشش کی ہے اور میرا خیال ہے کہ اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے، مثلاً

واعظ و شیخ سبھی خوب ہیں کیا بتلاؤں ۔۔۔ میں نے مے خانہ سے کس کس کو نکلتے دیکھا

لی محتسب نے گھر کی تلاشی تو کیا ہوا ۔۔۔ نکلا سبوئے کہنہ میں سرکہ بھرا ہوا

عزم حجاز حضرت ناظم سے تھا بعید ۔۔۔ سنتا ہوں راہ میں سے پھر آئے بھلا ہوا

زاہد کو کیوں شراب کا یارب مزا پڑا ۔۔۔ رسوائے شہر و کوچہ و بازار ہو گیا

سکیں کا لین دین نہ تھا مے فروش سے ۔۔۔ آخر گدائے خانہ خمّار ہو گیا

معتقد ہوں کعبہ کا ناظم گرچہ واں جاکر مجھے ۔۔۔ عبرت آتی ہے کہ کیا بتخانہ ویراں ہو گیا

حرمت مے میں سنا کیجئے واعظ کا بیاں ۔۔۔ بحث ناداں سے کیوں کیجئے دانا ہو کر

معقول سہی وجد کا حیلہ مگر اے شیخ — اچھا نہیں باایں ہمہ تمکین و وقار رقص

معرفت عالم و عابد کو کہاں ہے ناظم — بس یہ اتنے ہیں کہ اورا د و مسائل جانیں

اس بت کا کوچہ مسجد جامع نہیں ہے شیخ — اٹھیے اور اپنا یاں سے مصلا اٹھائیے

پڑھتا ہے شراب پی کے لاحول — ناظم رندوں میں پارسا ہے

محروم کیوں رہیں گے شراب طہور سے — آخر خدا کے بندے ہیں ہم بادہ خوار بھی

آج ساقی یار کے گھر دعوت اغیار ہے — کیا مزا ہو گر خم مے میں نمک واں چھوڑ دے

حقائق | ناظم صرف ایک عاشق ناکام ہی نہیں ہیں کہ جن کا صحیفۂ زندگی عشق و محبت کی داستانوں، ہوا و ہوس کی حکایتوں، اور رندی و سرمستی کے ولولوں سے لبریز ہو، بلکہ وہ صحیح معنوں میں ایک "شاعر" ہیں۔ ان کی نظر فطرت کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے اور وہ وہ سب کچھ دیکھتے ہیں جو ایک مفکر دیکھ سکتا ہے۔ جب وہ حقائق و معارف، اسرار و نکات، اور حکمت و موعظت پر کچھ کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ایک نکتہ رس اور دقیقہ سنج فلسفی ہے جو رموز فطرت کی گرہ کشائی کر رہا ہے۔ اس موضوع پر جب وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی حیثیت بالکل بدلجاتی ہے۔

مثلاً منصور و نعرۂ منصور پر تقریباً ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے اور جس کی رسائی فکر جہاں تک ہو سکتی تھی وہاں تک اس نے اپنے خیالات اپنے اسلوب میں ظاہر کئے ہیں لیکن ناظم نے اس مسئلہ پر جو بات کہی ہے وہ نہ صرف اپنے انداز بیان، اور اسلوب ادا کے اعتبار سے بہت خوب ہے بلکہ نفس مسئلہ پر انھوں نے اپنی جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی ان کی دقت نظر پر شاہد

ہے۔ کہتے ہیں،

اے نواسنج اناالحق ترادعوئے سچ ہے　　　　لیک دستور نہیں قطرہ کو دریا کہنا

اس موقع پر مجھے اکبرالہ آبادی کا بھی ایک شعر یاد آگیا۔ انھوں نے بھی بہت معقول بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں،

حضرت منصور "انا" بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ

دار تک تکلیف فرمائیں جو اتنا ہوش ہے

اکبرصاحب کہتے ہیں کہ منصور "حق" کے ساتھ "انا" بھی کہہ رہے ہیں، جب ان میں اتنا ہوش ہے کہ "انانیت" اب تک باقی ہے تو وہ مستحق دار ہیں۔ یہ بات تو وہی کہہ سکتا ہے جس کے ہوش و حواس گم ہو چکے ہوں اور اتنا واصل بالحق ہو چکا ہو کہ وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ میں اس حقیقت سے مل گیا لیکن جو شخص اس منزل پر پہنچ جائے گا وہ "من و تو" کے امتیاز سے بیگانہ ہو جائے گا اور آپ جب ابھی اس منزل میں ہیں کہ آپ کو "انا" کا احساس ہے تو آپ دار تک تکلیف کیجئے۔

ناظم کہتے ہیں "اناالحق" کا دعوئے صحیح ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ قطرہ کو دریا کہنا کب مناسب ہے۔ تمہاری حیثیت تو ایک قطرے کی ہے اور وہ "حقیقت" ایک بحر بے کراں، تو ایک قطرے کو یہ کب زیب دیتا ہے کہ وہ یہ دعوٰی کرنے لگے کہ دریا میں ہوں۔ معلوم ہوتا ہے تم اپنی حقیقت ہی نہیں سمجھتے۔

اکبر و ناظم کی فکر کا یہ لطیف فرق ارباب نظر کے لئے یقیناً باعث لطف ہوگا۔ دوسری حقیقت ملاحظہ ہو،

یوں تو ہو جاتا ہے ہر اک عیش و عشرت کا شریک　　　　دوست کہتے ہیں اسے جو ہو مصیبت کا شریک

کون ہوگا کہ نہ ہو معتقد فصلِ بہار　　　　موسم اچھا ہے یہ کہئے کہ یہ موسم کب تک

جو خود برے ہیں کیوں مجھے اچھا کہیں گے وہ   آئینہ کو فروغ نہیں زنگ باز میں

تم اپنی چال سے بدنام ہو گئے ناظم   یہ اہل صومعہ چھپ چھپ کے کیا نہیں کرتے

ہم تو پروانے کے قائل ہیں کہ چپکا جل جائے   بلبل نغمہ سرا عاشق غوغائی ہے

عیش و سرمستی | اوپر کہا جا چکا ہے کہ ناظم کی زندگی کا ماحول عیش و عشرت تھا، چنگ و رباب تھا، ساغر و مینا تھا لیکن اپنے اس ماحول سے بغاوت کرکے انھوں نے اپنی زندگی کے لئے ایک نئی "شاہراہ" نکالی تھی جو وادی نجد میں جاکر ختم ہوتی تھی، لیکن پھر بھی وہ زندگی جس میں ان کی پرورش ہوئی تھی کبھی کبھی ان کے سامنے "خوش باش دمے کہ زندگانی اینست" کی دعوت بھی دیدیتی ہے اور وہ بعض بعض مواقع پر ان جذبات عیش و مسرت کا اظہار بھی کردیا کرتے تھے، نمونہ:

شراب و شاہد و مطرب سے کام رکھ ناظم   کسے خبر ہے کہ انجام کار کیا ہوگا

مجلس اہل ورع نور کا دریا ہی سہی   دل لگی صحبت رنداں مے آشام میں ہے

تسبیح و ورد و دلق و مصلےٰ نہیں پسند   چنگ و رباب و ساغر و مینا پسند ہے

قدرت تشبیہ | تشبیہ و استعارے کو صحیح طور سے استعمال کرنا بھی ایک کمال ہے، بڑے بڑے شعرا نے اس میدان میں ٹھوکریں کھائی ہیں مثلاً آپ نے یہ زبان زد خاص و عام مصرعہ ضرور سنا ہوگا،

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

لیکن اس کا پہلا مصرعہ سنیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تشبیہ و استعارے کو "استادوں" نے کس کس طرح استعمال کیا ہے،

پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی   جو بات کی ..... الخ

لیکن ناظم پامال تشبیہ میں بھی ایک خاص بات پیدا کر دیتے ہیں،

اے وہ ایسا ہی سہی پر ہے تنزل ورپئش   بدشگونی ہے جو تجھ کو مہ کامل سمجھیں

توارد | ناظم کے کلام کا تمام و کمال مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دیوان میں ایسے اشعار بھی ہیں جو غالب سے یا بعض اور شعرا کے اشعار سے ٹکراتے ہیں۔ اب یہ آپ کی خوش فہمی پر منحصر ہے خواہ آپ اسے سرقہ سمجھیں، توارد سمجھیں، سینہ زوری سمجھیں، جو چاہیں سمجھیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کے بعض اشعار دوسرے شعرا کے اشعار سے ٹکراتے ضرور ہیں۔

ناظم کا شعر ہے،

پڑھ کے خط نام غیر سے ان کو   حال اپنا سنا دیا میں نے

اسی مفہوم کا ایک مشہور شعر یہ بھی ہے،

سناتے ہیں انھیں افسانۂ قیس   بہانے ہیں یہ عرض مدعا کے

ناظم :- الفت بری بلا ہے کہ ناظم بایں تمیز + کرنی پڑی رقیب کی بھی التجا مجھے

مومن:- اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل + میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ناظم :- لگاوٹ غیر سے اس کی جلا کر خاک کر دیتی + سمجھتے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر کس کا ہے

غالب:- اشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف + عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ناظم :- کب میں نے کسی بات پہ تکرار نکالی + دیکھا مجھے اور آپ نے تلوار نکالی

غالب:- ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے + تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

ناظم :- بار محفل میں نہ ملتا تھا کسی دن اور اب + روز دو چار گھڑی رہتی ہے خلوت مجھ سے

میر:- کئی بار آنا ادھر لطف سے + عطا پر عطا ہے کرم پر کرم

ناظم :- ملے گی محشر میں داد ہم کو نہ تھا یہ اعتقاد ہم کو + ملی نہ واں بھی مراد ہم کو تو پھر بتاؤ کہ کیا کرینگے

غالب:- ولے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو + اب تلک تو یہ توقع تھی کہ واں ہو جائیگا

ناظم :- عاشق ہوا اس آفت جان پر مرا ندیم + جب خوب میرا محرم اسرار ہو چکا

غالبؔ:۔ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ہو گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

ایہام گوئی: ایہام گوئی یا رعایت لفظی کا اگر موقع سے استعمال کیا جائے تو لطف کلام دو بالا ہو جاتا ہے، لیکن آپ قدیم شعرا کے دواوین اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ تقریباً ہر شاعر نے اس "صنعت لطیف" سے اپنے کلام کو زینت دینا چاہی ہے۔ لیکن جب اس قسم کے اشعار کا استقصا کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ۹۵ فی صدی اشعار نہایت مہمل طور سے خراب ہو کے رہ گئے ہیں۔ ایک زمانے میں تو شاعری، رعایت لفظی، ضلع جگت اور پھکڑ بازی میں منحصر ہو کے رہ گئی تھی لیکن اس دور نامسعود سے پیشتر اور بعد بھی جب شعرا نے اس پر طبع آزمائی کی تو بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے اکثر بالکل ناکام رہے اور جو معدودے چند کامیاب ہوئے وہ بھی صرف کسی حد تک، ورنہ ۹۵ فی صدی ان کے اشعار بھی

ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

کے مصداق ہو کر رہ گئے ہیں۔

لیکن ناظمؔ اس معاملے میں فرد فرید ہیں۔ میں نے ان کے پورے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور اس موضوع پر ان کے جو اشعار میں نے جمع کئے ان میں عیب تلاش کئے لیکن اس کا اعتراف ہے کہ کم از کم میری نظر میں کوئی شعر نہیں کھٹکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑے کمال کی بات ہے کہ رعایت لفظی جیسی صنعت میں کسی شاعر نے سیکڑوں اشعار رکھے ہوں اور ایک بھی ایسا نہ ملے جو مہمل کہا جا سکے یا جس سے لطف زبان میں ذرا بھی رکاوٹ نہ پیدا ہوتی ہو۔ نمونتہً چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ وہ الفاظ خط کشیدہ ہیں جن سے اس صنعت کو ظاہر کیا گیا ہے:۔

کیوں آئے ہو تربت پہ مری ساتھ عدو کے میں مردہ ہوں مردہ کو جلانا نہیں اچھا

ناظمؔ نہ رکھ اس آہوئے وحشی سے چشم لطف جس میں نہیں ہے انس وہ انسان ہی نہیں

تھی نیند حق چشم وہ طالع کو مل گئی ‌‌ ‌ ہے دخل کس کو بخشش پروردگار میں

تم بھی بن جاؤ گے لیلیٰ کی نظیر ‌ ‌ نہ کہو قیس کا ہمسر مجھ کو

رخصت عرض حال کیا مانگوں ‌ ‌ کہہ نہ بیٹھیں کہیں کہ "رخصت ہو"

بیوفائی کا داغ کیسا ہے ‌ ‌ ہم نے مانا کہ ماہ طلعت ہو

منہ ترا دیکھنا نصیب نہ ہو ‌ ‌ منہ سے نکلی اگر شکایت ہو

وہ اُٹھے محفل سے ناظم مجھ کو آتا دیکھ کر ‌ ‌ اور میں سمجھا کہ اُٹھتے ہیں مری تعظیم کو

تکلف کیا ہے گر صورت میں مہر و مہ سے بہتر ہو ‌ ‌ طریق ظلم میں بھی دو قدم گردوں سے بڑھکر ہو

چھوٹی دیکھی جو صراحی مے کی ‌ ‌ میں نے جانا مری قسمت ہو گی

اس کو یوں خاک پہ اے محتسب شرع نہ پھینک ‌ ‌ حرمت بادہ بہت مشرب اسلام میں ہے

بہت کہنے سے آجاتی ہے ضد انسان کو ناظم ‌ ‌ نہ کر تکرار ان سے گو مزا تکرار میں آئے

مردہ زندوں کو تری آن سے ہم دیکھتے ہیں ‌ ‌ زندہ مردوں کو تری تان سے ہم دیکھتے ہیں

خط مرا پڑھ کے تمھیں رحم تو آیا لیکن   یہ بھی قسمت کا لکھا تھا کہ پڑھا میرے بعد

متفرق اشعار : ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر شعر کے اندر کوئی نہ کوئی خوبی ضرور موجود ہے لیکن چونکہ منتخب اشعار کی تعداد کم ہے اس لئے کسی مخصوص عنوان کے ساتھ دو ایک شعر کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ بہر حال وہ اشعار یہ ہیں :۔

تم کرو ترک جفا کیا امکاں   ہم کریں ترک وفا کیا باعث؟

کیا اس نے قتل اور میں نے معاف   عبث اہل شہر اس کا چرچا کریں

خدا کو دینی ہے جان ہمدم، نہیں ہے مرنے کا مجھ کو کچھ غم
یہی ہے رونا کہ میں نہ ہوں گا تو پھر وہ کس پر جفا کرینگے!

ڈرتے ہیں محتسب سے بھلا آئے تو سہی   اچھی کہی کہ ساغر و مینا اٹھائیے

کرتے ہیں عبث غرور کیا آپ؟   ہیں کوئی جناب کبریا آپ؟

کل جو کچھ دل کی بیقراری کا   تذکرہ ان سے ایک بار ہوا
ہنس کے کہنے لگے کہ کیوں صاحب   دل کہاں تھا کہ بیقرار ہوا
اس میں وہ کیا کرشمہ ہے ناظم   جس سے پھر تو امیدوار ہوا

وعدے نے ترے زیست کی توقیر بڑھائی   مرتے ہیں پہ مرنے کی تمنا نہیں کرتے

شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلم پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم

شعرا سے کہتے ہیں کیا کہنا ہے ناظم واہ وا اس غزل کو سن کے ہیں قائل تمہارا ہو گیا

خضر ہے وادیٔ محبت کا کیوں نہ ناظم کے ہم قدم چومیں

چند اور اشعار | ناظم کی وہ مشہور نظم جو "میں نے کہا کہ دعوئے الفت مگر غلط" سے شروع ہوتی ہے اور وہ غزل جس کا آغاز "وہ حسن نہیں نام ندا اور ہی کچھ ہے" سے ہوتا ہے طوالت کے خیال سے قصداً نظر انداز کردیں اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں بہت مشہور ہیں - یہاں یہ ضرورت نہیں تھی کہ ان کا مشہور کلام پیش کیا جائے - اس صحبت کا مقصد تو صرف غیر معروف اشعار کی رونمائی تھی اور بس۔

خستم کلام | کلام ناظم پر غور وفکر کے بعد جو رائے قائم کی گئی تھی اور کلام ناظم کا انتخاب کیا گیا تھا وہ آپ کے سامنے پیش ہے۔

آخر میں جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں یہ اور عرض کردوں گا کہ ناظم کے کلام اور غالب کے دیوان کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ناظم نے اگرچہ غالب سے استفادہ کیا لیکن ان کا رنگ طبیعت، رنگ شاعری اور طرز اسلوب غالب سے بالکل جدا ہے اور یہ فرق صرف زبان و بیان ہی میں نمایاں نہیں ہے بلکہ فکر و خیال میں بھی ایسا ہی اہم فرق نظر آتا ہے جیسا زبان و بیان میں دونوں کا رنگ ایک مستقل چیز ہے۔

غالب ایک فلسفی ہے، ایک خوددار عاشق ہے، ایک گدائے متکبر ہے، فارسی ترکیبیں اطلاق و پیچیدگی کے ساتھ اس کے کلام کا اہم جزو ہیں۔ اس کی رسائی فکر وہاں تک ہے جہاں تک ہر کہ و مہ پہنچ نہیں سکتا۔

برعکس اس کے ناظم ایک شاعر ہے، ایک سر افگندہ عاشق ہے، ایک دل زدہ مظلوم ہے، ایک پیکر ترحم، ایک مجسمۂ حسرت ہے۔ اس کے ہاں نیائش و فتادگی ہے، جاں نثاری و جاں سپاری ہے، اور کبھی کبھی نغمۂ شادی ہے جو دیکھتے دیکھتے نوحۂ غم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

بس ان دونوں کا فرق صرف اسی قدر ہے کہ غالب اپنی "صریر خامہ" کو "نوائے سروش" سمجھتا ہے اور یہ بے چارہ "رخصت عرض حال" ہی کرتا رہ جاتا ہے۔

غزل

از حضرت اصغر گونڈوی

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبار قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

قفس کیا؟ حلقہ ہائے دام کیا؟ رنج اسیری کیا؟
چمن پر مٹ گیا جو، ہر طرح آزاد ہوتا ہے

بہار سبزہ و گل ہے، کرم ہوتا ہے ساقی کا
جواں ہوتی ہے دنیا، میکدہ آباد ہوتا ہے

یہ سب نا آشنائے لذت پرواز ہیں شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

بہار انجام سمجھوں؟ اس چمن کا یا خزاں سمجھوں؟
زبان برگ گل سے مجھ کو کیا ارشاد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موج خون دل سے اک چمن اپنا
وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

سمائے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدۂ دل میں
یہ نظارہ ہے؟ یا ذوق نظر برباد ہوتا ہے!

قفس کی تیلیوں پر شاخ گل کا رنگ ہے ابتک
چمن سے چھٹنے والے کو چمن تو یاد ہوتا ہے

زمانہ ہے کہ خوگر ہو رہا ہے شور و شیون کا
یہاں وہ درد، جو بے نالہ و فریاد ہوتا ہے

مگر کوتاہیٔ ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یہاں مستوں کے سر الزام مستی ہی نہیں اصغرؔ
اب اس کے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

بدچلن بیوی

ہم چائے خانے میں بیٹھے ہوئے ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ بات میں بات نکل آتی ہے کسی نے ان بھلکڑوں کا تذکرہ چھیڑ دیا جو اور باتیں تو ایک طرف خود اپنے ذاتی معاملات کو خواہ وہ کیسے ہی اہم کیوں نہ ہوں اس طرح بھول بیٹھتے ہیں کہ سن کر نہ صرف تعجب معلوم ہوتا ہے بلکہ بالکل یقین نہیں آتا۔ پھر کیا تھا ہر ایک نے اپنا اپنا تجربہ بیان کیا۔ سنی ہوئی مزے دار کہانیاں دہرائیں دیکھے ہوئے قصے سنائے۔

ان قصوں اور کہانیوں کی ایک عام خصوصیت یہ تھی کہ ان کے ہیرو صرف یونیورسٹی کے پروفیسر، مشہور فلسفی اور سائنس داں ہی تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ علمی مسائل اور نظریوں پر غور و فکر کرنے کی عادت انھیں اپنے ماحول سے بالکل بے خبر کر دیتی ہے۔

چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ہماری نظریں بے اختیار پروفیسر عبدالکریم کی طرف پلٹیں۔ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ وہ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ہیں لہٰذا ہمیں امید تھی کہ اس خصوص میں جناب کے واقعات نہایت ہی دلچسپ ہوں گے۔

لیکن امین بیگ جو اتفاق سے ہمارے ساتھ بیٹھا ہوا تھا بڑا مسخرہ تھا اس نے پروفیسر صاحب پر دیدے لگا دئے اور لگا انھیں سر سے پیر تک گھورنے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی عجیب الخلقت مخلوق کا نہایت ہی غور و خوض اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کر رہا ہے۔

پروفیسر صاحب ان تمسخر آمیز نظروں سے بہت گھبرا گئے۔ آخر ان سے رہا نہ گیا۔ امین بیگ سے پوچھا "کیوں بھئی کیا بات ہے جو اس طرح گھور رہے ہو؟ مجھے دنیا کی کوئی نئی مخلوق تو نہیں سمجھ رکھا ہے جو اس طرح سر سے پیر تک کا جائزہ لیتے ہو؟ میرے سر پر دو سینگ تو نہیں ہیں؟"

امین نے جھٹ سے جواب دیا "نہیں جناب مجھ سے یہ گستاخی نہیں ہو سکتی۔ میں تو دیکھ

یہ خط اسی کا بھیجا ہوا ہے کہ میں "دلفروز باغ" جا کے حیران و سرگرداں پھرتا رہوں اور وہ اپنے عاشق کے ساتھ خالی گھر میں گلچھرے اڑائے۔

لیکن وہ ایسا کیوں سمجھنے لگی کہ میں اس پر شک یا گمان کر رہا ہوں۔ کیوں وہ چپ رہ کر بھی اپنے آپ کو میرے شک و شبہ کا نشانہ بناتی؟

نہیں یہ خط میرے کسی مخلص دوست ہی نے لکھا ہے تاکہ میری آنکھیں کھلیں اور میں اپنی عزت ریزی کا بدلہ لوں۔

آخر ش میں نے جانے کا مصمم ارادہ کر لیا اور کپڑے پہن لئے۔ لیکن غصہ و غضب سے میں کانپ رہا تھا۔ خوف یہ تھا کہ میں اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکوں گا۔

میں نے کپڑے پہن لئے۔ سر پر ٹوپی رکھی اور نکلنے کا ارادہ کیا اور اس وقت ....

اور صرف اس وقت جبکہ میں کامل ایک گھنٹہ غم و الم، یاس و ناامیدی اور غصہ و غضب کے دریا میں غوطے لگا چکا۔

اس وقت مجھے یاد آیا اور تب تک میں بھولا ہوا تھا کہ "ابھی میری شادی نہیں ہوئی"۔

تنقید و تبصرہ

کتب

تجلیات فرخ۔ مثنوی حسن فطرت۔ روح ظرافت۔ حفظ العلوم۔ میکدہ۔ احقاق حق۔ التجائے انوری۔ مغتنمات المعروف بہ خزینۂ صنعت۔ اسلامی نظام تعلیم۔ فضائل رمضان۔

تجلیات فرخ | مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔ تجلیات فرخ کے نام سے فرخ بنارسی کا مجموعہ کلام شائع ہوا ہے تقطیع چھپی۔ کاغذ سفید معمولی ہے۔ علاوہ نظموں۔ غزلوں اور رباعیات کے ایک تبصرہ اور ایک مقدمہ بھی شامل ہے۔ تبصرہ مولانا رضی احمد صاحب رضی بدایونی اور مقدمہ جناب ضیاء احمد صاحب ایم اے پروفیسر علی گڈھ نے لکھا ہے تبصرہ میں شاعرانہ نظر سے اور مقدمہ میں ناقدانہ حیثیت سے جناب فرخ کے کلام پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور اس کی خوبیوں کو مثالیں دیکر پیش کیا ہے

جناب فرخ کے کلام میں علاوہ غزلیات کے نظموں اور رباعیوں کی معقول تعداد ہے اور ایک قصیدہ بتقریب ولادت حضرت علی علیہ السلام خاص طور پر قابل ذکر ہے

پروفیسر ضیاء احمد صاحب کا مقدمہ زبان اردو کی تاریخ اور اس کے دور ارتقائی سے بھی بحث کرتا ہے اور اس موقعہ پر وہ فرماتے ہیں کہ "یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ موجودہ تغزل پہلے کی نسبت واقعیت و اثر کے زیادہ قریب آگیا ہے" اسی بات کو دوسری جگہ ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے کہ "یہ دور درحقیقت حقایق پرستی کا دور ہے"۔ اور مزید تفصیل کے لئے فرماتے ہیں کہ "دور حال کے متغزلین کے خیالات دردمند دل اور وفاپرست روح کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ از دل می خیزد بر دل می ریزد ...."

زبان و شعر میں جس قدر انقلاب گذشتہ پچاس سال میں ہوئے وہ اہل ذوق کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن زمانہ حال کے غزل گو شعراء کو۔ ان "صفات" سے یکسر بیگانہ قرار دینا جو قدماء کی خصوصیات سمجھی جاتی

تھیں اب بھی دشوار ہے اور گو یہ بحث جداگانہ ہے کہ وہ صفات بجائے خود اچھی تھیں یا بُری، ادب و شعر کے لئے ان کا وجود زینت و زیور تھا۔ یا ایک بدنما داغ، لیکن محض یہ واقعہ کہ ہمارے شعراء حال بھی تشبیہہ و استعارہ زبان و بیان میں انہیں اصولوں کے پابند ہیں بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ جسقدر عظیم الشان انقلاب کا رونما ہونا ظاہر کیا جاتا ہے وہ غالباً مبالغہ شاعرانہ کے حدود میں داخل ہے۔

جناب فرخ کے کلام میں لطف زبان بھی ہے اور لطف بیان بھی۔ مضامین میں پستی و قدامت پسندی نہیں تخیل بلند ہے اور بالعموم غزل اچھی ہے بعض اشعار نہایت عمدہ ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں ان سے انتخاب منظور نہیں ہے

فرخ اجل نے کھول دئے عقدہائے زیست
تھا انکشاف حاصل اخفائے راز کا

... ...

پھر گئی چاک گریبان کی نگاہوں میں بہار
جلوۂ گل کس قدر فرخ جنوں انگیز تھا

... ...

بقدر ذوق سجود آستاں نہیں ملتا
زمیں ملے تو ملے آسماں نہیں ملتا

... ...

جرس کی آتی ہے کانوں میں دور سے آواز
تلاش میں ہوں مگر کارواں نہیں ملتا

... ...

کتاب بحیثیت مجموعی دلچسپی سے پڑھنے کے قابل ہے قیمت عصر اور علی ہادی صاحب فرزند مصنف محلہ انصار اناؤ سے مل سکتی ہے۔

مثنوی حسن فطرت | مصنفہ جناب منشی گورکھ پرشاد صاحب عبرتؔ مرحوم گورکھپوری مطبوعہ ایوان اشاعت

گورکھپور۔

ملک کے نوجوان اہل قلم جناب مجنوں گورکھپوری کی ادبی خدمات کے سلسلہ میں یہ مثنوی حسن فطرت حاصل ہوئی ہے جو کئی حیثیتوں سے دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔ چمکدار دبیز سفید کاغذ پر۔ جیبی تقطیع اور عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے جناب مجنوں کا مقدمہ مثنوی کی خصوصیات پر ایک جامع مضمون ہے۔ منشی گورکھ پرشاد صاحب گورکھپور کے ممتاز وکیل تھے۔ ادب وزبان کا ذوق رکھتے تھے اور شعر سے خاص مناسبت تھی ان کا زمانہ حالی وآزاد کا زمانہ تھا تعلیم نے اس اثر کو اور پھیلا دیا چنانچہ مثنوی لکھی تو قدیم طرز کو چھوڑ کر تمثالیہ صورت اختیار کی اور حسن۔ دل۔ روح کی ایک دنیا بنالی اور انھیں کو قصہ کے افراد قرار دے کر ایک فسانہ بنا دیا

مثنوی کی بحر بھی جداگانہ ہے زبان نہایت صاف اور محاورات کا برمحل صرف پرلطف ہے

ہر ایک فتنہ کو دم دے کے وہ سلاتا ہے
وہ اپنی گوں پہ ہر اک شخص کو لگاتا ہے

... ...

مری نگاہوں میں تاریک سب خدائی ہے
جگر کی چوٹ ہے فرزند کی جدائی ہے

لیکن اس جدت طرازی سے قصہ کا لطف نہایت کم ہوگیا شاعرانہ حیثیت سے اس امر پر تنقید کرنا دشوار ہے اس لئے اس جدت طرازی نے اس کو قدیم طرز کی مثنویوں سے بالکل جداگانہ حیثیت دیدی ہے کتاب کی طباعت نہایت دیدہ زیب اور کاغذ قیمتی اور خوبصورت ہے ۱۲ قیمت پر ایوان اشاعت گورکھپور سے حاصل ہوسکتی ہے

روح ظرافت | مرزا عظیم بیگ چغتائی ایم اے ایل ایل بی وکیل جودھپور اپنی ظرافت نگاری اور رسائل نوازی کے باعث مشہور اہل قلم ہیں۔ آپ کی ظرافت کا حلقہ بہت وسیع ہے اور وہ ہر قصہ اور ہر بات میں اس طرح چمک اٹھتی ہے کہ کثیر التعداد اردو قصے پڑھنے والے اس سے لطف اٹھاتے ہیں

کالج اور نوجوان طلبہ کے مذاق کی خصوصیت سے رعایت رکھتے ہیں۔ کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ اور بیان کا لطف کہیں ہاتھ سے نہیں جاتا البتہ قصہ کی حیثیت سے نیز زبان اور ظریفانہ طرز کے اعتبار سے ان افسانوں میں ترقی کی بہت گنجائش ہے

حفظ العلوم | یہ کتاب اردو انسائکلوپیڈیا ہے جو پانچ پانچ سو صفحات کی ڈھائی سو جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ اس کو میاں حفظ الرحمٰن صاحب برادرزادہ حاجی مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار نے نہایت کوشش اور صرف سے مرتب کرایا ہے اس کے اکثر حصے تیار ہو چکے ہیں اور علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کی تحریک خاکساران کو دیدیئے گئے ہیں علامہ موصوف ان جلدوں کو شائع کرانا چاہتے ہیں ان کی خواہش یہ ہے کہ اس کی پہلی جلد شائع ہو جائے جس کے لئے یا تو علم دوست حضرات بطور قرضہ کے تھوڑی تھوڑی رقم دیدیں۔ جو بعد فروخت کے واپس کردی جائیگی یا پیشگی خریداری کی قیمت ادا کردیں جس سے کتاب شائع کی جا سکے۔ پہلی جلد شائع ہو جانیکے بعد ملک اس کی ضرورت معلوم کرے گا اور پھر اللہ نے چاہا تو بقیہ جلدیں تجارتی طریقہ سے شائع ہوتی رہیں گی۔

آج دنیا کی متمدن اقوام کا ذکر چھوڑیئے۔ خود اسی ہندوستان میں بنگالی۔ گجراتی۔ مرہٹی ہندی اور تامل زبانوں میں انسائیکلوپیڈیا موجود ہیں مگر نہیں ہیں تو اس زبان میں جو ہندوستان کی زبان عام ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے۔ جہاں تک قلم کا فریضہ تھا اس نے ادا کردیا اور مبسوط انسائیکلوپیڈیا تیار ہو چکی اب دولت کا فریضہ ہے کہ اس کو شائع کرے

ہم نے خود ابھی تک اس کی کوئی جلد نہیں دیکھی ہے کہ اپنی رائے دے سکیں مگر اہل علم کی ان رایوں کا ضرور مطالعہ کیا ہے جو انھوں نے اس کے اوپر لکھی ہیں اور اس کی طباعت کے لئے پرزور سفارش کی ہے۔

میکدہ | حکیم نیّر صاحب دہلی کی چند نظموں کا مجموعہ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ تقطیع خورد جلد خوبصورت حجم ۸۴ صفحے قیمت مجلد ۱۲ ار غیر مجلد ۸ ار ملنے کا پتہ:۔ سید صفات احمد منیجر دیسی دواخانہ چوک چونے منڈی لاہور

حکیم صاحب نے اس مجموعہ میں چند قومی نظمیں درج کی ہیں اور چند ادبی۔ بہر حبہ غزلیں ہیں

اس کے بعد میں طبی نظمیں ہیں پھر چند اشعار متفرق کلام میں جو ندرت بندش چستی ہے وہ نہایت تعریف کے قابل ہے زبان میں صفائی اور جدت دونوں کا لحاظ ہے ہم کو یہ نظمیں بہت پسند آئیں۔ نہ صرف بیان کے لحاظ سے بلکہ مقبولیت کے لحاظ سے بھی

احقاق حق | مصنفہ مولوی محمد ادریس خانصاحب نجیب آبادی حجم ۹۸ صفحات کتابت و طباعت معمولی۔ سائز جیبی قیمت ۵ر آنہ ملنے کا پتہ مکتبہ عبرت نجیب آباد

اس رسالہ میں مہاتما گاندھی کے مذہبی و اخلاقی خیالات و عقائد پر بحث و تنقید کی گئی ہے جناب مصنف کو مہاتما جی کی غیر معمولی مقبولیت و شہرت کی بنا ر پر یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ ان کے عقائد و خیالات (یعنی تلاش حق) کی اشاعت سے ایک جدید مذہب کی بنیاد پڑ سکتی ہے اس خطرہ کو محسوس کرکے انھوں نے اس تصنیف کی زحمت گوارا فرمائی ہے جناب مصنف کی اس تنقید میں بہت کچھ بحث و نظر کی گنجائش ہے تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن یہ بات ہر آئینہ لائق ستائش ہے کہ اس کتاب کا لب و لہجہ نہایت متین و سنجیدہ ہے اور بجز دو چار لفظوں مثلاً مہاتمائی لہجہ۔ پیغمبرانہ لہجہ۔ ہندی پیغمبر کے جناب مصنف نے خلق و مدارا کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے بحیثیت مجموعی کتاب مطالعہ کے لائق ہے۔

النجاۃ الانوری۔ | مصنفہ نواب زادہ محمد سمیع اللہ ایس جنگ انوری حجم ۱۱ صفحے جیبی تقطیع کتابت و طباعت معمولی قیمت ار جناب مصنف سے الہ آباد کے پتہ پر مل سکتی ہے

ایک مسلسل نظم ہے جو مسلمانوں کی موجودہ پستی اور ادبار سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے

منتخبات المعروف بہ خزینۂ صنعت۔ | مرتبہ جناب بلقیس جہاں بیگم تقطیع کلاں حجم ۴۰ صفحہ کتابت و طباعت متوسط قیمت ۱۲ر غالباً خود جناب مصنف سے آگرہ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

دستکاری پر اردو میں بہت سی کتابیں نکل چکی ہیں لیکن اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی گھروں کی مردہ صنعتوں اور دستکاریوں میں از سرنو جان ڈالنے کی کوشش

کی گئی ہے۔ محترم مصنف کا خیال ہے کہ پرانی دستکاریوں میں جدت پیدا کی جائے تو ناکامی کی کوئی وجہ نہیں ہے اس سلسلہ میں انھوں نے کوششیں بھی کی ہیں اور بڑی حد تک انھیں کامیابی ہوئی ہے اسی کامیابی سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں جا بجا مختلف نمونے دیئے گئے ہیں اور ان کی تشریح کی گئی ہے کتاب ہر حیثیت سے کامیاب ہے ہمیں امید ہے کہ طبقہ نسواں میں اس کی بیش از بیش قدر دانی کی جائے گی تاکہ اس کا بقیہ حصہ بھی شائع ہو سکے۔

اسلامی نظام تعلیم۔ | مترجمہ جناب فضل کریم خاں دُرّانی بی اے تقطیع متوسط حجم ۵۶ صفحے کتابت وطباعت اور کاغذ اچھا قیمت ۶ ملنے کا پتہ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور

یہ رسالہ دراصل ایک جرمن مستشرق ڈاکٹر دانیال ہائی برگ کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ فاضل مستشرق نے نہایت جامعیت اور امعان نظر کے ساتھ قدیم اسلامی نظام تعلیم اور اسلامی مدارس کے طریقہ تعلیم پر بحث کی ہے اس موضوع پر اس سے پہلے بھی بعض حضرات نے لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن شاید مواد فراہم نہ ہونے کی وجہ سے انھیں پوری کامیابی حاصل نہ ہوئی یہ رسالہ بھی اگرچہ مختصر ہے لیکن نہایت تلاش وتحقیق کے بعد لکھا گیا ہے بڑی خوبی یہ ہے کہ مسلمانوں کے قدیم نظام اور طرز تعلیم کا پورا خاکہ ذہن میں کھنچ جاتا ہے جو حضرات اس موضوع پر آئندہ کچھ لکھنا چاہیں گے۔ ان کے لئے یہ رسالہ اساس کا کام دے گا جناب دُرانی نے اس مفید علمی رسالے کا ترجمہ کرکے ایک قابل قدر خدمت انجام دی ہے ترجمہ نہایت صاف وشستہ ہے البتہ ہمیں جناب مترجم سے شکایت ہے کہ امام ابو یوسف کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا انھوں نے بجنسہٖ ترجمہ کر دیا۔ اور اس پر فٹ نوٹ بھی نہیں لکھا ہندوستان میں مسلمانوں کا بڑا طبقہ امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں امام ابو یوسف وغیرہ کو بہت احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اس لئے عام طور پر امام صاحب کے متعلق مسلمانوں کو یہ الفاظ گراں گذریں گے

فضائل رمضان | مصنفہ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور ضخامت ۷۶ صفحات۔ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۵ر ملنے کا پتہ محمد احتشام الحسن کتب خانہ

فیضی بستی حضرت نظام الدین اولیا ، دہلی۔

مولانا نے اس رسالہ میں رمضان لیلۃ القدر اور اعتکاف کے متعلق صحیح حدیثیں جمع فرمائیں ہیں ساتھ ہی دل نشین انداز میں ان کی تشریح بھی کی ہے جس سے .... رمضان کے زمانہ میں عبادت وریاضت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے یہ رسالہ عام مسلمانوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا ۔ خدا حضرت مصنف کو جزائے خیر دے

رسائل واخبارات

سالنامہ اردو گزٹ ۔ کارزار

سالنامہ اردو گزٹ ۱۹۳۲ء | حجم ۶۴ صفحے قیمت ۴ر مقام اشاعت رنگون سالانہ قیمت ۸ر

جامعہ کے کسی پچھلے پرچہ میں اس اخبار پر تبصرہ ہوچکا ہے ایڈیٹر صاحب نے ۱۹۳۲ء کا سالانہ نمبر ہمارے پاس اظہار رائے کے لئے بھیجا ہے بڑی خوشی کی بات ہے کہ رنگون میں اردو کی ہر دلعزیزی ترقی پر ہے اور نوجوانوں کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا ہے جو اس زبان کی ترویج واشاعت کے لئے سرگرمی سے کوشش کررہا ہے ادہر دو چار سال سے کئی اخبار بھی روزانہ اور ہفتہ وار نکل رہے ہیں ان میں اردو گزٹ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب سمر داری لال لکھنؤ پرچہ کو کامیاب بنانے کے لئے بہت کوشاں ہیں

زیر نظر رسالہ مضامین ۔ تصاویر ۔ کتابت وطباعت ہر اعتبار سے کامیاب ہے ۔ مضمون نگاروں کی فہرست میں حضرت عشرت لکھنوی ۔ مولانا عیش امروہی مقیم رنگون ۔ حضرت برق دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ان کے علاوہ جناب محمود حسین صاحب احمر رنگونی خاص رنگون کے رہنے والے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں ۔ ان کی نظم کشف الظنون بہت کامیاب ہے اسی طرح جناب صبا کا مضمون "مانڈلے کے شاہی محلات تاریخی حیثیت سے بہت قیمتی ہے امید ہے کہ جناب صبا برما کے دیگر قدیم تاریخی آثار پر بھی خامہ فرسائی فرمائیں گے ۔

کارزار ہفتہ وار اخبار ماڈل ٹاؤن لاہور سے پنجاب کے جواں عمر اور جواں کلام شاعر حضرت ابو الاثر حفیظ جالندھری کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ دلچسپ۔ دلکش اور سراسر محرک عمل۔ امید ہے کہ یہ اخبار پنجاب کے نوجوانوں میں ولولۂ کار اور جذبہ عمل پیدا کرے گا اور ان کو صحیح راستہ پر چلائے گا۔

اس میں سب سے زیادہ دلچسپ جو چیز ہوتی ہے وہ خود حضرت حفیظ کی نظمیں ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ فلسکیپ سائز ۱۲ صفحے۔ قیمت سالانہ تین روپے

دنیا کی رفتار

(الف) عالم اسلامی

۱. افغانستان کی رفتار ترقی۔ ہز ہائنس احمد شاہ خاں وزیر دربار افغانستان نے ایک ملاقات کے دوران میں ذیل کا بیان دیا ہے۔ ہز ہائنس اعلیٰ حضرت شہریار غازی کے چچا زاد بھائی ہیں اور جلالت الملک سلطان ابن سعود سے ایک دوستانہ معاہدہ قائم کرنے کے لئے حجاز تشریف لے جا رہے ہیں۔ آپ شاہ غازی کی طرف سے فریضہ حج بھی ادا کریں گے۔ جنہوں نے حال ہی میں نہایت ہی مستحسن فیصلہ کیا کہ حکومت افغانستان کی طرف سے مکہ معظمہ میں ایک دار الحجاج تعمیر کیا جائے تاکہ افغانستان رعایا کو سفر حج میں سہولت ہو۔

ہز ہائنس نے فرمایا کہ افغانستان نے اعلیٰ حضرت نادر شاہ غازی کے سایہ ہمایونی میں قابل رشک ترقی کی ہے۔ جس قلیل عرصہ میں اعلیٰحضرت نے ملک کو فتنہ و فساد سے پاک کر کے از سر نو شاہراہ کامرانی پر ڈال دیا ہے وہ بلاشبہ حیرت انگیز ہے گزشتہ خانہ جنگی کے زمانہ میں عمارتوں اور سڑکوں کو جو نقصان پہنچا تھا۔ اس کی تلافی کر دی گئی ہے۔ اور خیال ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں جدید ذرائع آمد و رفت ملک کے ہر حصے میں پھیلائے جائیں گے۔ ان طلبہ میں سے جو افغانستان کے نو قائم کردہ مدارس میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اکثر طلبا کو صنعت و حرفت سکھانے کے خیال سے یورپ اور امریکہ بھیجا گیا ہے تجارت کا حال نہایت اچھا ہے اور اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ محکمہ محصولات کی آمدنی گذشتہ سال سے دگنی ہو گئی ہے حکومت کے زیر غور اب یہ امر ہے کہ ملک کی عظیم الشان معدنی دولت سے کیونکر فائدہ اٹھایا جائے۔

خارجی تعلقات کے متعلق ہز ہائنس نے کہا کہ افغانستان کے تعلقات سب ممالک سے مساویانہ ہیں اور اس کے نزدیک کسی قوم کو دوسری قوم پر ترجیح حاصل نہیں نہ کسی قوم کو کوئی خاص مراعات دی گئی ہیں نہ اجارات۔

افغانستان میں پنچایتی طرز حکومت قائم ہے مجلس شورائے دو ایوانوں پر مشتمل ہے اعلیٰ حضرت ان کے فیصلوں کی تصدیق کر دیتے ہیں لیکن اگر ایوانات کے درمیان کوئی مسئلہ مختلف فیہ ہو تو آخری فیصلہ شاہ غازی کے ہاتھ میں ہوتا ہے اگرچہ اس کی اب تک نوبت نہیں آئی۔

۲۔ صدقی پاشا فلسطین میں | پچھلے مہینہ اسماعیل صدقی پاشا شام و فلسطین تشریف لے گئے اور انتدابی حکومتوں نے آپ کا پرجوش معتدم کیا اس سفر کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ حکومت مصر نے شام اور فلسطین کی مصنوعات پر محصول میں حال ہی میں بہت کافی اضافہ کر دیا تھا لھذا ان ممالک کی یہ خواہش تھی کہ حکومت مصر اپنے اس فیصلہ پر نظر ثانی کرے لیکن اسماعیل صدقی پاشا کے سفر فلسطین کے متعلق ایک دوسری رائے قائم کی گئی ہے۔ خیال یہ ہے کہ حکومت مصر نے مفتی فلسطین کی سرگرمیوں کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور موتمر انعقاد سے بھی کوئی خوشگوار نتائج مترتب نہیں ہوئے اب جو صدقی پاشا فلسطین آئے ہیں تو اس سے مقصود یہ ہی تھا کہ دونوں حکومتوں کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کو دور کر دیا جائے۔ پچھلی مرتبہ جب ہائی کمشنر فلسطین قاہرہ گئے ہیں تو وہ خود ہی صدقی پاشا اور وزیر رسل و رسائل کو قدس آنے کی دعوت دے آئے تھے یہ گویا "سرکاری تعبیر ہے مصر و فلسطین کے باہمی تعلقات کی ورنہ ظاہر ہے کہ مصر یا فلسطین کے کسی مسلمان کو مفتی فلسطین یا موتمر اسلامی کی سرگرمیوں پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

بہر حال ان سیاسی خیال آرائیوں کے علاوہ فلسطین میں اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ریلوے کی تعمیر کا ہے۔ اس وقت جو لوگ مصر سے آتے ہیں ان کو قنطرہ سے کشتی میں سفر کرنا پڑتا ہے جس سے اکثر تکالیف کا سامنا ہوتا ہے حکومت فلسطین کی یہ خواہش ہے کہ ریل کے انتظامات میں جو خرابیاں ہیں ان کو جلد سے جلد دور کر دیا جائے

ادھر قاہرہ میں عنقریب عربی انجمن موسیقی کا اجلاس ہونے والا ہے جس کا مقصد فنی اور نظری دونوں حیثیتوں سے موسیقی کی اصلاح کرنا ہے اسکے پیش نظر اس کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جن کی تفصیل آئندہ اشاعت میں عرض کی جائے گی۔

[redacted]

(۵) شئون عراق | سیاسیات عراق میں اس وقت بہت سے اہم مسائل پیش ہیں ایک مسئلہ خاتمۂ انتداب کا ہے دوسرا شامی سرحد کے تصفیہ کا ہے اس کے علاوہ حکومت نے حال ہی میں فیصلہ کیا ہے کہ پرانے سکوں کی بجائے عراقی سکے مسکوک کرائے جائیں لیکن اس وقت دو باتیں خاص طور سے توجہ کا مرکز بن رہی ہیں - اول شاہ عراق کا سفر طہران اور ثانیاً نوری پاشا کی مراجعت جنہوں نے مجلس سندوین میں عراق کے سیاسی اور اقتصادی معاملات کے متعلق نہایت اہم بیانات دیئے

نوری پاشا نے اس امر پر اظہار تیقن کیا ہے کہ عراق کو عنقریب مجلس اقوام کی رکنیت حاصل ہو جائے گی گو یا ختم انتداب کا معاملہ اب قطعی طور سے فیصل شدہ ہے۔ نوری پاشا نے کہا کہ عراق اور ترکی کے مابین دوستانہ معاہدہ قائم ہو گیا ہے جس کا اثر اضلاع موصل پر نہایت اچھا پڑے گا لیکن ان سب بیانات میں سے حیرت انگیز اطلاع یہ تھی کہ پونڈ کی قیمت گر جانے کے باوجود حکومت کا مطالبہ یہ تھا کہ عراق پٹرولیم کمپنی کو جو رقم ہر سال ادا کرنی پڑتی ہے اس کا تعین حسب سابق سونے کی قیمت کے لحاظ سے کیا جائے اس کا مطلب یہ تھا کہ کمپنی ایک لاکھ پونڈ کی زائد رقم ادا کرے یہ معاملہ مدت سے کمپنی اور حکومت کے درمیان مابہ النزاع تھا لیکن اب جو نوری پاشا لندن گئے ہیں اور کمپنی کو جو مراعات اور شرائط حکومت کی طرف سے حاصل ہیں ان کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ حکومت عراق کا مطالبہ جائز ہے۔ لہٰذا خزانہ حکومت میں عنقریب اس گراں بہا رقم کا اضافہ ہو جائیگا۔

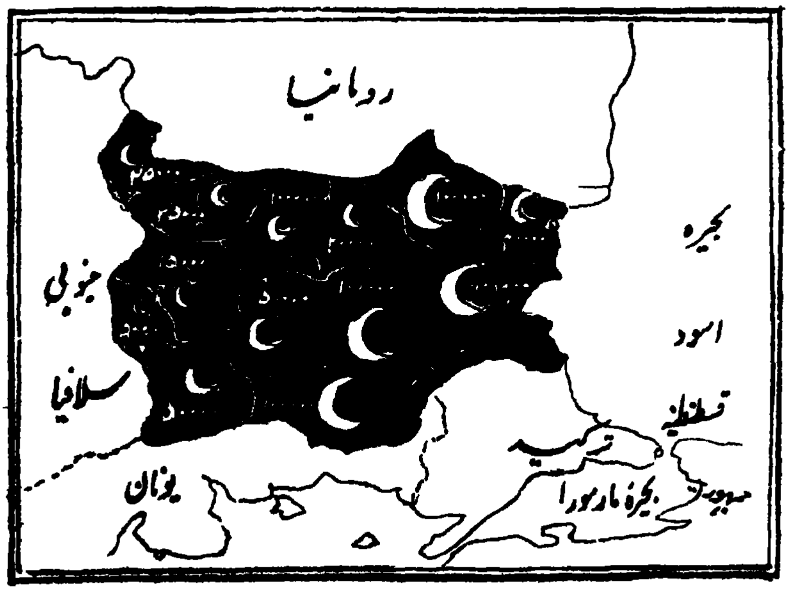
نوری پاشا نے یہ بھی کہا کہ وہ تیل کی ایک دوسری کمپنی سے بھی گفت و شنید کر آئے ہیں گو انہوں نے اس کمپنی کا نام نہیں لیا۔ ممکن خیال ہے کہ ان کا اشارہ برٹش آئل کمپنی کی طرف ہو اس لئے کہ اس کے دو ڈائرکٹر حال ہی میں سفر بغداد سے یہاں آئے تھے۔ نوری پاشا کا خیال یہ ہے کہ حکومت کو اس کمپنی سے تیل کے ہر ٹن پر چار شلنگ اور حاصل شدہ تیل کا بیسواں حصہ ملیگا۔

امیر فیصل کا سفر طہران | امیر فیصل نے ارادہ کیا ہے کہ اپریل کے مہینہ میں طہران کا سفر کریں قیاس یہ ہے کہ اس سفر کا مقصد ان غلط فہمیوں کو رفع کرنا ہے جو حکومت ایران و عراق کے درمیان پیدا ہو گئی ہیں بالخصوص اس لئے کہ حکومت عراق نے جعفر سلطان سردار باغیان کرد کے خلاف جو طرز عمل اختیار کیا ہے اس کو طہران میں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

جعفر سلطان جو کردی قبیلہ کا سردار ہے وہ سرحد عراق و ایران کے دونوں طرف آباد ہے تمام

آزاد قبائل کی طرح یہ لوگ بھی کسی حکومت کا اقتدار تسلیم نہیں کرتے اور حتی الوسع آزاد زندگی بسر کرتے ہیں سیاب کے سرما میں حکومت ایران نے ان کی سرکشی کا خاتمہ کرنے کے لئے فوج کشی کی تو شروع میں جعفر سلطان نہایت کامیابی کے ساتھ لڑتا رہا لیکن بالآخر اسے عراق میں پناہ لینا پڑی جعفر سلطان نے سلیمانیہ کے مقام پر اپنے آپ کو حکومت کے حوالہ کر دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک سردار مذکور حکومت عراق کے زیر حراست موصل میں ہی نظر بند ہے۔ باایں ہمہ ایرانی حکومت حکام عراق کے اس طرز عمل سے خوش نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ اب عراق در پردہ کرد باغیوں کے طرفدار ہیں یہی غلط فہمی ہے جس کو دور کرنے کے خیال سے شاہ عراق طہران جا رہے ہیں۔ اور امید کی جاتی ہے کہ اس کا اثر دونوں ہمسایہ حکومتوں کے باہمی تعلقات پر نہایت اچھا پڑے گا۔

مسلمانان بلغاریہ



اوپر کا نقشہ جرمن اور سینٹ مشن کے ماہوار رسالہ "مشرق تصاویر میں" شائع ہوا ہے۔ ای۔ ایم ہوپ جو صوفیا (دار السلطنت بلغاریہ) میں رہتے ہیں اور جنہوں نے یہ نقشہ مرتب کیا ہے ان کا۔

خیال ہے کہ مسلمانان بلغاریہ کی کل تعداد آٹھ لاکھ ہے قارئین جامعہ نقشہ سے اندازہ کر سکیں گے کہ مملکت بلغاریہ کے مختلف اضلاع میں مسلمانوں کی تعداد کیا ہے

(ب) ہندوستان

سرکار کی مالی حالت

مرکزی حکومت | ناظرین کو یاد ہو گا کہ حکومت ہند کا اصل میزانیہ گذشتہ ستمبر میں پیش کیا گیا تھا اور اس پر غور کرنے کے لئے ایک خاص اجلاس بماہ نومبر دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں اسمبلی نے میزانیہ کو نامنظور کر دیا تھا لیکن وائسرائے نے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر مجوزہ میزانیہ کو یکم دسمبر ۱۹۳۱ء سے نافذ کر دیا تھا۔ اب ۲۸ فروری ۱۹۳۲ء کو وزیر مال نے ضمنی میزانیہ اسمبلی کے سامنے پیش کیا ہے اور اپنے بیان میں نہایت تفصیل سے حکومت ہند کی مالی حالت کے ایک ایک پہلو پر بحث کی ہے وزیر مال کا یہ بیان خلاف معمول اس قدر سلجھا ہوا ہے کہ ہر شخص اس کو دلچسپی سے پڑھ کر سمجھ سکتا ہے

اپریل ۱۹۳۱ء میں سال رواں ۱۹۳۱-۳۲ء کیلئے حسب ذیل تخمینہ کیا گیا تھا

آمدنی	ایک ارب ۴۳ کروڑ ۸۷ لاکھ
خرچ	ایک ارب ۴۳ کروڑ ۸۶ لاکھ

لیکن دوران سال میں سیاسی اور معاشی حالات کی وجہ سے تجارت درآمد اور برآمد گھٹ کر نصف رہ گئی ہے اس لئے تخمینہ کے خلاف محصول کروڑگیری نیز دیگر مدات میں آمدنی بہت زیادہ گھٹ گئی اور تخمینہ کیا گیا کہ اختتام سال تک ۱۹ کروڑ روپے کا خسارہ ۱۹۳۱-۳۲ء کے میزانیہ میں ہو گا اور اگر مناسب تدابیر نہ اختیار کی گئیں تو ۱۹۳۲-۳۳ء میں بھی تقریباً ۱۹ کروڑ کا خسارہ ہو گا۔ چنانچہ وزیر مال نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے عام مصارف میں تخفیف اور محصولات میں اضافہ تجویز کیا ہے جس پر اب عملدرآمد

ہوگا۔ ورنہ مال کا تخمینہ گذشتہ نمبر میں یہ تھا کہ مجوزہ تخفیف مصارف اور اضافہ محصولات کے بعد سال رواں یعنی ۱۹۳۱-۳۲ء کے میزانیہ میں ۱۹ کروڑ کی بجائے صرف دس کروڑ سترہ لاکھ کا خسارہ رہے گا۔ اور ۱۹۳۲-۳۳ء کے اختتام پر بجائے کسی خسارہ کے ۵ کروڑ ۲۳ لاکھ کی بچت ہوگی۔ لیکن بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وزیر مال کا یہ تخمینہ ضرورت سے زیادہ صحیح تھا۔ اس لئے کہ بجائے دس کروڑ ۱۷ لاکھ کے ۱۹۳۱-۳۲ء کے میزانیہ کے تیرہ کروڑ ۶۶ لاکھ کا خسارہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۹۳۲-۳۳ء کے اختتام پر جو بچت ۵ کروڑ ۲۳ لاکھ کی بچنے والی تھی اس میں سے ۳½ کروڑ روپیہ چار ہی مہینہ کے اندر نکل گئے اس میں بارہ مہینہ باقی ہیں اور کل دو کروڑ پندرہ لاکھ کا فرق اب رہ گیا ہے اگر لباس اور معاشی حالات ملک کے یہی رہے جو اس وقت ہیں تو کوئی تعجب نہ ہوگا اگر ۱۹۳۳-۳۴ء کے میزانیہ میں بجائے کسی بچت کے چھ سات کروڑ کا خسارہ ہوگا۔

... ...

مرکزی حکومت ہند کے خاص خاص ذرائع آمدنی محصول کروڑگیری، انکم ٹیکس اور محصول نمک ہیں خرچ کی مدات میں فوجی مصارف۔ قرضہ جات کا سود۔ اور مختلف دفاتر کے مصارف ہیں جس کا صحیح اندازہ ذیل کے نقشہ سے کیا جاسکتا ہے۔

تخمینہ آمدنی بابتہ ۱۹۳۲-۳۳ء		تخمینہ مصارف بابتہ ۱۹۳۲-۳۳ء	
۱۔ کروڑگیری کا محصول	۵۲,۳۱,۲۷,۰۰۰	۱۔ فوجی مصارف	۴۷,۹۱,۹۶,۰۰۰
۲۔ انکم ٹیکس	۱۸,۷۳,۳۸,۰۰۰	۲۔ سود	۱۹,۹۲,۴۵,۰۰۰
۳۔ نمک محصول	۹,۴۳,۴۰,۰۰	۳۔ دیوانی	۹,۶۴,۹۳,۰۰۰
۴۔ ٹکسال	۳,۳۱,۱۷۰۰۰	۴۔ ریل و متفرق خرچ	۵۱,۳۲,۲۱,۰۰۰
۵۔ ریل و متفرق آمدنی	۴۹,۱۶,۰۳,۰۰۰	کل خرچ	۱,۲۷,۸۱,۴۵,۰۰۰
کل آمد	۱,۲۹,۹۶,۲۹,۰۰۰	بچت	۲۱۴۸۴۰۰۰
			۱,۲۹,۹۶,۲۹۰۰۰

... ...

آمدنی کی مدات میں سب سے زیادہ اہم محصول کروڑگیری ہے ۱۹۳۲-۳۳ء میں اس مد سے ۴۶ کروڑ۔

۸۱ لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی تھی۔ سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء میں ۵۶½ کروڑ کا تخمینہ تھا لیکن کل ۴۶½ کروڑ روپیہ کسٹمز سے آمدنی ہوئی حالانکہ آخری چار ماہ میں محصول کروڑگیری میں کافی اضافہ کر دیا گیا تھا سال آئندہ کے لئے ۵۰ کروڑ ۳۱ لاکھ روپے کا تخمینہ کیا گیا ہے لیکن اول تو آمینی محصول دوسرے ملک میں سودیشی تحریک کے قوی اثرات اور تیسرے قوم کی قوت خرید کم ہو جانے کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ تخمینہ صحیح ثابت نہ ہوگا۔

کروڑگیری کا دارومدار تجارت درآمد اور برآمد پر ہے درآمد میں سب سے زیادہ آمدنی۔ شکر اور سوتی کپڑے سے ہوتی ہے لیکن شکر کی درآمد نصف سے زیادہ کم ہو گئی اور تین کروڑ ۵۶ لاکھ روپے اس محصول میں نقصان ہوا ہے۔ سوتی کپڑے کی درآمد کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہو سکتا ہے۔

جنگ عظیم سے قبل اوسطاً ہر سال	۳ ارب ۲۰ کروڑ گز کپڑا آتا تھا	
جنگ عظیم کے بعد سنہ ۲۱ تک	۱ ” ۸۰ ” ”	
اب صرف	۹۰ کروڑ گز کپڑا آتا ہے	

سنہ ۲۹ تک سوتی کپڑے پر ۶½ کروڑ روپیہ محصول کروڑگیری وصول ہوتا تھا۔ لیکن اب اضافہ محصول سابقہ پونے چار کروڑ روپیہ سے زیادہ اس مد میں وصول نہیں ہوتا۔ لیکن دونوں مدوں سے جو نقصان ساری آمدنی کو ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ فائدہ دیسی مصنوعات کو پہنچ رہا ہے شکر سازی اور سوتی کپڑے کی صنعتیں بیرونی مقابلہ میں بالکل تباہ ہو گئی تھیں ان کو زندہ کرنے کے لئے آمینی محصول لگانے کی شدید ضرورت تھی اب بھی ان دونوں صنعتوں کی حالت بہت زیادہ قابل اطمینان نہیں ہے بیرونی مال کی درآمد میں آمینی محصول کی وجہ سے اتنی زیادہ کمی نہیں ہوتی ہے جتنی کہ عام کساد بازاری ملک کی سیاسی حالت اور قوم کی قوت خرید کم ہو جانے کی وجہ سے اس کی اصل حالت قائم ہو جائے گی اور مزید آمین کی ضرورت ہوگی

... ...

مٹی کے تیل پر اضافہ محصول کی وجہ سے سال رواں میں زائد آمدنی کی توقع کی جاتی ہے اور یہی حال نمک کے محصول کا بھی ہے کہ باوجود ۲۵ فی صدی اضافہ محصول کے نمک کی مانگ پر اس کا

کوئی اثر نہیں پڑا اور ایک کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کی مزید آمدنی اس مد سے حاصل ہوگی چنانچہ وزیر مال اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ آئندہ اگر آمدنی میں اضافہ کرنے کی ضرورت پڑے تو ایسی ہی چیزوں پر اضافہ کیا جائے جو عوام الناس استعمال کرتے ہیں صاحب موصوف کی اس رائے سے شاید کوئی شخص اتفاق نہ کرے۔ نمک ناگزیر ضروریات زندگی سے ہے اور اس پر محصول کا اضافہ یا تخفیف کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ اگر نمک سستا ہوجائے گا۔ تو لوگ اس کو پھانکنا نہ شروع کردیں گے اور اگر بہت زیادہ گراں ہوگا تو روکھی روٹی اور بے نمک کی دال نہ کھائیں گے۔ وزیر مال کا خیال صحیح ہے کہ تھوڑے آدمیوں پر زیادہ محصول لگانے کی اب انتہا ہوچکی ہے اور اس سے زیادہ ان سے وصول نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن عوام الناس پر جو بار ان کی آمدنی کے لحاظ سے اس وقت پڑ رہا ہے یہ بھی ناقابل برداشت ہے۔ اس پر اگر اور اضافہ کیا گیا تو ناگزیر ضروریات زندگی سے گویا کوئی چیز ان سے چھین لی جائے گی۔ وزیر مال کو ایک نہ ایک آنہ فی کس عوام الناس سے وصول کرنا زیادہ آسان نظر آتا ہے لیکن اس ایک آنہ کی قدر ان غریبوں کے دل سے کوئی پوچھے جو اس ایک آنہ سے ایک وقت اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

گذشتہ میزانیہ میں ایک بزاز کی آمدنی پر بھی انکم ٹیکس لگایا گیا تھا' لیکن وزیر مال نے اس اضافہ کے متعلق کوئی اعداد و شمار پیش نہیں کئے جس سے معلوم ہوتا کہ مجموعی آمدنی میں اس جدید محصول سے کتنا اضافہ ہوا۔

... ...

میزانیہ میں توازن پیدا کرنے کی وزیر مال نے دو صورتیں تجویز کی تھیں کہ محصولات میں اضافہ کیا جائے اور مصارف میں تخفیف کی جائے چنانچہ محصولات میں اضافہ پونے دس کروڑ کے قریب ہوگیا ہے۔ لیکن مصارف میں تخفیف توقعات سے بہت کم ہوئی۔ تخفیف مصارف کی کمیٹی کو صدر سر عبدالرحیم کا تو یہ خیال تھا کہ میزانیہ کا خسارہ صرف مصارف میں تخفیف کے ذریعہ پورا کیا جاسکتا ہے یہ ہی خیال تقریباً تمام منتخب اراکین اسمبلی کا بھی تھا' لیکن حکومت اس حد تک تخفیف مصارف کے لئے کسی طرح تیار نہ تھی پھر بھی خیال تھا کہ محصولات میں جس قدر اضافہ ہوگا کم از کم اسی قدر رقم تخفیف مصارف سے حاصل ہوگی' لیکن وزیر مال کے بیان سے معلوم

ہوتا ہے کہ کل آٹھ کروڑ روپے کی تخفیف مصارف میں کی گئی ہے جس میں سے ۵ کروڑ فوجی مصارف میں اور تین لاکھ دیوانی میں اس میں بھی بیشتر حصہ بالکل عارضی ہے اور کمانڈر انچیف صاحب نے یہ جتلا دیا ہے کہ ۴۸ کروڑ روپیہ سے کم میں فوجی مصارف قطعاً نہیں چل سکتے سال رواں کے لئے۔ کمانڈر انچیف نے ازراہ عنایت ½ ۴۶ کروڑ قبول کر لیا ہے یہ مطالبہ قومی نقطۂ نظر سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس پر کسی رائے زنی کی ضرورت نہیں ہر ملک اپنی آمدنی اور حیثیت کے مطابق اپنی حفاظت کا انتظام کرتا ہے جس ملک میں ۹۲ فی صدی آبادی پڑھنا لکھنا نہ جانتی ہو اور جہاں بلا مبالغہ لاکھوں جانیں ہیضہ طاعون چیچک اور بخار کے نظر ہو جاتی ہوں۔ محض اس لئے کہ حفظان صحت کا معقول انتظام نہیں۔ ایسا ملک اپنی آمدنی کا تقریباً نصف حصہ فوج کے سیاہ اور سفید آدمیوں کو کھلانے پلانے پر کس طرح صرف کر سکتا ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک اپنی آمدنی کا جو حصہ فوج پر صرف کرتے ہیں وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۲۶-۱۹۲۵ء اور ۲۷-۱۹۲۶ء کے اعداد و شمار پر ذیل کا نقشہ تیار کیا گیا ہے لیکن اتنے قلیل عرصہ میں بہت زائد فرق نہیں واقع ہو سکتا ہے

۱. ہندوستان	کل آمدنی کا تقریباً	۵۴	فی صدی	فوج پر صرف کرتا ہے
۲. جاپان	" "	۲۶٫۵	"	" "
۳. اٹلی	" "	۲۳٫۴۶	"	" "
۴. فرانس	" "	۱۹٫۷۵	"	" "
۵. امریکہ	" "	۱۶٫۰۹	"	" "
۶. برطانیہ	" "	۱۴٫۷۵	"	" "
۷. آئرلینڈ	" "	۷٫۶۹	"	" "
۸. جرمنی	" "	۷٫۱۶	"	" "
۹. آسٹریلیا	" "	۶٫۵۲	"	" "
۱۰. نیوزی لینڈ	" "	۳٫۵۱	"	" "
۱۱. جنوبی افریقہ	" "	۳٫۱۶	"	" "

اس طول طویل فہرست میں سب سے اول نمبر ہندوستان ہی کو حاصل ہے اور سب سے

نیچے برطانیہ عظمیٰ دام بر کا تہا کی دیگر خود مختار نو آبادیات ہندوستان اگر اپنی اس بے بسی پر شکایت کرے تو کیا عجب ہے

... ...

محکمۂ ریل کا میزانیہ محکمۂ ریل میں بمبئی حکومت کو تقریباً ۹½ کروڑ روپے کا نقصان سال رواں میں ہوا ہے ابتداءً ریلوں کا حساب کتاب مرکزی حکومت کے میزانیہ میں شامل تھا لیکن ۲۱-۱۹۲۰ء میں ریلوے کے انتظام کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے اکیورتھ کمیٹی مقرر ہوئی تھی ۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ مختلف کمپنیوں کا معاہدہ ختم ہو جانے کے بعد ریلوں کا انتظام براہ راست حکومت کے ماتحت کر دیا جائے اور ریلوں کا حساب کتاب مرکزی حکومت کے میزانیہ سے علیحدہ کر دیا جائے نیز چونکہ حکومت نے تقریباً سات ارب ۶۵ کروڑ روپیہ کا سرمایہ اب تک ریلوں پر لگایا ہے اس لئے اس سرمایہ پر کچھ منافع بھی حکومت کو ملنا چاہیئے سنہ تک ریلوں سے کوئی منافع نہیں ہوا تھا لیکن اس کے بعد سال بہ سال معقول آمدنی ہو رہی ہے جن کا کچھ اندازہ گذشتہ چند سال کے اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے ۔

سنہ ۲۳-۲۴ء	۶½ کروڑ	سنہ ۲۶-۲۷ء	۸¼ کروڑ
سنہ ۲۴-۲۵ء	۱۴ کروڑ	سنہ ۲۷-۲۸ء	۱۱ کروڑ
سنہ ۲۵-۲۶ء	۱۸½ "	سنہ ۲۸-۲۹ء	۸ "

مارچ سنہ ۲۴ میں حکومت ہند نے اکیورتھ کمیٹی کی سفارشات کو منظور کیا اور ایک قرار داد کے ذریعہ یہ طے پایا کہ ۱۔ ریلوں کا حساب کتاب علیحدہ کر دیا جائے ۔ ۲۔ حکومت کے کل سرمایہ پر ایک فی صدی کا ⅘ حصہ سالانہ محکمۂ ریل سے حکومت ہند کو ادا کیا کرے ۔ ۳۔ اس کے بعد اگر کچھ فاضل رقم بچے تو اس کا بھی ⅓ حصہ مرکزی حکومت کو دیا جائے اور باقی رقم سرمایہ محفوظ اور سرمایہ فرسودگی میں جمع کر دی جائے تاکہ اگر کبھی خسارہ ہو تو سرمایہ محفوظ میں سے قرض لے کر حکومت ہند کا مطالبہ ادا کر دیا جائے اس فیصلہ کے مطابق پانچ اور چھ کروڑ کے درمیان رقم حکومت ہند کو سال بہ سال محکمۂ ریل سے ملنا چاہیئے ۔

... ...

سنہ ۱۹۳۰ء تک ریلوں سے اتنا فائدہ ہوتا تھا کہ حکومت ہند کا مستقل مطالبہ ادا کرنے کے بعد ایک کافی رقم سرمایہ محفوظ میں جمع کر دی جاتی تھی لیکن سنہ ۱۹۳۰ء سے ریلوں کی آمدنی میں خسارہ شروع ہوا ہے۔ پہلے سال ہی سنہ ۱۹۳۰ء میں دو کروڑ روپیہ سرمایہ محفوظ سے قرض لے کر حکومت ہند کا مطالبہ ادا کیا گیا۔ دوسرے سال ۵ کروڑ ۱۲ لاکھ خسارہ ہوا۔ چنانچہ یہ رقم اور حکومت ہند کا مطالبہ ادا کرنے کیلئے کل گیارہ کروڑ روپیہ سرمایہ محفوظ سے قرض لیا گیا۔ اب اس سال ۹½ کروڑ روپیہ کا نقصان ریلوں میں ہوا ہے۔ سرمایہ محفوظ میں کل ۵ کروڑ روپیہ رہ گیا تھا۔ اس لئے ۴½ کروڑ کی رقم سرمایہ فرسودگی سے قرض لے کر یہ خسارہ پورا کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں حکومت ہند کا مستقل مطالبہ کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے سر جارج رینی (جو اس محکمہ کے ذمہ دار ہیں) تخمینہ کیا ہے کہ آئندہ سال بھی ۷½ کروڑ روپیہ کا خسارہ ہوگا۔

... ...

عالمگیر کساد بازاری کا زمانہ ہے ریلوں کے محکمہ میں یہ نقصان بہت زیادہ خلاف توقع نہیں ہے لیکن ریلوں کا کاروبار چونکہ تجارتی اصول پر ہے۔ اور کوئی کاروبار ایک عرصہ تک مسلسل نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسی صورتیں نکالی جائیں۔ کہ اگر فائدہ نہ ہو تو نقصان بھی نہ ہو۔ یہ اس طرح ممکن ہے کہ کرایہ اور محصول میں اضافہ کیا جائے۔ اور انتظامی مصارف میں زیادہ سے زیادہ تخفیف کی جائے۔ چونکہ ریلوں کے کاروبار میں اجارہ داری ہے اور اس کا انتظام بھی حکومت کے ہاتھوں میں ہے اس لئے اندیشہ تھا کہ یہ نقصان صرف کرایہ ریل اور محصولات میں اضافہ سے پورا کیا جائے گا۔ اور مصارف میں صرف برائے نام تخفیف ہوگی۔ لیکن سر جارج رینی (ریلوے ممبر) نے تسلیم کیا ہے کہ کرایہ ریل اور محصول کے اضافہ سے ریلوں کی آمدنی بجائے بڑھنے کے گھٹ جائیگی۔ اس لئے اب یہ خسارہ صرف تخفیف مصارف سے پورا ہو سکتا ہے اس وقت تک ریلوے بورڈ نے جو کوششیں تخفیف مصارف کیلئے کی ہیں۔ وہ ہر طرح قابل اطمینان ہیں۔ بشرطیکہ یہ کوششیں آئندہ بھی جاری رہیں۔ یہ بھی تجویز ہے کہ ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو ریلوں کے انتظام کے متعلق از سر نو تحقیقات کرے۔ اس کمیٹی میں جرمنی اور فرانس کے واقف کار ماہرین کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش ہے تاکہ وہ اپنے ملک کے سالہا سال کے تجربات کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے متعلق مفید مشورہ دیں۔

ریلوں کی توسیع کا کام بھی مالی مشکلات کی وجہ سے بہت رو کا جا رہا ہے لیکن اس میں حتی الوسع کوتاہی نہ ہونا چاہیئے۔ ملک کی تجارت اور صنعت وحرفت کی ترقی کا دارومدار ذرائع نقل و حمل خصوصاً ریلوں کی ترقی پر ہے۔ ہندوستان کے اٹھارہ لاکھ مربع میل رقبہ میں کل ام ہزار میل ریل اب تک تیار ہوئی ہے۔ اس کے بالمقابل یورپ کے ۱/۲ ۷ لاکھ مربع میل (روس کو نکال کر کے) رقبہ میں دو لاکھ میل ریل موجود ہے۔ ذیل کے نقشہ سے مختلف ممالک میں ریلوں کی ترقی کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

بلجیم	فی ہزار مربع میل	۳۹۶ میل ریل
انگلستان	" "	۱۹۵ "
امریکہ	" "	۷۰ "
جاپان	" "	۳۲ "
ہندوستان	" "	۲۰ "

موجودہ کساد بازاری بظاہر کوئی مستقل صورت نہیں اختیار کر سکتی اس لئے ریلوں کی توسیع کے پروگرام میں جہاں تک ممکن ہو کوئی کمی نہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ بالآخر اس سے ملک کی ترقی کی راہ میں اس سے زیادہ رکاوٹیں پیدا ہوں گی جتنی کہ اس وقت موجود ہیں۔

ممالک غیر

چین و جاپان | آخری خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جاپان نے شنگھائی کے علاقہ میں فوجی کارروائیاں بند کر دی ہیں اور انجمن اقوام کی مداخلت اور تحقیقات ہی کو منظور کر لیا ہے۔ ایک گذشتہ اشاعت میں یہ بتلایا گیا تھا کہ جاپان کو مختلف عہدناموں کی وجہ سے جو اس نے براہ راست چین سے کئے یا جو اسے روس سے اپنی عہد آفریں فتح کے بعد ورثتاً ملے۔ منچوریا میں عرصہ تک کے لئے بہت اہم حقوق حاصل ہیں۔ ان حقوق کی بنا پر منچوریا میں فوجی کارروائی کرتے وقت جاپان کو بین الاقوامی مداخلت کا زیادہ اندیشہ نہ تھا۔ لیکن جس حد تک منچوریا میں پیش قدمی کرنے کا قصد جاپانی وزارت نے کیا تھا وہاں اس سے زیادہ پیش قدمی ہو گئی اس لئے

کہ جاپانی فوج کا اقتدار سیاست پر غالب تھا اور منچوریا جاپانی فوج کے لئے ارض مقدس ہے۔ اس زیادتی نے دول یورپ کے کان کھڑے کئے، اُدھر امریکہ (جو جاپان کے مقابلہ میں ہمیشہ چین کی منڈی کو اپنے لئے محفوظ کرنے کی غرض سے اس کی حفاظت کرتا ہے) نے سخت احتجاج کیا۔ لیکن جاپان نے ایک کی نہ سنی اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول کی وہ تفسیر اپنے عمل سے پیش کی جس کے سامنے تمام احتجاجات اور انجمن اقوام کی تمام قرار دادیں بے اثر ثابت ہوئیں۔

منچوریا کے بعد فوجی کارروائیاں شنگھائی کے علاقہ میں نہایت شد و مد کے ساتھ شروع ہوئیں اور بلا اعلان جنگ کے گذشتہ جنگ عظیم کے ہیبت ناک مناظر دنیا نے پھر دیکھے۔ سمندر سے گولہ باری ہوئی، ہوا سے ہوئی، شہر جلے، پرامن شہری قتل ہوئے، لاکھوں آدمی بے گھر بے در ہو گئے اور ابھی جنگ کا باضابطہ اعلان بھی نہیں ہوا! اب خدا خدا کر کے یہ بے ضابطہ جنگ بند ہوئی ہے شنگھائی میں فوجی کارروائیوں کے آغاز اور اس وقت ان کے بند ہونے کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہئے۔ شنگھائی میں فوجی کارروائی کا ہونا جاپان کے لئے اس واسطے ضروری تھا کہ منچوریا کی فوجی کامیابیاں شنگھائی کے تجارتی میدان میں شکست سے مبدل ہو رہی تھیں۔ جب چین منچوریا کو نہ بچا سکا تو اس نے جاپانی مال کا بائیکاٹ کیا اور اس بائیکاٹ کا مرکز شنگھائی تھا۔ چین کی تجارت، ساہوکارہ، جہازرانی اور ہر قسم کا کاروبار آکر شنگھائی میں جمع ہو گیا ہے۔ کچھ عرصہ سے سیاست کے اعتبار سے اسے کینٹن پر فضیلت حاصل ہو گئی ہے چنانچہ یہیں جاپانی مال اور جاپانیوں کے بائیکاٹ کی تحریک نے زور پکڑا۔ جاپان جو منچوریا کو اس لئے اپنے تسلط میں لانا چاہتا تھا کہ اس کی تجارت کے لئے اجناس خام وہاں سے بآسانی حاصل ہو سکیں گی اسے کیسے گوارا کرتا کہ اس خام مال کو مصنوعات میں تبدیل کرنے کے بعد کوئی انھیں ہاتھ بھی نہ لگائے؛ چنانچہ شنگھائی میں فوجیں اتار دی گئیں اور تجارتی مال کو بیچنے کے لئے خریدنے والوں کے جان و مال کو برباد کر دیا گیا!

یہ کارروائی بلا نظیر نہ تھی۔ اس لئے کہ ۱۹۲۷ء میں چینی انقلاب کے موقع پر اپنے اغراض کی حفاظت کے لئے برطانیہ نے بھی شنگھائی میں فوج بھیجی تھی۔ لیکن انگریزی فوج اپنی وزارت کے قبضہ میں تھی، اس لئے سیاسئین کی مصلحت آمیزیوں پر کسی نے کان نہ دھرا اور منچوریا کی طرح شنگھائی میں بھی سپہ سالاران جاپانی نے اپنے دل کا حوصلہ نکالا۔

غریب انجمن اقوام جس کے تمام بااثر رکن خود دل میں معاملات کو طے کرنے کے اسی جاپانی مسلک کے قائل ہیں وقتاً فوقتاً قراردادیں منظور کرتی رہی اور جاپان ان کی طرف سے بے اعتنائی برتتا رہا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ ان احتجاج کرنے والوں میں سے ہر ایک اپنے مال کو بکوانے کے لئے وہی سب کرسکتا ہے جو وہ خود کررہا ہے۔ انجمن اقوام کی حقیقت سے اس کے عشر کار سے زیادہ کون واقف ہوسکتا ہے کہ ہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند لیکن پھر بھی ضمیر انسانیت ان ظالمانہ حرکتوں پر مشتعل ہوتا ہے اور کوئی ظالم اس کی طرف سے کامل بے اعتنائی نہیں برت سکتا' ہمیشہ ظالموں کی خواہش ہوتی ہے کہ اس ضمیر کو اپنے کسی خواب آور عمل سے سلادیں چنانچہ یہی اب جاپان کرنا چاہتا ہے۔ اس نے انجمن اقوام کی تمام تجاویز کو اچھی طرح ٹھکرایا اور اب منچوریا پر اچھی طرح تسلط قائم کرکے' وہاں ایک نام نہاد جمہوریت قائم کرکے اور شنگھائی میں جان ومال کی تباہی کے علاوہ چینی دلوں میں ہیبت پیدا کرکے وہ ضمیرِ انسانیت کا خیال بھی کرسکتا ہے اور "بگلہ بھگت" بن سکتا ہے!

چنانچہ انجمن اقوام کا وفد تحقیقاتی جائے گا۔ شنگھائی سے تو جاپانی فوجیں ہٹ جائیں گی مگر منچوریا پر تسلط قائم رہے گا۔ زیادہ سے زیادہ امریکہ اور ایک دو مغربی دول کو بھی کچھ حقوق مل جائیں گے!

برطانیہ درآمد اشیاء پر ایک عام محصول لگاکر برطانیہ بھی اصولاً تامینی تجارت کے حامیوں کی صف میں آملا ہے۔ جو لوگ آزاد اور مامون تجارت پر انگریزی ادب سیاسی ومعاشی میں مفصل بحثیں پڑھنے کے عادی ہیں اور انگلستان کو آزاد تجارت کا سب سے بڑا حامی جانتے ہیں انھیں شاید یہ تبدیلی عجیب معلوم ہو۔ لیکن عرصہ سے اس کے لئے میدان تیار ہورہا تھا۔ اصول اگرچہ آزاد تجارت ہی کا مقبول عام تھا لیکن مخصوص صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے تامینی محاصل کی تدبیر نے جو بسا اوقات اختیار کی جاچکی تھی تامین کو بالکل نامانوس چیز نہ رکھا تھا۔ اُدھر جنگ عظیم کے بعد سے دوسری قوموں کی شدید تامینی تدابیر نے انگلستان میں بھی اس کے لئے خاصی آمادگی پیدا کردی تھی۔ پھر خود اپنی نوآبادیوں سے تجارت کو ترجیح دینے کا خیال بہت ہر دلعزیز تھا؛ حال میں مزدوروں کے سیاسی اثر کی ترقی نے اجرتوں کو گھٹنے سے روکا' کام کا وقت کم کیا' اور یوں مصارف پیدائش میں اضافہ ہوا۔ دوسرے ملک جنھوں نے اپنے کو تامینی دیواروں میں محصور کرلیا تھا اپنی سستی اجرت اور طویل اوقات کار کے سبب ارزاں

چیزیں بنا بنا کر برطانیہ کے مقابلہ کا حوصلہ کیا اور انگریزی صنعت سچ یہ ہے کہ بڑے خطرہ میں پڑ گئی۔ اس خطرہ سے بچنے کے لئے پہلے تو انگلستان نے اپنے سکہ کا تعلق سونے سے منقطع کیا اور اس طرح ملک کے اندر اپنے مال کی قیمت بڑھائی اور پردیسیوں کے لئے اسے ارزاں کیا۔ لیکن یہ تدبیر کافی نہ تھی۔ اس لئے تامین کی تدبیر اختیار کی گئی اور اب چند چیزوں کو مستثنیٰ کر کے سب درآمد پر قیمت کا ۱۰ فی صدی محصول عائد کر دیا گیا۔ مستثنیٰ چیزوں میں سے خاص خاص یہ ہیں: گیہوں، گوشت، چاء، ربر، چمڑے اور کپڑے کی صنعت کے لئے اجناس خام۔ چھ مہینے کے بعد اس فہرست پر نظر ثانی کی جائے گی اور اس میں ترمیم یا توسیع حکومت وقت کے اختیار میں ہوگی۔ اس باب میں حکومت کو مشورہ دینے کے لئے ایک مشاورتی کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے جو تامینی محاصل کے اثرات کا بغور مطالعہ کرتی رہے گی۔

خود برطانوی سلطنت کے مختلف اراکین کے باہمی معاشی تعلقات کا مسئلہ اوٹاوا کانفرنس کے لئے اُٹھا رکھا گیا ہے جو عنقریب منعقد ہونے والی ہے۔

آئرستان آئرستان کے انتخابات میں پچھلی حکومت کو شکست ہوگئی اور ڈی ولیرا کی جمہوری جماعت برسر اقتدار آگئی۔ گذشتہ سال ہی یہ بات بہت واضح ہوگئی تھی کہ آئرستان کے شہریوں میں سیاسی اختلافات نہایت گہرے ہوگئے ہیں اور اس حد سے کہیں آگے بڑھ چکے ہیں جہاں تک جمے ہوئے پارلمنٹی نظام کی صورت میں اکثر ہوتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جمہوری جماعت کی طرف سے ملک میں ایک قوی انقلابی تحریک شروع ہونے والی ہے۔ چنانچہ گذشتہ حکومت نے دستور اساسی میں ترمیم کی نہایت غیر معمولی کارروائی تک سے احتراز نہ کیا اور گذشتہ اکتوبر میں دستور کے ان دفعات میں، جن سے شخصی آزادی، اظہار خیال کی آزادی، اور باضابطہ عدالتی تحقیقات کا حق ہر شہری کو ملا تھا، ترمیم کر دی گئی۔ اور سیاسی جرموں کی تحقیقات کے لئے ایک فوجی عدالت قائم کی گئی جسے سزائے موت تک کا اختیار تھا۔ لیکن بظاہر یہ فوجی عدالت اور جمہوری جماعت کو دبانے کی کوشش ناکام رہی اور بلا خون کا ایک قطرہ بہائے یہ جماعت انتخابات میں برسر اقتدار آگئی۔ ڈی ولیرا جو جنگ آزادی کے زمانے میں بھی وطن خواہ جماعت کا سردار تھا آج پھر حکومت آئرستان کا صدر ہے۔ عہدۂ صدارت پر متمکن ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلے تو ان سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جو مذکورہ بالا قانون کے ماتحت پابجولاں تھے۔ پھر یہ اعلان کیا

کہ شہنشاہ انگلستان کی وفاداری کی قسم لینے کا فرض آئرستان کی پارلیمنٹ کے اراکین پر عاید نہ کیا جائیگا۔ ان مسائل پر یقیناً بہت جلد انگلستان اور آئرستان میں اختلافات رونما ہوں گے اگرچہ رفتار سیاست کا خیال کرکے یہ کہنا دشوار نہیں ہے کہ انگلستان اس سلسلہ میں بہت سے تلخ گھونٹ پینا گوارا کرے گا!

جرمنی

صدر جمہوریہ کا انتخاب فیصلہ کن ثابت نہ ہوا۔ جرمن دستور کے مطابق پہلے انتخاب میں وہ شخص صدر منتخب ہو سکتا ہے جو امیدواروں سے بہیئت مجموعی زیادہ رائیں حاصل کرے۔ اگر کوئی امیدوار بھی ایسا نہ کر سکے تو پھر دوبارہ انتخاب ہوتا ہے جس میں محض اکثریت آرا انتخاب کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے۔ اس انتخاب نے جرمنی کے موجودہ صدر اور قیصری زمانہ کے مشہور عالم سپہ سالار فان ہنڈنبرگ کو سب سے زیادہ رائیں ملیں لیکن دوسرے امیدواروں کی مجموعی رایوں سے کم۔ اس لئے اب انتخاب دوبارہ ۱۰ اپریل کو ہوگا جس میں فان ہنڈنبرگ کا منتخب ہو جانا تقریباً یقینی ہے۔

جرمنی کی موجودہ سیاسی اور معاشی حالت کا خیال کرکے وزیراعظم نے پہلے تو یہ کوشش کی تھی کہ سب سیاسی جماعتیں مل کر دستور اساسی میں ترمیم کر دیں اور ہنڈنبرگ کا زمانہ صدارت اور بڑھا دیا جائے۔ لیکن قدامت پسند اور "قومی اشتراکی" جماعتوں کے قائد ہوگن برگ اور ہٹلر اس پر راضی نہ ہوئے۔ سیاست بھی عجیب دھوپ چھاؤں ہے، جن لوگوں نے گذشتہ انتخاب میں ہنڈنبرگ کو صدر بنوایا وہ آج اس کے مخالف ہیں اور ہنڈنبرگ کو جتنی رائیں ملیں اکثر ان جماعتوں سے جو پچھلی بار اس کے خلاف تھیں۔ آج یہ مخالف دیکھتے ہیں کہ ملک کو شاہ پسندی اور اشتراک کے خطرناک تجربوں سے اگر کوئی شخص بچا سکتا ہے تو ہنڈنبرگ۔ خانہ جنگی کو ٹال سکتا ہے تو یہ بوڑھا سپہ سالار، جمہوریت اور دستور کو قائم رکھ سکتا ہے تو قیصر کا یہ آزمودہ کار جنرل!

لیکن ہرچند ہنڈنبرگ کا انتخاب اس مرتبہ یقینی سا ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس سے جرمنی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس سے صرف تغیر سیاسی و معاشی کی رفتار ذرا ہموار ہو جائے گی اور بس۔ زندگی کے شعبہ میں نہایت تیزی سے تغیر ہو رہا ہے۔ سیاسی اور معاشی انتشار ناقابل برداشت ہوتا جاتا ہے۔ ہٹلر کی جماعت بس یہی کہتی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ناقابل برداشت ہے۔ ہمیں برسر اقتدار کر دو تو سب ٹھیک ہو جائے۔ وہ یہ نہیں بتلاتا کہ کیسے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، لیکہ

انتشار میں لوگوں کو یہ سوال کرنے کی فرصت بھی نہیں ہے۔ اُدھر انتہا پسند اشتراکی کہتے ہیں کہ یہ پریشان حالی کسی شخص کا قصور نہیں، یہ نظام سرمایہ داری کا لازمہ ہے اور اس کی ماہیت کا تقاضا ہے۔ اس نظام کو انقلاب اشتراکی سے ختم کرو، سب کچھ درست ہو جائے گا۔ اور جرمنی کے نوجوان، دیوالیے، دلوں میں تلخی رکھنے والے، طبقہ وسطیٰ کے سب وہ لوگ جن کی ساری دولت جنگ کے بعد جرمن سکہ کی خرابی کی وجہ سے دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے نکل گئی، یہ سب یا تو ہٹلر کی طرف جاتے ہیں یا اشتراکیوں کی طرف۔ اور ان سب کے معنی ہیں جرمن قوم کا بہت بڑا حصہ۔ اگر رفتار یہی رہی تو قیاس ہے کہ پہلے ہٹلر کو کامیابی ہوگی۔ جب وہ اپنے وعدے وفا نہ کر سکے گا اور ظاہر ہے کہ نہ کر سکے گا، تو اشتراکیوں کا موقع آئے گا اور انقلابی تحریک بہت قوی ہو جائے گی۔

اشتراکی روس کا مشہور سپہ سالار تراتسکی جو اس وقت جلا وطنی میں اپنے دن کاٹ رہا ہے ایک جگہ جرمنی کے متعلق لکھتا ہے :-

> "جرمن معاملات کی رفتار پر صرف جرمنی کی قسمت کا انحصار نہیں ہے بلکہ عرصہ تک کے لئے دنیا کی قسمت کا دار و مدار ہے۔ روس کی اشتراکی تعمیر، ہسپانی انقلاب کی رفتار، انگلستان میں انقلاب سے پہلے کی سی حالت کا پیدا ہونا، اور فرانسیسی سامراجیت کا آنے والا حشر، یہ سب کچھ آکر ایک نقطہ پر جمع ہو گیا ہے۔ یعنی اس سوال کے جواب پر کہ اگلے چند مہینوں میں جرمنی میں کون جیتتا ہے اشتراکی یا ناشستی (ہٹلر)؟ کسی مخروطہ کے سرے پر ایک گیند رکھ دو تو ذرا سے دھکے سے وہ سیدھی طرف لڑک سکتی ہے یا الٹی طرف۔ یہی حال اس وقت جرمنی کا ہے، اور لڑکنے کا وقت ساعت بہ ساعت قریب آتا جاتا ہے۔ بعض قوتیں چاہتی ہیں کہ گیند سیدھی طرف لڑکے (قدامت پسندی کی طرف) اور مزدور جماعت کی کمر اس سے ٹوٹ جائے۔ بعض چاہتے ہیں کہ گیند وہیں سرے پر رکھی رہے۔ یہ لوگ ناممکن بات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ گیند وہاں نہیں رہ سکتی۔ اشتراکی چاہتے ہیں کہ گیند الٹی جانب (انقلاب کی طرف) لڑکے اور

سرمایہ داری کی کمر توڑ دے۔ لیکن آرزوئیں کافی نہیں ہوتیں۔ عمل کی قوت درکار ہے۔"

لیکن عجب بات ہے کہ باقی دنیا کا بڑا حصہ یہی چاہتا ہے کہ گیند اوپر سرے ہی پہ رکھی رہے!

شذرات

اردو اکادمی کا جلسہ جو ۱۹ مارچ کو ہونے والا تھا ملتوی کرنا پڑا شہر میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ ہوگیا جس کی رو سے ہر عام جلسہ کرنے کے لئے خاص طور پر اجازت لینے کی ضرورت تھی۔ یہ اطلاع اتنی دیر میں ملی کہ اگر اجازت کا انتظار کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ جلسہ کا وقت آپہنچے اور اس وقت تک اجازت کی اطلاع نہ آئی ہو۔ اس لئے مناسب یہی معلوم ہوا کہ جلسہ ملتوی کر دیا جائے۔ اس تھوڑے وقت میں لوگوں کو بہ عجلت التوا کی اطلاع دیدی گئی۔ اب انشاء اللہ جلسہ ۹ اپریل کو ہوگا۔ اخباروں کے اور دعوت ناموں کے ذریعہ سے دو تین دن پہلے سب حضرات کو صحیح وقت کی اطلاع ہو جائے گی

فروری کے جامعہ میں جو افسانہ شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ عربی سے مولوی رئیس احمد ندوی صاحب نے کیا ہے۔ غلطی سے ان کا نام شائع نہ ہو سکا۔ ہم ان سے معافی کے خواستگار ہیں اس مہینہ جو افسانہ شائع ہو رہا ہے اس میں کسی کا نام نہیں اور اس کے ساتھ کوئی خط بھی نہیں آیا یا آیا ہو تو ہمارے پاس نہیں پہنچا۔ ہمیں امید ہے کہ جن صاحب نے یہ افسانہ بھیجا ہے وہ اپنے نام نامی سے مطلع فرمائیں گے۔ انعامی مقابلہ کی جو تاریخ مقرر تھی اس کے گذر جانے کے بعد یہ افسانہ موصول ہوا ورنہ یقیناً یہ انعام کا مستحق قرار پاتا۔

دہلی یونیورسٹی کا جلسۂ تقسیم اسناد ۱۹ مارچ کو منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ایک کے بجائے تین خطبے دئے جاتے ہیں۔ ایک صدر کا جو اس سال مقرر ہوا ہو۔ دوسرا وائس چانسلر کا اور تیسرا پرو چانسلر یعنی وائسرے کی کونسل کے ممبر تعلیمات کا۔ اس تثلیث کی مصلحت سمجھ میں نہیں آتی مگر کچھ ہوگی ضرور۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جلسہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ وائس چانسلر صاحب یونیورسٹی کی مختصر رپورٹ سنائیں اور پرو چانسلر صاحب اس کا جواب دیں مگر چونکہ اس قسم کے جلسوں میں باہر کے کسی شخص سے خطبۂ صدارت پڑھوانے کی رسم ہے اس لئے یہ بھی

ہو جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ سرسی پی راما سوامی آئر کا خطبۂ صدارت اس توقع کو پورا نہیں کرتا جو اُن کے علم و فضل اور عملی کارناموں کی بنا پر تھی کہ وہ علم و تعلیم پر وسیع مدبرانہ نظر ڈالیں گے۔ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں جو خطبہ پڑھا جائے اس میں یہ تین باتیں ہوں یا کم سے کم ان میں سے ایک بات ہونی چاہیئے۔ ۱۔ اعلیٰ تعلیم کے نصب العین کے متعلق کوئی نظریہ جو خطبہ پڑھنے والے نے ذاتی غور اور مشاہدے سے قائم کیا ہو یا کم سے کم گہری تنقید کے بعد تسلیم کیا ہو۔ اور اس کے ماتحت موجودہ یونیورسٹیوں کی حالت پر تبصرہ۔ ۲۔ اس خاص یونیورسٹی کے عملی مسائل کی بحث اور ان کے حل کرنے کے لئے مفید مشورہ ۔ ۳۔ فارغ التحصیل طلبا کو عملی زندگی کے متعلق جس سے انھیں سابقہ پڑنے والا ہے ایسی ہدایتیں جس سے انھیں بصیرت اور فیضان حاصل ہو۔ یوں تو فاضل مقرر کے خطبہ میں یہ تینوں چیزیں موجود ہیں مگر کوئی اس معیار پر پوری نہیں اترتی جو ایسی دقیع علمی صحبت کی تقریروں کا ہے یا ہونا چاہئے۔

تعلیم کے نصب العین کی بحث میں موصوف نے کئی اہم مسئلے چھیڑے ہیں۔ لیکن اتنے اختصار سے کام لیا کہ نہ اپنا مطلب اچھی طرح واضح کر پائے اور نہ خیالات میں منطقی تسلسل اور ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ چند متفرق نکتے بیان کر دینے سے علمی تحقیق یا عملی رہنمائی کا فرض پورا نہیں ہوتا۔ پہلے فاضل مقرر نے یہ بحث اٹھائی کہ یونیورسٹی کی تعلیم میں عام متمدن تربیت اور کسی خاص فن کا مطالعہ یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پر اتنا زور نہیں دینا چاہیئے کہ دوسرے کو نقصان پہونچے۔ ظاہر ہے کہ اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ موصوف کے اندازِ بیان سے مترشح ہوتا ہے۔ کہ ان کے نزدیک تعلیم کے ان دونوں طریقوں میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ طبیعتوں کے لئے مناسب ہے۔ بعض کو ایک طرح کی تعلیم ملنی چاہیئے بعض کو دوسری طرح کی۔ حالانکہ یونیورسٹی کی تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ علم کو مرکز بنا کر ہر نوجوان تمدنی زندگی کے ہر شعبے سے تھوڑی بہت واقفیت پیدا کرے تاکہ تمدن کا ایک مجموعی تصور اس کے ذہن میں قائم ہو سکے مگر اس کے ساتھ کسی ایک چیز کا گہرا مطالعہ کرے تاکہ اس کے ذریعے سے وہ کسی

حیثیت سے معاشرت کی عملی خدمت کر سکے اور اس کی بقا اور ترقی میں معاون ہو سکے۔

اس کے بعد موصوف نے اور اہم مقاصد کی طرف اشارہ کیا مگر صرف اشارہ ہی کرکے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اعلیٰ تعلیم میں اصل چیز یہ نہیں کہ بعض معلومات اور مشاہدات حاصل کر لئے جائیں بلکہ یہ ہے کہ نظر بنیا پیدا کی جائے کہ انسان اپنے طبعی اور ذہنی ماحول کے تغیرات کو سمجھتا رہے اور ان سے مطابقت پیدا کرکے ہم آہنگ زندگی بسر کرے اس کے علاوہ یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کی عملی خصوصیات اور معاشی ضروریات کو پیش نظر رکھے اور نوجوانوں کو ہر قسم کے مفید پیشے اختیار کرنے کا شائق اور اس کے لائق بنادے۔ مگر سب سے بڑا کام یونیورسٹی کا طالب علموں کے دلوں میں حق کی محبت، خدمت کا ذوق، وسعت نظر اور قوت ارادی پیدا کرنا ہے۔

دہلی یونیورسٹی کی عملی ضروریات کے سلسلے میں موصوف کے نزدیک سب سے اہم سوال جو یونیورسٹی اور کالجوں کی تعلیم اور ان کے فرائض کی تقسیم کے متعلق ہے اس کا حل آپ نے یہ بتایا کہ تعلیم کالجوں میں ہو۔ یونیورسٹی صرف اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ اور معمل فراہم کرے مگر یہ بھی مالی دقتوں کے سبب سے فی الحال ناممکن ہے۔

مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ دہلی یونیورسٹی اس وقت تک مختلف کالجوں کا نام ہے جو ایک انتظامی سلسلہ میں مربوط کر دئے گئے ہیں۔ اب ان کو ملاکر وہ اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنا جو یونیورسٹی میں ہونا چاہئیے کیونکر ممکن ہے جو حل فاضل مقرر نے بتایا ہے اس سے نہ تو پوری نظری تشفی ہوتی ہے اور نہ زیادہ عملی مدد ملتی ہے۔

آخر میں فاضل مقرر نے طلبا کو نصیحت بھی کی مگر یہ نصیحت رواج کے مطابق بس یہیں تک محدود ہے کہ انھیں سیاست میں شرکت نہیں کرنا چاہئیے۔ اس نصیحت کی جو دلیلیں ممدوح نے پیش کی ہیں۔ وہ ان دلائل سے کہیں زیادہ معقول ہیں جو عموماً ایسے موقعوں پر پیش کی جاتی ہیں۔ موصوف نے فرمایا کہ سیاست ہمیشہ فرقہ بندی اور نفاق پیدا کرتی ہے

یونیورسٹی کے طالب علموں کی جماعت کو ایک متفقہ برادری بن کر رہنا چاہیئے جس کا مشترکہ مقصد وہ ذہنی اور اخلاقی قوت پیدا کرنا ہو جو کشمکش حیات میں عملی حصہ لینے کے لئے ضروری ہے مگر فاضل مقرر نے ان نوجوانوں کی مشکلات پر غور نہیں فرمایا۔ ذہنی اور اخلاقی قوت پیدا کرنے کے لئے جن مؤثرات کی ضرورت ہے ان میں حب وطن۔ درد ملت۔ قوم کے سیاسی رہنماؤں کا احترام بھی شامل ہے۔ مگر یونیورسٹیاں حکومت کے دباؤ سے طلبہ پر ایسے قیود عاید کرتی ہیں کہ یہ جذبات بے تکلفی سے ظاہر نہیں ہونے پاتے بلکہ اپنے اظہار کی غیر معمولی راہیں ڈھونڈتے ہیں جن سے نقصان بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ پیش پا افتادہ بات ہے جسے نوجوانوں کا ہر معلم جانتا ہے بلکہ غالباً یونیورسٹیوں کے ارباب حل و عقد اور حامی حکومت سیاست داں بھی سمجھتے ہیں مگر حکومت کی مروت انہیں مجبور کرتی ہے کہ جب موقعہ ملے طالب علموں پر شورش پسندی کا الزام لگا دیں۔

چندہ سالانہ پانچ روپیہ

قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ

پرنٹر و پبلشر: محمد مجیب بی اے (آکسن)

رجسٹرڈ

نمبر ۱۸۵۲

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۱۸

بابت ماہ اپریل ۱۹۳۲ء

نمبر ٤

جامعہ ملیہ اسلامیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیرِ ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

جلد ۲۱ | بابتہ ماہ اپریل ۱۹۳۲ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)، پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرولباغ، دہلی سے شائع کیا۔

مِصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر

مصر میں مسلمان سنہ ۶۴۰ء میں داخل ہوئے جبکہ حضرت عمر فاروق کے عہد میں عمرو بن عاص نے اس کو فتح کیا۔ اس زمانے میں مصر کی جو حالت تھی اس کو دکھلانے کے لئے ضرورت ہے کہ اختصار کے ساتھ وہاں کی قدیمی تاریخ بیان کر دی جائے۔

آج کل جو حصہ زمین مصر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس کا مجموعی رقبہ تین لاکھ تراسی ہزار میل مربع ہے جو بیس ضلعوں میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن اس رقبے میں سے مزروعہ حصہ ۱۲ ہزار میل مربع سے زائد نہیں۔ یہ آبادی اور زراعت تمام تر ان قطعات میں ہے جن میں سے دریائے نیل گذرتا ہے۔ بقیہ حصہ بنجر۔ ریگستان اور بے آب و گیاہ ہے۔ درحقیقت مصر کی ساری دولت ثروت آبادانی اور رفاہیت کا ذریعہ یہی مبارک دریا ہے جس کا نام نیل ہے اور آج سے نہیں بلکہ قدیم زمانے سے

مورخین کا بیان ہے کہ قدیم اہل مصر حام بن نوح کے بیٹے مصرایم کی اولاد تھے جو شام کے ملک سے آکر وادی نیل میں جابجا قبیلے قبیلے آباد ہوگئے۔ اسی وجہ سے یہ ملک مصر کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ لوگ پانچ طبقوں میں منقسم تھے۔ پہلا طبقہ کاہنوں کا تھا جو دینی پیشوا تھے۔ ان کی کسی بات کی خلاف ورزی معبود کے حکم سے سرتابی کے برابر سمجھی جاتی تھی۔ دوسرا طبقہ جنگی جماعت کا تھا جو دشمنوں کی مدافعت کرتا تھا۔ باقی تین طبقے تاجروں۔ کاشتکاروں اور گلہ بانوں کے تھے۔

اُس زمانے کے دستور کے مطابق بجز کاہنوں اور جنگ آوروں کے کوئی دوسرا زمین کی ملکیت کا حق نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ اراضی کا بڑا حصہ کاہنوں کے قبضے میں تھا اور کچھ جنگ آوروں کے بقیہ تینوں طبقے زمینیں ان سے ٹھیکے یا کرائے پہ لے کر کاشتکاری کرتے تھے۔

زمانۂ دراز کے بعد جب ان قبائل کی تعداد زیادہ ہوگئی اور انتظامی ضرورت نے

مجبور کیا تو انھیں میں سے ایک شخص مِنا نامی جو جنگی طبقے کا سرغنہ تھا بادشاہ بن گیا اور اس نے مصر میں پہلی سلطنت قائم کی جو ایک زمانے تک اس کی اولاد میں رہی۔ پھر دوسرا خاندان غالب آگیا۔ اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ ۳۱ خاندان حکمراں ہوئے۔

ان اکتیس خاندانوں کا زمانہ پانچہزار سال قبل میلاد مسیح سے شروع ہو کر ۳۳۲ ق م میں ختم ہو جاتا ہے جبکہ سکندر اعظم نے آکر مصر کو فتح کر لیا اور وہاں یونانی حکومت قائم کر دی۔

یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس قدیم تاریخ کے معتبر مصادر موجود نہیں ہیں کیونکہ میلادِ مسیح سے پانسو سال قبل کی کوئی تصنیف نہیں ملی ہے سب سے پہلے مصر کا کچھ حال جس نے لکھا ہے وہ مشہور یونانی سیاح ہیروڈوٹس ہے جو ابو التاریخ کہا جاتا ہے اور جو چار سو چپن سال میلاد مسیح سے پیشتر سواحل نیل سے گزرا تھا۔ اس کے دو سو سال کے بعد ایک مصری کاہن مانیتھو نے مصر کی تاریخ لکھی جو اگرچہ مفقود ہو گئی مگر اس کے جو حصے دوسرے مصنفوں نے نقل کر لئے تھے وہ باقی ہیں۔ انھیں سے قدیم حکمراں خاندانوں کے بادشاہوں کی فہرستیں مرتب کی گئی ہیں۔

گذشتہ صدی میں نو سال کی لگاتار کوشش کے بعد فرانس کے مشہور اثری محقق شمپولیون نے ۱۸۲۱ء میں ہیروغلیفی کتابت کو حل کر لیا جس کی وجہ سے آثار قدیمہ کے کتبے پڑھے جانے لگے اور پرانے ہیکلوں، معبدوں اور ان کے ستونوں اور دیواروں کے نقوش سے بعض بعض قدیم واقعات اور بادشاہوں کے کارنامے منکشف ہوئے۔ ادھر تقریباً نصف صدی سے مصر کے پرانے کھنڈر اور قبرستان کھودے جا رہے ہیں اور قدیم عمارتوں سے آثار کی جستجو ہو رہی ہے جس سے کچھ کچھ تاریخی انکشافات ہوتے جاتے ہیں۔

قدیم اہل مصر جیسا کہ ان کے کتبوں سے ثابت ہوتا ہے متعدد دیوتاؤں اور دیبیوں کو پوجتے تھے لیکن ان کے بڑے معبود دو ہی تھے۔ ایک فتاح یعنی خالق اکبر جس کا بت منف میں تھا جو قدیمی پایہ تخت تھا۔ دوسرا رع یعنی سورج جس کی مورت القصر میں جو آجکل الاقصر کے نام سے مشہور ہے بنائی گئی تھی۔ لیکن رع کو وہ مستقل خدا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ خالق اکبر کی ایک

مظہری تمثال کی حیثیت سے اسکو پوجتے تھے اس کے بعد جوں جوں بت تراشی مین ترقی ہوتی گئی ان کے معبودون کے تنوع مین بھی اضافہ ہوتا گیا۔

بادشاہ بسامتیک اول (خاندان ۲۶) کے زمانہ میں جب یونانی مصر میں آئے اور وہاں رہے تو انہوں نے علوم مصریہ یعنی۔ ریاضی ہیأة اور نجوم وغیرہ کے ساتھ وہاں کے علم الاصنام کو بھی سیکھا اور مصری بتوں کو مع اُن کے ناموں کے یونان میں لیگئے۔

قدما مصر کا یہ خیال تھا کہ دیوتا بعض بعض حیوانات کی شکل مین جسم اختیار کر لیتے ہیں یہی وجہ تھی کہ وہ گائے ۔مگر۔ شہباز وغیرہ کو بھی پوجتے تھے۔

انکا ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ موت کے بعد روح جسم کے ساتھ تعلق قائم رکھتی ہے اسی بنا پر وہ مردوں کی ممی بناتے تھے انہوں نے ایسی دوائیں معلوم کر لی تھین جن کی بدولت جسم غیر محدود زمانہ تک سڑنے سے محفوظ رہ سکے۔ انکا خیال تھا کہ جسم اگر ضائع ہوگیا تو روح بھٹکتی پھریگی اور اسکا کوئی ٹھکانا نہیں رہیگا۔ اس لئے امیر وغریب ہر ایک اپنے مردوں کی ممی بنواتے تھے اور اسکو محفوظ تابوت اور صندوق میں بند کر کے تہہ خانوں میں رکھتے تھے۔ امرا اور سلاطین ان پر پختہ عمارتیں بنوا دیتے تھے۔ چنانچہ مؤرخین کا خیال ہے کہ مصر کے اہرام وہاں کے بادشاہوں کے مقبرے ہین۔

ان میں ایک خاص رسم یہ بھی تھی کہ ممی تیار ہو جانے کے بعد پہلے اسکو ایک چبوترے پر لاکر رکھتے تھے جہاں مذہبی حکام۔ کاہن اور عوام الناس آکر جمع ہوتے اور اعلان کیا جاتا کہ اگر کسی کو اس میت پر کوئی دعوی ہو تو پیش کرے۔ اگر وہ بیگناہ نکلتا تو اسکو قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت ملتی۔ اسکے اقربا اُسی وقت اپنا ماتمی لباس اُتار دیتے اور اس کی برأت پر خوشی مناتے۔ اور اگر وہ گنہگار ٹھہرتا تو دفن سے ممنوع قرار پاتا۔ مجبوراً اسکے ورثہ اسکے تابوت کو لاکر اپنے گھر میں رکھتے جب اس قسم کے متعدد مردے کسی گھر میں جمع ہو جاتے تو کاہن زندون کی خاطر سے ان کو دفن

کرنے کی اجازت دیتے مگر قبرستان سے الگ۔ اس آخری احتساب میں کسی قسم کی رعایت نہیں برتی جاتی تھی چنانچہ خونو اور خفرع بادشاہوں کو بھی کاہنوں نے دفن ہونے سے روک دیا تھا۔

اس دستور کی وجہ سے ان کے اخلاق اچھے تھے۔ کیونکہ آخری فضیحت اور رسوائی کے خوف سے وہ معاملات کو صاف رکھتے اور سب کے ساتھ نیک سلوک کرتے تھے۔

قدیم اہل مصر طب سے بھی واقف تھے اور اکثر بیماریوں کی شناخت اور انکی دوائیں جانتے تھے۔ ریاضی اور ہیأۃ سے بھی انکو ذوق تھا۔ جہانتک معلوم ہوسکا ہے دنیا میں قبطی ہی سب سے پہلی قوم ہیں جنہوں نے شمسی سال ¼ ۳۶۵ دن اور قمری ۳۵۴ دن کا قرار دیا تھا فن تعمیر میں تو اہرام اور عجیب و غریب معبد اور ہیکل انکی ایسی یادگاریں ہیں جنکو آجتک ساری دنیا حیرت کے ساتھ دیکھتی ہے۔

مصر کی اس قدیم تاریخ کو مؤرخین نے مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن مجھے یہاں تفصیل مقصود نہیں ہے بلکہ اُن ۳۱ خاندانوں کی خاص خاص تاریخی باتوں اور یادگاروں پر ایک سرسری نظر ڈالنی ہے۔

مصر کا سب سے پہلا ہرم جو آج ہرم کوکمہ کے نام سے مشہور ہے۔ خاندان اول کے ایک بادشاہ ونفس کا تعمیر کردہ ہے۔ دوسرے خاندان میں بادشاہ بینوتریس بہت نامور گذرا ہے۔ جس نے یہ قانون بنایا تھا کہ خاندان میں اولاد ذکور نہونے کی صورت میں عورتوں کو تخت سلطنت پر بیٹھنے کا حق ہوگا۔ اسی نے دعویٰ کیا تھا کہ میں خدا کا رشتہ دار ہوں اسکے زمانہ سے یہ عقیدہ برابر یونانیوں کے عہد تک ملوک مصر میں چلا آیا۔

تیسرے خاندان کے عہد میں فن کتابت اور سنگ تراشی میں ترقی ہوئی۔ ابوالہول کا عظیم الشان بت جسکا طول ۶۰ گز سے بھی زیادہ ہے اور جو اہرام جیزہ کے پاس آج بھی قائم ہے اسی زمانہ میں بنا تھا۔ اسکا جسم شیر کا ہے اور سر انسان کا جس سے قوت اور عقل

دونوں کے اجتماع کی طرف اشارہ ہے۔

چوتھے خاندان میں سے خوفو بادشاہ نے مصر کا سب سے بڑا ہرم تعمیر کرایا جو جیزہ میں ہے اسکا ہر ضلع ساڑھے سات سو فٹ ہے اور بلندی ساڑھے چار سو۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس میں ایک لاکھ آدمی روزانہ کام کرتے تھے اور وہ پورے تیس سال میں تیار ہوا پہاڑ سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ خلیفہ مامون عباسی جب ۲۱۷ھ میں مصر میں گیا اور لوگوں سے سنا کہ ان عمارتوں میں ملوک مصر کے خزانے ہیں تو اسی ہرم کو توڑوانا شروع کیا۔ بہزار دقت صرف ایک حصہ ٹوٹ سکا اور صرفہ بہت پڑ گیا اسلئے چھوڑ دیا۔

اسی ہرم کے سامنے دوسرا ہرم جو کسی قدر اس سے چھوٹا ہے اسی خاندان کے ایک دوسرے بادشاہ خفرع کا بنایا ہوا ہے۔ تیسرا ہرم بھی جس کی بلندی ۲۰۳ فٹ ہے۔ اسی خاندان کے ایک بادشاہ منکورع نے بنایا تھا۔ اس منکورع کی نعش سنگین تابوت میں برآمد ہوئی تھی انگریز اسکو انگلستان لے جارہے تھے۔ راہ میں پرتگال کے ساحل پر جہاز ڈوب گیا۔ لیکن جثہ اور اسکا چوبیں غلاف جو انسان کی شکل کا تھا برآمد ہو گیا جو لندن کے میوزیم میں موجود ہے۔

چھٹے خاندان نے اپنی قوت بڑھا کر ایک طرف نوبیا اور دوسری طرف شام پر قبضہ کر لیا۔ جنگی کشتیاں بھی تیار کرائیں اور فیروزہ۔ توتیا اور تانبے کی کانیں نکالیں۔ نیز کوہ طور سے عسل وجواہر برآمد کئے۔

گیارھویں خاندان نے اپنے عہد میں تجارتی غرض کے لئے مصر اور عرب کے راستہ کو ٹھیک کرایا۔ اسمیں جابجا منزلیں بنوائیں اور کوئیں کھدوائے۔ یہی راستہ اسلام کے زمانہ تک رہا۔

بارھویں خاندان کے اوسرتسن نامی بادشاہ نے طیبہ کا ہیکل تعمیر کرایا۔ اسی کا بنوایا ہوا ایک ستون مطریہ میں موجود ہے جسپر ہیروغلیفی میں یہ کتبہ ہے

"بادشاہِ منصور، ہر موجود کی حیات، بالائی اور نشیبی مصر کے فرمانروا، دونوں

تاجوں کے مالک، خورشید کے فرزند، اوسرتسن، مطریہ کے معبودوں کے
محبوب نے، جو ہمیشہ زندہ رہے۔ اس نشان کو رسمی تیوہار کے آغاز میں اپنے
نام سے اس جشن کی یادگار میں نصب فرمایا۔"

چودھویں خاندان کے خاتمہ پر شام اور عرب کے قبائل نے ٹڈی دل کی طرح مصر پر
چڑھائی کی جس قبیلہ نے ان کی قیادت کی وہ توریت میں عشین اور عربی تواریخ میں عالیق کہا
گیا ہے۔ ان لوگوں نے مصر کے بڑے بڑے ہیکلوں کو ڈھا دیا۔ شہروں کو آگ لگا دی۔
باشندوں کو تہ تیغ کر ڈالا اور اپنی حکومت قائم کی۔ اس خاندان کے زمانہ میں حضرت ابراہیم
علیہ السلام جو انکے ہم قبیلہ تھے مصر میں تشریف لے گئے تھے اور عملیقی بادشاہ نے حضرت
ہاجرہ کو ان کی خدمت کے لئے دیا تھا۔

مصر میں عمالقہ کے تین مختلف خاندانوں نے حکومت کی۔ آخری خاندان کے
بادشاہ ابوقیس کے عہد میں حضرت یوسف علیہ السلام کو تاجروں کا قافلہ مصر میں لے گیا تھا
اور اسکے وزیر دو فرما می کے ہاتھ بیچا تھا۔ اسی خاندان کے آخر میں مصریوں نے پھر اپنی حکومت
قائم کرلی اور اعمس بادشاہ نے عمالقہ کو پورے پانچ سو سال کے بعد مصر سے نکال کر اپنا تسلط
جمایا۔ جبل قرنہ پر دیر بحری سے اسکی ممی نکلی ہے جو جیزہ کے انتیقہ خانہ خدیوی میں موجود ہے۔

اسی خاندان کا ایک بادشاہ تحوتمس ثالث تھا جس نے ایک طرف عرب، شام، عراق
ایشیائے کوچک اور کردستان وغیرہ کو فتح کیا اور دوسری طرف بحری بیڑہ سے قبرص،
کریٹ، یونان اور اطالیہ کے جنوبی حصہ پر قابض ہو گیا۔ اسکے بنائے ہوئے دو ستون مطریہ
میں تھے جو ملکہ قلیوپطرا کے عہد میں اسکندریہ میں لاکر رکھے گئے تھے۔ اب انمیں سے ایک
انگلستان میں ہے اور ایک امریکہ میں۔ اسی خاندان کا بادشاہ توت انخ عمون تھا جس کی نعش
مع اسکی ملکہ کی نعش کے بے شمار خزانہ اور طلائی تخت وغیرہ کے ساتھ آٹھ سال کا عرصہ ہوا
الاقصر سے نکلی ہے۔

انیسویں خاندان میں مصر کا سب سے بڑا بادشاہ رعمیس اکبر تھا جس کی محبت اور عظمت مصریوں کے دلوں میں حد عبادت تک پہونچگئی تھی اس نے کنعانیوں پر دولاکھ فوج کے ساتھ حملہ کیا اور ۲۰ سال تک لڑتا رہا۔ بالآخر مصالحت ہوئی۔ چاندی کے پتروں پر صلح نامہ لکھا گیا جو آج لندن کے میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ اس رعمیس کا بیٹا منفتاح تھا یعنی وہ فرعون جو حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کا پیچھا کرتے ہوئے سمندر مین غرق ہوا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کی نعش برآمد ہوگئی ہے۔ جیزہ کے عجائب خانہ میں رکھی ہوئی ہے اور دیکھنے والون کے لئے عبرت کا سامان ہے۔ کہ یہ مشت خاک اور خدائی کا دعویٰ!!

بیسویں خاندان میں ایک بادشاہ رعمیس ثالث تھا جسکی ممی پیرس کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

اکیسویں خاندان کے آخری بادشاہ کے زمانہ مین اشور کے بادشاہ نمرود نے چڑھائی کرکے مصر پر حکومت قائم کرلی جو ۱۰۰ سال تک اسکے خاندان میں رہی۔ اسی زمانہ میں بابلی اور اشوری تہذیب مصر میں پہونچی۔

نمرود کے بیٹے ششنق کی صورت کرنک کے ہیکل کی چاردیواری پر موجود ہے سر پر شاہی تاج۔ ہاتھ میں مصری تلوار اور سامنے حضرت سلیمان کے بیٹے رحبعام کی تصویر جنکی گردن میں رسّی پڑی ہوئی ہے۔

چھبیسوین خاندان کے بادشاہ بسامتیک نے یونانیوں کی مدد سے تخت و تاج حاصل کیا تھا۔ اسلئے اسکے عہد میں انکو عروج ملا۔ اور بڑی بڑی جاگیریں اور امارتین دی گئین۔

ان یونانیون نے مصر مین مدارس قائم کئے جن مین ان کے ملک کے بہت سے طلبا تحصیل علم کے لئے آنے لگے۔ فیثاغورث۔ بقراط۔ جالینوس۔ افلاطون۔ اور ارسطو وغیرہ اکثر حکمائے یونان نے اپنے اپنے زمانوں میں آکر ان مین علوم حاصل کئے۔

اسی خاندان کے آخر مین کے بہمن پسر اسفندیار نے مصر کو جاکر مسخر کرلیا۔ ایک عرصہ تک

ہل فارس وہاں حکومت کرتے رہے۔ آخر میں ایک مصری رئیس تیس نامی نے ان کو مصر سے نکالا اور نپی حکومت قائم کرلی۔ مگر کچھ ایسے انقلابات پیش آئے کہ ۶۰ سال کے عرصے میں تین مختلف مصری خاندانوں یں حکومت تبدیل ہوتی گئی آخر میں پھر ایرانیوں نے آکر قبضہ کرلیا۔ انھیں کی حکومت میں دارا کا عہد تھا کہ ۳۳۲ھ ق م میں سکندر نے مقدونیہ سے نکل کر مصر سے طرابلس تک فتح کرلیا۔ اپنے نام سے اسکندریہ آباد کرا کے وہاں ایک نائب چھوڑا اور ایران کو فتح کرتا ہوا ہندوستان تک پہنچا۔ اپسی میں بابل میں انتقال کرگیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس کا جثہ اسکندریہ میں لاکر دفن کیا گیا۔

اسکندر کی فتح سے مصر میں یونانی حکومت قائم ہوگئی جو چند سال تک اس کے خاندان میں رہی۔ پھر بطلیموس نے جو بابل میں اس کا نائب تھا مصر پر خودمختارانہ قبضہ کرلیا۔

اسی خاندان کی آخری تاجدار ملکہ قلوبطرا تھی جس کے جام زہر نوش کرنے کے بعد ۳۰ھ ق م یں اس کی حکومت قیصر آگسٹس کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس وقت سے مصر رومی سلطنت کا ایک صوبہ ہوگیا۔

۳۹۵ء میں رومی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ مغربی حصہ کا پایہ تخت رومۃ الکبرٰی رہا۔ اور مشرقی حصہ کا قسطنطنیہ قرار پایا۔ مصر اسی حصہ کا ماتحت رہا۔

آغاز عہد اسلام میں قسطنطنیہ کے تخت پر قیصر ہرقل تھا۔ اس نے ایک قبطی امیر مقوقس کو مصر کا والی مقرر کیا تھا۔ اسی کے عہد میں ۶۲۹ء میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک عظیم القبط کے نام حاطب بن بلتعہ رضہ لے کر گئے تھے۔ مقوقس اسلام تو نہیں لایا مگر ایک خچر جس کا نام دلدل تھا اور اور دو لونڈیاں مع دیگر ہدیوں کے اس نے رسول اللہ کی خدمت میں بھیج دیں۔ انھیں میں سے ایک حضرت ماریہ قبطیہ تھیں جن کے بطن سے حضور اکرم کے بیٹے ابراہیم پیدا ہوئے تھے۔

اس طرح پر حضرت ہاجرہ کے قدیمی رشتے کے بعد اہل مصر کا ایک جدید رشتہ بھی رسول عربی کے ساتھ قائم ہوگیا۔

فتح اسلامی ۱۸ھ مطابق ۶۳۹ء میں طاعون عمواس کے بعد حضرت عمر جب فوج کے انتظام

کے لئے مدینہ سے شام میں تشریف لے گئے تو عمرو بن عاصؓ نے تنہائی میں ان سے عرض کیا کہ مجھے مصر پر چڑھنے کی اجازت دیجئے۔ کیونکہ اس کے فتح کر لینے سے رومیوں کی قوت ٹوٹ جائے گی اور اسلام کی شوکت بڑھے گی۔ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی کلفت اور مشقت کے خیال سے اس دور دراز مہم میں پس و پیش کیا لیکن عمرو بن عاصؓ نے اپنے عزم راسخ سے کامیابی کی ایسی قوی امید دلائی کہ آخر کار راضی ہو گئے اور چار ہزار سوار جو سب کے سب یمن کے قبیلہ کعب کے تھے۔ ان کے ساتھ کر دیئے۔ وہ اس وقت اسی فوج کو لے کر روانہ ہو گئے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ جس طرح شام میں دربار خلافت سے ہم کو مسلسل کمک آتی رہی ہے اسی طرح مصر میں بھی آئے گی۔

ان کے روانہ ہو جانے کے بعد امرار اسلامی نے تعجب ظاہر کیا کہ ایسے ملک میں جہاں کم سے کم ۸۰ ہزار فوج حفاظت کے لئے موجود ہے۔ عمرو بن عاصؓ ان مٹھی بھر آدمیوں سے کیا کریں گے۔ حضرت عثمان نے خود خلیفہ سے جا کر کہا کہ ابن عاص امارت کا سخت حریص اور پیش قدمی اور حملے میں نہایت بے باک ہے ایسا نہ ہو کہ اس جماعت کو ورطۂ ہلاکت میں ڈال دے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

عمرو بن عاصؓ بیابان سینا سے گزر کر مقام عریش میں پہنچے اور اس کو فتح کر لیا۔ یہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ تھی۔ وہاں قربانی کی اور فوج کو دعوت کھلائی۔

عریش سے نکل کر فرما کی طرف بڑھے یہ ایک بڑا شہر تھا جس کے ارد گرد فصیل تھی اور ملک مصر کا دروازہ سمجھا جاتا تھا اس وجہ سے حفاظت کے لئے رومی ہزار فوجیں رکھی جاتی تھیں۔ عمرو بن عاصؓ نے محاصرہ کیا اور ایک مہینہ کے بعد محرم کو اس کے اندر داخل ہو گئے۔ اب رومی فوجیں مقام عین شمس پر جمع ہوئیں اور پوری طاقت سے مقابلہ کی تیاری کرنے لگیں۔ عمرو بن عاصؓ نے دربار خلافت سے امداد طلب کی۔ وہاں سے دس ہزار فوج آئی جس میں مشاہیر صحابہ میں سے حضرت زبیر بن عوام، مقداد بن اسود، عبادہ بن صامت، مسلمہ بن مخلد، ابوالدرداء اور شرجیل بن حسنہ وغیرہ تھے۔

رومی سپہ سالار تھیوڈور لشکر لے کر بڑھا۔ کھلے میدان میں مقابلہ ہوا۔ مسلمانوں نے ایسی شکست دی کہ اس کی بیس ہزار فوج میں سے صرف تین سو آدمی اپنی جانیں بچا سکے جو قصر شمع کی طرف بھاگ گئے تھے باقی سب کے سب مارے گئے۔

قصر شمع ایک محفوظ قلعہ تھا جس میں والی مصر مقوقس خود موجود تھا۔ اب مسلمانوں نے بڑھ کر اس کا محاصرہ کیا۔ مقوقس نے چند روز کے بعد عمرو بن عاص کے پاس دو آدمی بھیجے اور لکھا کہ

تم لوگ ہمارے ملک میں گھس آئے اور جنگ کرنے لگے۔ اب ایک رومی لشکر آرہا ہے جو ہر طرح کے ساز و سامان سے مسلح ہے وہ یقیناً تم کو فنا کر دے گا۔ لہٰذا تمہارے حق میں بہتر یہ ہے کہ صلح کر کے چلے جاؤ ورنہ اس کے آجانے کے بعد کوئی گفتگو نہ ہو سکیگی۔

حضرت عمرو بن عاص نے جواب دیا کہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لو۔ اسلام یا جزیہ یا جنگ۔

مقوقس عین شمس کی ہولناک جنگ سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مسلمان اس قلعہ کو بھی یقیناً فتح کر لیں گے۔ لہٰذا ان کے ساتھ صلح کر لینی چاہئے۔ چنانچہ ان کے مشورے سے اس نے عمرو بن عاص کو پھر لکھا کہ آپ اپنا قائم مقام بھیجئے شاید صلح کی کوئی صورت نکل آئے۔ انھوں نے عبادہ بن صامت رضؓ کو دس آدمیوں کے ہمراہ بھیجا اور حکم دیا کہ تمہیں گفتگو کرنا اور بجز ان تینوں باتوں کے جو میں نے لکھی ہیں اور کوئی بات قبول نہ کرنا۔

حضرت عبادہ کا طول قامت دس بالشت تھا اور رنگ سیاہ۔ مقوقس ان کو دیکھ کر گھبرایا اور کہا کہ تم میں سے کوئی دوسرا شخص میرے ساتھ گفتگو کرے۔ مسلمان بولے کہ وہ عقل و رائے میں ہم سے بہتر اور درجے اور رتبے میں افضل ہیں اور ہمارے امیر نے انھیں کو اپنا نمائندہ مقرر فرمایا ہے۔ مجبوراً مقوقس نے ان کو کلام کی اجازت دی۔ انھوں نے کہا کہ

"ہماری لڑائی کسی دنیاوی غرض سے نہیں بلکہ محض اعلائے کلمۂ حق کے لئے ہے نہ ہم دنیاوی آسائش کے جویا ہیں۔ راحت کی جگہ تو آخرت ہے۔ ہمارے اللہ اور رسول نے بھی ہم کو بتلایا ہے اور اس بات کا عہد لیا ہے کہ ہم اپنی ساری توجہ رضائے الٰہی کی طرف رکھیں اور دنیا کی نعمتوں سے صرف ضروری غذا و لباس پر قناعت کریں۔"

مقوقس نے پسندیدگی سے سراہا۔ پھر نصیحت کے قالب میں ڈھلی ہوئی دھمکی دینی شروع کی اور کہا کہ

"بے شک تمھاری یہی حالت ہے لیکن اب تمھارے مقابلے کے لئے ایک رومی لشکر آرہا ہے جن کی شجاعت مسلم ہے اور جو اس کی پروا نہیں کرتے کہ کس سے لڑتے ہیں اور ان کا مدمقابل کون ہے۔ تم یہاں پڑے ہوئے مصیبتیں اٹھا رہے ہو۔ اس لئے میں تمھاری حالت پر ترس کھا کر مشورہ دیتا ہوں کہ صلح کر لو۔ تم میں سے ہر ایک کو دو دو دینار امیر کو ایک سو اور خلیفہ کو ایک ہزار دے دوں گا۔ اس کو لے کر اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ۔ قبل اس کے کہ وہ لشکر آجائے جس کے مقابلے کی طاقت تم نہیں رکھتے۔"

حضرت عبادہ نے فرمایا۔

"تم جو رومیوں کی قوت اور ان کی کثرت سے ہم کو ڈراتے ہو تو اس دھوکے میں نہ رہو کہ اس سے ہمارے ارادوں میں کچھ بھی فتور پڑ سکے گا۔ کیونکہ ہم سب اگر قتل بھی ہوگئے تو یہ ہمارے رب کی رضامندی اور حصول جنت کا ذریعہ ہوگا جس سے بڑھ کر کوئی شے ہم کو محبوب نہیں۔ ہم میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو یہاں سے لوٹ کر اپنے اہل وعیال کے پاس جانے کا خواہشمند ہو بلکہ ہر ایک صبح اور شام یہی دعا کرتا ہے کہ اللہ اس کو شہادت سے سرخرو فرمائے۔ اس لئے تم ہمارا خیال چھوڑ دو اور اپنی مصلحت دیکھ کر ان تینوں صورتوں میں سے جو پیش کی گئی ہیں کوئی صورت اختیار کر لو۔"

مقوقس نے کہا کہ کیا ان کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ اس گفتگو کے بعد رخصت ہو کر واپس چلے آئے۔ مقوقس نے اپنے اصحاب کو سمجھایا کہ اسلام یا جزیہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی پسند کر لو کیونکہ تم ان کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے

لیکن انھوں نے اس کی بات نہ مانی اور جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ مگر چند ہی روز کے بعد مسلمانوں کے سخت حملوں کی تاب نہ لاکر آخر مصالحت پر مجبور ہوئے۔ مسلمان بلائے گئے اور یہ عہدنامہ لکھا گیا۔

"عمرو بن عاص اور مقوقس باہم اس بات پر صلح کرتے ہیں کہ اہل اسلام تمام ملک میں ہر ایک قبطی سے جو بالغ ہے خواہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ دو دو دینار جزیہ سالانہ لیں گے۔ بڈھے بچے۔ عورتیں اور معذور اشخاص اس سے بری ہیں۔ اہل مصر کے اراضی و اموال انھیں کے ہاتھ میں رہیں گے۔ اور ان کے مذہبی رسوم میں کسی قسم کا دخل نہیں دیا جائے گا۔"

یہ عہد مقوقس نے اپنے کل ہم قوموں یعنی اقباط مصر کی طرف سے کیا تھا۔ اس کے بعد رومیوں نے کہا کہ اگر تم چاہو تو ان شرائط پر صلح کر کے مصر میں رہو نہیں تو اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ۔

جب یہ عہدنامہ منظوری کے لئے ہرقل کے پاس بھیجا گیا تو اس نے مقوقس کو سخت توبیخ کی اور لکھا کہ عرب کی حقیر قوت کے مقابلے میں تم نے کیوں دب کر صلح کر لی اور سارا ملک ان کے حوالے کر دیا میں اس عہدنامے کو جائز نہیں قرار دیتا۔ رومی امیروں کو حکم بھیجا کہ تم جنگ جاری رکھو۔ مقوقس اپنی جماعت کو لے کر قلعے سے باہر نکلا اور نیل کے اُس پار مقام جزیرہ میں اپنے قصر میں جا کر پناہ گزیں ہوگیا۔ وہاں سے عمرو بن عاص کے پاس کہلا بھیجا کہ میں نے جو عہدنامہ لکھا ہے اس پر قائم ہوں۔ میری قوم ان شرائط کو پورا کرے گی لہٰذا اس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔

حضرت عمرو بن عاص نے لکھا کہ ہم بھی عہدنامے کی پابندی کریں گے لیکن قبطیوں کو چاہئے کہ ہمارے راستے میں فلاں فلاں دو مقامات پر پل بنائیں اور جہاں جہاں ہماری فوج خیمہ زن ہو وہاں بازار لگائیں اور سامان رسد پہنچائیں۔ قبطی اس پر رضامند ہو گئے۔

بعض مورخین نے مقوقس کے اس فعل کو خیانت اور غداری قرار دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پر یہ بات روشن ہو چکی تھی کہ رومی فوج کسی طرح عربوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ خود قیصر ہرقل اپنی پوری قوت کے ساتھ ان کے مقابلے میں شکست پر شکست کھا کر شام کا ملک چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔ اس

ہے علاوہ اس کی قوم رومیوں کے ظلم وستم سے جاں بلب تھی۔ اور عربوں کی حکومت میں اس کو دینی آزادی اور دنیاوی آسائش نظر آئی۔ ایسی صورت میں اس کے لئے سوائے مصالحت کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اسی وجہ سے اس نے نہ صرف مفتوحہ علاقہ بلکہ کل ملک مصر کی طرف سے عہدنامہ لکھدیا۔

قیصر نے اس کو قسطنطنیہ طلب کیا اور باز پرس کی۔

رومیوں نے مقابلہ شروع کیا لیکن اسی درمیان میں قیصر انتقال کر گیا جس کی وجہ سے ان کا نظام ابتر ہوگیا۔ مسلمانوں نے ان کو شکست دیتے ہوئے بہت تھوڑے عرصے میں پہنچ کر اسکندریہ کا بھی جو ان کا مرکز تھا محاصرہ کرلیا۔ وہاں رومیوں کے ساتھ ۲۰ اکتوبر ۶۴۱ء میں معاہدہ لکھا گیا عجیب بات یہ ہے کہ اس معاہدے میں رومیوں کا نمائندہ بھی مقوقس ہی تھا جو قیصر کے انتقال کے بعد اسکندریہ میں واپس آگیا تھا۔ معاہدہ کی دفعات یہ تھیں۔

(۱) یہ عارضی صلح صرف گیارہ مہینے کے لئے ہے۔ ۲۸ ستمبر ۶۴۲ء کو اس کی مدت ختم ہوجائیگی۔

(۲) اس اثنا میں عرب رومیوں کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہیں کریں گے بشرطیکہ وہ کوئی مخالفانہ رویہ نہ اختیار کریں۔

(۳) کسی رومی فوج کو مصر کی سرزمین میں داخل ہونے کا حق نہیں ہے۔

(۴) مسلمان کنیسوں کو نقصان نہیں پہنچائیں گے نہ کسی دینی معاملے میں مداخلت کریں گے۔

(۵) یہود کو شہر اسکندریہ میں سکونت کا حق حاصل رہے گا۔

(۶) اسکندریہ کی محافظ رومی فوج اپنا سامان لے کر بحری راستے سے جا سکتی ہے۔ مگر جو لوگ خشکی سے جانا چاہیں گے ان کو جزیہ دینا ہوگا۔

(۷) شرائط معاہدے کی ضمانت کے لئے رومی فوج کے ۱۵۰ سردار مسلمانوں کے پاس بطور رہن رہیں گے۔

اس معاہدے کے بعد جنگ ختم ہوگئی اور بہت تھوڑے عرصے میں رومی فوج نے تمام مصر کو خالی کردیا اور بالائی اور نشیبی کل علاقوں پر مسلمان قابض ہوگئے۔

اسکندریہ کے اطراف کے باشندوں نے دوران جنگ میں رومیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو نقصانات پہنچائے تھے اس لئے عمرو بن عاص نے ان سب کو مع اہل و عیال کے گرفتار کر کے خمس غنیمت کے ساتھ دربار خلافت میں بھیج دیا۔ مگر حضرت عمر نے ان کے جرائم معاف کر کے ذمیوں میں شامل کر دیا۔ اور پھر ان کو مصر میں واپس بھیج دیا کہ اپنے گھروں میں رہیں اور اپنی ملکیتوں پر قبضہ رکھیں۔

اسلامی فوج کا خیال تھا کہ مصر کو ہم نے جنگ سے فتح کیا ہے اس لئے اس کو سپاہیوں میں تقسیم کر دینا چاہئے۔ مگر عمرو بن عاص اور خلیفۂ وقت نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ اتنے بڑے ملک کو غنیمت اور اس کے باشندوں کو غلام بنا کر فوج میں تقسیم کر دیں۔ اس وجہ سے اہل مصر کو ذمی اور اس کی زمین کو خراجی قرار دیا۔

عمرو بن عاص نے کل ملک مصر کو دو سال کے عرصے میں فتح کر لیا۔ اس کے بعد برقہ اور طرابلس غرب کو بھی قبضے میں لائے۔ تونس کا بھی ارادہ رکھتے تھے مگر حضرت عمر نے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اور حکم بھیجا کہ جس قدر علاقہ قبضے میں آچکا ہے اسی کا انتظام مکمل کرو۔

اس وقت سے آج تک مصر مسلمانوں کے زیر حکومت ہے۔ یہ اسلامی عہد بارہ تاریخی دوروں میں منقسم ہوتا ہے۔

(۱) خلافت راشدہ	۶۳۹ء	سے	۶۶۱ء	تک
( ) بنی امیہ	۶۶۱ء	"	۷۵۰ء	"
(۳) عباسیہ اول	۷۵۰ء	"	۸۷۰	"
(۴) طولونی	۸۷۰	"	۹۰۵	"
(۵) عباسی بار دوم	۹۰۵	"	۹۳۴	"
(۶) اخشیدی	۹۳۴	"	۹۶۹	"
(۷) فاطمی	۹۶۹	"	۱۱۷۱	"
(۸) ایوبی	۱۱۷۱	"	۱۲۵۰	"

(۹) مالیک بحری ۱۲۵۰ء سے ۱۳۸۲ء تک
(۱۰) مالیک چرکس ۱۳۸۲ " ۱۵۱۷ "
(۱۱) عثمانیہ ۱۵۱۷ " ۱۸۰۱ "
(۱۲) خدیوی ۱۸۰۱ء سے آج تک

اب میں اختصار کے ساتھ الگ الگ عنوانات میں اس اسلامی اثر کو بیان کروں گا جو مصر اور اہل مصر پر پڑا اور جو میرے اس مقالے کا موضوع ہے۔

مرکز

قدیم زمانے میں فراعنہ مصر کا دارالسلطنت پہلے طیبہ تھا پھر منف جن کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ سکندر نے جب قبضہ کیا تو اپنے نام پر اسکندریہ کو آباد کرایا۔ اس وقت سے وہی مرکز قرار پا گیا اور ساحل بحر پر واقع ہونے کی وجہ سے ایک عظیم الشان بندرگاہ اور شہر ہو گیا۔ رومیوں نے بھی اپنے عہد میں اسی کو مستقر رکھا۔

عمرو بن عاص نے جب اسکندریہ فتح کیا تو وہاں کی جملہ شاہی عمارتیں ان کو خالی ملیں۔ چاہتے تھے کہ اسی کو صدر مقام رکھیں لیکن حضرت عمر جو اپنے اور کسی دوسرے اسلامی مرکز کے درمیان دریا کا حائل ہونا پسند نہیں کرتے تھے راضی نہ ہوئے۔ اس لئے دریائے نیل کے اسی پار قصر شمع کے متصل جو زمین ہے اس کو منتخب کیا۔ یہ جگہ عرب اور مصر کے قریب ترین نقطۂ اتصال پر ہے اور یہاں سے مصر کے دونوں اطراف شمالی اور جنوبی کی نگہداشت ہو سکتی ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی صحت بخش ہے ایک طرف دریائے نیل ہے اور دوسری طرف کوہ مقطم اور سارا قطعہ سرسبز و شاداب ہے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ پہلے اسی مقام پر عربی فوج نے ڈیرے ڈالے تھے جب اسکندریہ کو روانہ ہونے لگے اسوقت عمرو بن عاص کے خیمے میں ایک کبوتر نے گھونسلہ بنا کر انڈے دے دئے تھے انھوں نے اس پرند کی خاطر سے اس کو اسی طرح چھوڑ دینے کا حکم دیا اور کہا کہ مت اکھاڑو ورنہ ہمارے اس مہمان کو تکلیف ہوگی۔ جب اسکندریہ کی مہم سے واپس آئے تو اسی میں اترے اور اسی

جگہ شہر تعمیر کرایا۔ ڈیرہ کو عربی میں فسطاط کہتے ہیں اس وجہ سے اس شہر کا نام فسطاط رکھ دیا گیا۔ اس کے ارد گرد فصیل بنوائی اور وسط میں ایک عظیم الشان جامع مسجد تعمیر کرائی جس کی سمت قبلہ کی تعیین میں ۸۰ صحابہ کرام شریک تھے۔

عرب کے بعض قبائل مثلاً حمیر۔ ازد اور ہمدان وغیرہ کے لوگوں نے چہار دیواری کے اندر سکونت رکھنے کو شجاعت کے منافی سمجھا۔ اس لئے باجازت خلیفہ ان کو ایک دوسرے قطعے میں آباد کرایا جس کا نام جیزہ رکھا اور جو آج تک آباد ہے۔

فسطاط مدت تک مصر کا صدر مقام اور وہاں کی تہذیب اور تجارت کا مرکز رہا جس جس محلے میں چار چار گھر آباد ہوئے تھے۔ ان میں چار چار سو آدمیوں کی سکونت ہو گئی۔ امیر معاویہ کے زمانے میں چالیس ہزار فوج یہاں رہتی تھی۔ ابن طولون کے عہد میں اس کی آبادی اس قدر بڑھ گئی کہ اس کو اس کے متصل ایک دوسرا شہر قطائع کے نام سے اپنی فوج کے لئے آباد کرنا پڑا۔ چوتھی صدی ہجری کا مشہور سیاح بشاری لکھتا ہے کہ "فسطاط بغداد کا مدمقابل مغربی تجارت کا مرکز اور مسلمانوں کا مایۂ فخر ہے۔ دنیائے اسلام میں یہاں کی جامع مسجد سے زیادہ کہیں علمی مجالس نہیں ہوتیں نہ یہاں کی بندرگاہ سے زیادہ کہیں کشتیاں لنگر انداز ہوتی ہیں۔

۳۵۸ھ میں جب خلفاء فاطمیہ کا مصر پر قبضہ ہوا اور شہر قاہرہ تعمیر کر کے مرکز بنایا گیا اس وقت سے فسطاط کی رونق کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ صلیبی ہنگاموں کے دوران میں وہ بالکل ویران ہو گیا۔ مگر اب تک جامع عمرو بن عاص اپنی جگہ پر موجود ہے۔

عربی سیادت کے خلاف عجمی تحریکیں

پہلی صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے عرب دنیا کے طول وعرض میں چھا گئے۔ کم ایسے خطے تھے جہاں کے وہ حکمراں نہ بن چکے ہوں یا کم از کم اپنے اثرات ہی سے دنیا کو متاثر نہ کیا ہو۔ اکثر وبیشتر مقامات پر انھیں کی تہذیب تھی اور انھیں کا تمدن، اس لئے بعض قوموں کے بعض ان افراد نے جن کا قومی، وطنی، اور مذہبی جذبہ قوی تھا اس محکومیت کو قومی ذلت اور اپنی شاندار روایات کے بالکل منافی سمجھا اور اس نئی اسلامی تہذیب کو مشتبہ نظروں سے بھی دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ اختلاط ایک نہ ایک دن ان کی قومیت ان کے مذہب اور لسانی امتیاز کو بالکل جڑ سے اکھاڑ کر رہے گا رسوائی کا یہ احساس اور اپنی ہستی کے فنا ہونے کا یہ خطرہ ایک سے زیادہ قوموں کے زیادہ افراد کو تھا لیکن بالخصوص ایرانیوں کو زیادہ تھا۔

ان الفرس کانوا من سعة الملك وعلو الید علی جمیع الامم وجلالة الخطیر فی انفسهم حتی انهم کانوا یسمون انفسهم الاحرار والابناء وکانوا یعدون سائر الناس عبیداً لهم فلما امتحنوا بزوال الدولة عنهم علی ایدی العرب وکانت العرب اقل الامم عند الفرس خطراً تعاظمهم الامر وتضاعفت لدیهم المصیبة۔[1]

ایرانی اپنی وسیع سلطنت اور علو مرتبت کے اعتبار سے تمام قوموں پر غالب تھے اس لئے اپنے آپ کو آزاد اور دوسروں کو غلام سمجھتے تھے لیکن جب ان کی حکومت عربوں کے ہاتھ میں چلی گئی جس کو کہ یہ اپنے سے فروتر سمجھتے تھے تو یہ ان کو بہت شاق گذرا

انھیں خطرات اور اپنے ان احساسات کی بنا پر ایک ایسی چال چلنے پر مجبور ہوئے جو ایک عرصے بعد مسلمانوں کے انتشار اور ان کی سلطنت کی کمزوری کا سبب بنی۔ وہ چال یہ تھی کہ بظاہر مسلمان ہونے کا اظہار کیا جائے لیکن باطن میں خفیہ طور پر ان کے مٹانے کی فکر ہو۔ یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا کہ

---

(۱) الملل والنحل ابن حزم صفحہ ۱۱۵

مسلمانوں کی اس وقت کی قوت کے آگے کوئی دوسرا طریقہ مقابلہ کا مشکل تھا چنانچہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو کر سب سے پہلے شرعی احکامات میں تاویل اور تنقید کا رواج عام دیا۔

[۱] راموا عند شوکۃ الاسلام تاویل الشرایع علی وجوہ تعود الی قواعد اسلافہم وذالک انہم اجتمعوا فتذاکروا ما کان علیہ سلافہم من الملک وقالوا لا سبیل لنا الی دفع المسلمین بالسیف لغلبتہم واستیلائہم علی الممالک ولکنا نحتال بتاویل شرایعہم الی مایعود علی قواعدنا ونستدرج بہ الضعفاء منہم فان ذلک یوجب اختلافہم واضطراب کلمتہم۔

اسلام کی بڑھتی ہوئی شوکت سے خائف ہو کر ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ شریعت کی تاویل اس طریقے پر کی جائے جو ان کے اسلاف کے طریقوں کی طرف ان کو لے جاسکے اس لئے وہ جمع ہوئے اور اپنے بزرگوں کے بلند مرتبت کو یاد کیا اور چونکہ کوئی دوسرا طریقہ مسلمانوں کی قوت اور ان کے استیلاء کی وجہ سے نہ سوجھا سوائے شریعت کی تاویل کے کہ یہی ان میں (مسلمانوں میں) اضطراب اور اختلاف کا باعث ہو سکتا تھا۔

دوسرا موثر اور کارگر آلہ جو اختیار کیا گیا وہ میلان شیعیت کا تھا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ جماعت تھی کہ جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نہ ان کی اولاد سے کوئی محبت تھی، ان کے نزدیک آل علیؓ اور دیگر عرب یکساں تھے صرف اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے یہ ایک بہتر صورت تھی وہ خوب سمجھتے تھے کہ عام مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے جتنا شغف ہے کسی سے نہیں ہو سکتا۔

"از ابتدائے[۲] اسلام مخصوص از روزے کہ ایران بدست سعد بن وقاص از طرف خلیفہ دوم

---

(۱) شرح مواقف

(۲) یہ اور اس کے بعد تین چار مقامات پر جو اقتباسات دئے گئے ہیں "تجلیات روح ایرانی در ادوار تاریخی" ایک فارسی رسالے کے ہیں۔ یہ رسالہ ایران کے ایک مشہور قوم پرست حسین کاظم زادہ کا ہے اس میں یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ روح خاص جو زمانہ قدیم سے ایرانیوں میں چلی آتی ہے اب تک باقی اور زندہ ہے اور اس روح سے ان کی مراد جذبہ قوم پرستی، وطن پرستی اور مذہب پرستی ہے۔ وہ

فتح واستیلا گردید۔ ایرانیاں کینہ وحس انتقام در دل خود می پروریدند وایں حس وکینہ وانتقام در مواقع عدیدہ خود نمائی می کرد وازپردۂ بیروں می افتاد تاآنکہ باآں فرقہ تشیع بکلی ظاہر گشت"

" محبت مخصوص از ابتدائے اسلام ایرانیاں نسبت بخاندان رسول صلعم، حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) واولاد او بہم رسانیدہ خیلے از اسباب معلومہ یک علت سیاسی نیز داشت۔ وگرنہ ہمہ قبائل عرب وپیشوایان اسلام برائے ایرانیاں یکے بود ویا ہیچ کدام خویشی و روابط مخصوص پیش از وقت نداشتند"

صحیح طور پر یہ بتانا کہ کس وقت اور کس کے عہد حکومت میں انھوں نے تشیع کا اظہار کیا، ذرا مشکل ہے۔ البتہ یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ بنو امیہ کے زمانے میں انھوں نے بھی اپنے مخبر، داعی، قاصد اور نقیب سلطنت امیہ کے چپہ چپہ پر پھیلا دئے تھے، اور یہ وہ موقعہ تھا جب دو دو جماعتیں علویہ اور عباسیہ متحدہ سازشی قوت کے ساتھ بنو امیہ کی حکومت کو مٹانے کے درپے تھیں جو ایک خالص عربی حکومت تھی، ظاہر ہے کہ اس سے بہتر موقعہ عربوں کے خلاف ان کو اور کب مل سکتا تھا، چنانچہ ان کے مخبروں اور داعیوں نے وہ کر دکھایا جو ایک بڑی سے بڑی اور طاقتور حکومت بھی اپنے مخالف کے مقابلے میں مشکل کر سکتی، بالآخر انھیں کے ایک شخص ابو مسلم جو خالص ایرانی اور مجوسی النسل تھا بنو امیہ کی حکومت کو برباد کرنے اور ان کی جگہ عباسی حکمراں کو متعین کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بنو عباسیہ کی حکومت کو جو خود ان کی کوششوں

کھتے ہیں اسی جذبہ کا اثر تھا کہ جس نے ایرانیوں کو مختلف مذاہب اور قوموں کے مقابل سینہ سپر کیا اور پھر اسلام کے خلاف بھی انھوں نے اپنے اس جذبہ کا ثبوت دیا۔

ایرانیوں کے متعلق جن خیالات کا اظہار حسین کاظم، ابن حزم اور ان کے علاوہ اور بہت سے دوسرے مورخین نے کیا ہے اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ اس جذبے میں ہر ایرانی مسلمان شریک تھا اس لئے کہ ایران کی سرزمین نے جہاں اس قسم کے لوگوں کو پیدا کیا وہاں بہت سے سچے مسلمان بھی ہوئے تھے جن کی شہادت تاریخ، علم اخلاق، تصوف وغیرہ کی کتابوں کے صفحات دے رہے ہیں۔

اور ابو مسلم کی کیا دفطرت کی فریب کاری کا ثمرہ تھی۔ یہ لوگ اپنی خاص اور ایرانی حکومت تصور کرتے تھے۔

"اگرچہ خلفائے عباسی از اولاد حضرت علی ابن ابی طالب کہ ایرانیان می خواستند نبودند ولے باز بہتر از بنو امیہ بودند چوں بدستیاری ایرانیاں ودیا مردی ابو مسلم خراسانی بمقام خلافت رسیدند سلطنت شان یک سلطنت ایرانی شمردہ می شود۔"

ان کا شاید یہ گمان تھا کہ رفتہ رفتہ اثر و اقتدار بڑھا کر اس کی حکومت کو خالص ایرانی حکومت بنالیں گے۔ لیکن خلیفہ ابو منصور کی بروقت بیداری اور اس سلسلے میں ابو مسلم خراسانی کے قتل نے ایرانیوں کو چوکنا کر دیا۔ ان کو دھندلا سا نظر آیا کہ شاید ان کی آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔

"ولے ایں انقلاب ہنوز برائے اعادۂ استقلال سیاسی وحقیقی ایران کافی نبودہ نبی امیہ واستقرائے عباسیان بہ مسند خلافت رفع عطش از تشنگان زلال آزادی ایرانی نمی بود چنانچہ امیدے کہ ایرانیاں بداں خاندان بستہ بودند بطور دلخواہ حاصل نہ شد۔"

اس لئے اب یہ پہلا موقعہ تھا کہ عباسیوں کے خلاف بھی ان کی پہلی جیسی سازشیں شروع ہوئیں، لیکن سازشی تدبیروں کے علاوہ ابو مسلم کے ہمراہیوں میں سے فیروز نامی مجوسی نے جو سنباد کے نام سے مشہور ہے باغی ہوا اور ابو مسلم کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے سے اس سلطنت کے شیرازہ کو بکھیرنے کی تدبیر کی۔

"سنباد مجوسی کہ دوست وطرفدار او بود، ہواخواہان زیاد بزوری دور خود جمع کردہ ابتدار بشہر قومیش ورے راکہ ابو مسلم خزاین زیاد دریں شہرا خری گذاشتہ بود تصرف نمودہ وآں خزاین را برداشت واعلان کرد کہ خیال دارد کہ بر حجاز حملہ برد وکعبہ را خراب بکند۔"

رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی کارروائی جاری رکھی، یہاں تک کہ خلیفہ ہارون الرشید کا زمانہ آگیا۔ اس زمانے میں خاندان برامکہ نے جو اثر و اقتدار اپنا حاصل کر لیا تھا اس سے ان کی یہ توقع بیجا نہ تھی کہ اب حکومت آسانی کے ساتھ ایرانی حکومت میں تبدیل ہو سکتی ہے، مگر یکایک ہارون چونکا اور خاندان برامکہ کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا۔ برامکہ کی تباہی جن اسباب کے ماتحت

ہوئی وہ دراصل یہی سبب تھا، چنانچہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی لکھتے ہیں کہ

"خالد بن برمک ابو مسلم خراسانی کا خاص معتمد تھا۔ یہ لوگ ایرانی سلطنت قائم کرنے کے بیحد آرزومند تھے، خالد بن برمک نے ابومسلم کے قتل کے بعد کسی اپنے طرز عمل سے اپنی ناراضگی کا اظہار ہونے نہ دیا، تیاری ہو چکی تھی اور سلطنت عباسیہ کا تختہ الٹ جانے کی سازش مکمل کر چکے تھے۔ اس سازش میں علوی ان کے شریک تھے۔ برامکہ کی یہ تیاریاں ابومسلم کے خون کا بدلہ لینے اور ایرانی سلطنت قائم کرنے کے لئے تھیں۔ انھوں نے ایک طرف علویوں اور خارجیوں کو اپنے ساتھ شامل کرلیا تھا اور دوسری طرف علماء، فقہاء، اور صوفیاء کو بھی زر پاشی سے اپنا ہواخواہ بنالیا تھا۔"

اس واقعے سے ایرانیوں کی آنکھیں کھل گئیں اور یہاں پہنچ کر ان کو صاف صاف معلوم ہوگیا کہ کچھ بھی ہو آخر تو خلفاء مسلمان ہیں اور ان پر عربوں کا کافی اثر ہے لیکن اس کے باوجود ان کی ہمتیں پست نہیں ہوئی تھیں وہ برابر اس دھن میں لگے رہے۔ خلیفہ مامون کی ماں ایرانی تھی، سلطنت بھی ایک ایرانی وزیر فضل نامی جس کا باپ مجوسی تھا کی کوششوں سے حاصل ہوئی تھی اس لئے قدرتاً مامون ایرانیوں کا ہواخواہ تھا۔ اسی وجہ سے پھر وہ ایرانی اقتدار جس کو ہارون نے ختم کر دیا تھا اس دور میں حاصل ہوگیا۔ اس کے علاوہ خیالات اور عقائد میں جو آزادی اس زمانے میں لوگوں کو حاصل تھی کسی زمانے میں بھی ایسی بے راہ روی نہ تھی، فارسی، یونانی اور سریانی وغیرہ زبانوں کی بہت سے فلسفیانہ کتابوں کے ترجمے نے اس بے راہ روی میں اور اضافہ کر دیا تھا، ایرانیوں نے اس موقعہ کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ جھٹ ایک بڑے گروہ نے اسماعیل اور ان کی اولاد کا ہواخواہ بن کر ان کے لئے دعوت خلافت شروع کر دی۔ پروفیسر سلطان بک محمد کے وہ خطبات جو وقتاً فوقتاً جامعہ مصریہ کے طلبہ کے سامنے صاحب موصوف نے دئے ہیں "الفلسفۃ العربیہ والاخلاق" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوگئے ہیں، اس میں ایک چھوٹا سا خطبہ اس جماعت پر بھی موجود ہے، چنانچہ وہ یہ کہنے کے بعد کہ فارسیوں کا یہ تقاضی

---

(۱) قول حق صفحہ ۵

مذہب تھا جو اسلامی سلطنت کے خلاف کوشش کر رہے تھے، کہتے ہیں کہ

"...... مامون[1] کا میلان شیعیت کی طرف زیادہ تھا، اس کے زمانے میں فارسی یونانی اور سریانی زبانوں کی فلسفیانہ کتابیں عربی زبان میں بہت سی منتقل ہوئیں، لوگوں نے کثرت سے اس کی طرف دلچسپی کا اظہار کیا، پھر ہر شخص کو مذہب وغیرہ کے متعلق خیالات کے اظہار میں عام آزادی مل گئی، فارسیوں کو یہ موقعہ غنیمت معلوم ہوا، اس لئے وہ اسماعیلیت کی طرف بڑھے اور یہ اس وجہ سے کہ لوگوں کا رجحان آل علی کی طرف زیادہ تھا۔"

اس قدر لکھنے کے بعد یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اسمٰعیلی جماعت کا تذکرہ کیا جائے جس میں یہ لوگ آکر شریک ہوئے، اسماعیلیہ پہلے ایک سیاسی اور پھر بعد میں ایک مذہبی جماعت تھی، جو بنو عباس کے دور حکومت میں پیدا ہوئی اور وہ اس طرح پر کہ جہاں مسلمان بوجوہ بہت سے عقائد اور خیالات کے مختلف فرقوں اور جماعتوں میں منقسم ہو گئے، سیاسی حیثیت سے بھی دو بڑی شاخوں میں بٹ گئے، ان میں سے ایک گروہ اہل سنت والجماعت کا ہے اور دوسرا شیعہ، اہل سنت والجماعت سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جن کا اعتقاد اس مسئلہ خاص یعنی خلافت و امامت میں یہ ہے کہ خلفاء اربعہ جس ترتیب سے خلیفہ ہوئے ٹھیک اسی ترتیب سے ان کو حق خلافت حاصل تھا۔ لیکن شیعہ جن کا عقیدہ بالکل اس کے برعکس یہ ہے کہ خلافت کے اصل حقدار حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ عام مسلمانوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا کر ان کے حق میں دست اندازی کی۔ شروع شروع میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جمہور اہل اسلام کا ابو بکرؓ کی بیعت پر متفق ہو جانے کے بعد کسی کی ہمت یہ نہ تھی کہ ان کی خلافت اور اسی طرح حضرت عمرؓ کی خلافت سے انکار کرتے لیکن حضرت عثمان کی خلافت کے ساتویں سال ۳۰ھ میں خلیفہ موصوف کی نرم مزاجی سے یہ تحریک عملاً شروع ہوئی کہ علیؓ اور ان کے خاندان میں خلافت محدود ہو، چنانچہ اسی تحریک

---

(۱) الفلسفۃ العربیہ والاخلاق صفحہ ۱۲۹

کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت عثمان رض کی شہادت ہوئی اور بالآخر حضرت علی رض خلیفہ منتخب ہو گئے گو اس جماعت کا مقصد حاصل ہو گیا تھا مگر اس کو کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ حضرت علی رض کو بصرہ، نہروان اور صفین کی لڑائیاں لڑنی پڑیں اور آخر کار ایک خارجی نے شہید کر دیا اور معاویہ ابن ابی سفیان کے ہاتھ پر شام، حجاز، یمن اور مصر کے لوگوں نے بیعت کر لی، صرف ایک کوفہ رہ گیا تھا جس نے ان کی بیعت نہیں کی تھی، ان لوگوں نے حضرت علی رض کی شہادت کے بعد امام حسن رض حضرت علی کے صاحبزادے کو خلیفہ بنایا۔ امیر معاویہ نے عراق پر حملہ کیا اور چند دن کے بعد آخر کار امام حسین خلافت سے دست بردار ہو گئے امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی خلافت اپنی ہی زندگی میں تسلیم کرانی چاہی، کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی، چنانچہ عبداللہ بن زبیر نے مکہ میں اپنی خلافت لوگوں سے منوانی چاہی اور کوفہ والوں نے امام حسین کو خلیفہ بنانا چاہا اور اسی سلسلے میں ان کی شہادت کا دردناک واقعہ پیش آیا، یزید کے انتقال کے بعد عبداللہ بن زبیر کا حلقۂ اطاعت بہت وسیع ہو چکا تھا اور دوسری طرف بنو امیہ کی اولاد تھی، ان دونوں گروہوں میں خوب خوب جنگ ہوئی اور آخر میں امیہ کا خاندان غالب آگیا اور ایک عرصے تک ان کی خلافت اور حکومت رہی، ظاہر ہے کہ جو لوگ حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر رض جیسے جلیل القدر مستدین صحابہ کو غاصب خلافت ٹھہرا سکتے تھے، بنو امیہ کا خاندان ان بزرگوں کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا تھا، اور پھر اس وقت جب بجائے اللہ کے حکومت کا دور دورہ ہو۔

لیکن اس دور حکومت میں بھی شیعہ دو بڑی شاخوں میں منقسم ہو گئے ایک زیدیہ اور دوسرے کیسانیہ۔ اول الذکر خلافت و امامت کو اس جماعت میں دیکھنا چاہتی تھی جو حضرت فاطمہ کی اولاد سے ہوں، اور موخر الذکر نے محمد بن حنفیہ (حضرت علی رض کے بڑے لڑکے) کے سلسلہ کو اپنا پیشوا اور مقتدا بنایا تھا۔ زیدیوں کے موجودہ امام زید بن علی بن حسین تھے اور کیسانیہ کے ابو ہاشم عبداللہ بن محمد بن حنفیہ بن علی بن ابی طالب تھے۔ ان دونوں جماعتوں نے عباسی داعیوں کے ساتھ مل کر کام شروع کیا، جو راہ عمل اختیار کی تھی وہ یہ تھی کہ بظاہر امویوں کی خلافت تسلیم

کرتے اور خفیہ طور پر جس کو اپنا ہمدرد سمجھتے بیعت لیتے، اور راز کے پوشیدہ رکھنے کی تاکید فرماتے۔
اس کے علاوہ آپس کے تصادم سے بچنے کے لئے بہتر طریقہ یہ اختیار کر رکھا تھا کہ بجائے امام
زین العابدین، محمد بن حنفیہ یا حضرت عباس کے نام پر بیعت لینے کے صرف اہل بیت کا لفظ استعمال
کرتے، عباسی داعیوں کی یہ ایک چال تھی کہ اپنے کو ہمیشہ خود خلافت کی آرزو سے الگ اور ان کا
محض معاون ہی ثابت کرتے رہے، لیکن جب کامیابی کا موقعہ ابو مسلم کی کوششوں نے پیدا کر دیا۔
تو قدیم معاہدے کے خلاف اپنی حکومت قائم کر لی جس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ علویہ کی وہ جماعتیں جس
طرح بنو امیہ کے مٹانے کے درپے تھیں عباسیہ کی فکر میں ہوگئیں چنانچہ پھر وہ اگلی سی کوششیں ان
کے خلاف جاری تھیں۔ اسماعیلیہ جن سے ان ایرانیوں کا تعلق بتایا گیا ہے وہ اسی دور حکومت
میں شیعوں کی ایک تیسری جماعت امامیہ کی ایک مشہور شاخ کے نام سے ظاہر ہوئی، امامیہ کا
عقیدہ یہ ہے کہ خلافت کے مستحق در اصل حضرت علی، پھر حسن، پھر حسین، پھر زین العابدین، پھر محمد باقر
اور پھر ان کے بیٹے جعفر صادق ہیں، جعفر صادق کے بعد دو جماعتیں پیدا ہوگئیں۔ ایک نے خلافت
کو موسیٰ کاظم کی نسل سے بتایا اور دوسری نے اسمٰعیل کی اور اسماعیلیہ کہلائے۔ جس طرح شیعوں
کی اور دوسری جماعتیں خلافت کے لئے کوشاں تھیں اسمٰعیلی اس معاملے میں سرگرم رکن نہ تھے۔
صرف اپنے عقیدے کے مطابق امام کی موجودگی کا یقین رکھتے تھے اور ان کے لئے بیعت لیتے
پھر رہے تھے، چنانچہ مبارک نجو محمد بن اسمٰعیل بن امام جعفر صادق کا غلام تھا۔ محمد بن اسمٰعیل
کی وفات کے بعد کوفے میں جاکر کوفے کے شیعوں کو مذہب اسمٰعیلی اختیار کرنے کی ترغیب دی۔
اور اسی طرح بعض اسماعیلیوں کا خفیہ طور پر شمالی افریقہ کے علاقوں میں اسی زمانے میں دعوت امامت
کا پتہ چلتا ہے، اگرچہ شیعوں کے عام عقیدے کے مطابق امام وقت اللہ کی طرف سے مخلوق پر حجت
ہوتا ہے اور اس کا وجود تبلیغ شریعت کے لئے ضروری ہے۔ کسی ایسے امام کا ظہور اسمٰعیل کی اولاد
میں نہیں ہوا مگر انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ امام کا ظہور ضروری نہیں بلکہ کبھی کبھی وہ مستور ہوا کرتا ہے
اور لوگوں کو ان کے حال سے آگاہی نہیں ہوتی ہے مگر ایسی حالت میں یہ لازم ہے کہ ان کا نائب

ظاہر ہو جو خلق اللہ پر حجت ہو اور دعوت و تبلیغ کے منصب پر قائم ہو۔

ایرانیوں کا اس تعلق کی خاطر جو انھوں نے اسماعیلیوں سے قائم کیا تھا ان کا تذکرہ کرنا ضروری تھا، اس لئے کہ یہ تعلق نہ صرف ابتدائی زمانے ہی میں ظاہر کیا گیا بلکہ تا انقراض دولت عباسیہ ہمیشہ یکساں طور پر باقی رکھا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ ساری وہ کامیابیاں جن کا ذکر آگے آئے گا اسی بنا پر ان کو حاصل ہوئیں، اس لئے قصداً ان واقعات کے بتانے میں ذرا تفصیل سے کام لیا گیا تاکہ جہاں یہ معلوم ہو سکے کہ یہ اسماعیلی کون تھے اور ان کا ظہور کن اسباب کے ماتحت ہوا، اس بات کے اندازہ کرنے میں بھی سہولت ہو کہ اس جماعت کے ساتھ شامل ہونے سے ان کا کیا فائدہ متصور ہو سکتا تھا۔ حالات اور واقعات کی بنا پر یہ نتیجہ نہایت آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس اسماعیلی جماعت کی طرف اپنے کو منسوب کرنے میں ان کا بظاہر منشا یہی تھا کہ جس طرح دوسری شیعی جماعتیں زیدیہ اور کیسانیہ دولت عباسیہ کے خلاف اپنی خلافت قائم کرنے اور عباسی حکومت کو مٹانے کے درپے تھیں، اسماعیلیوں کا بھی دراصل وہی منشا تھا اور اس پردے کی آڑ میں کچھ اور یہی مقصود تھا کہ ان کے مقابل لا کر کھڑا کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اخوان الصفا

اس وقت کے بہت سے علمائے جن کی ذہنیت کو یونانی فلسفہ اور منطق نے مسخ کر دیا تھا ایسے رسائل لکھے جن کا مقصود اگرچہ یہ نہ تھا کہ اس قسم کے لوگوں کی تائید کی جائے مگر باعتبار نتائج ایسا ضرور ہوا کہ انھوں نے اپنے ان خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بنایا جو حصول مقصد میں معین ہو سکتے تھے۔ یہ رسائل اخوان الصفا کے نام سے مشہور ہیں اور یہ چار جلدوں میں ہیں۔ یہاں ایک آدھ مقام سے اس کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے، تاکہ یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے کہ ان رسائل سے ان کی تائید کیسے ہوتی تھی۔ ان اسماعیلیوں کی سب سے پہلی اور بنیادی چیز یہ تھی (جیسا کہ آئندہ بتایا جائے گا) کہ لوگوں کو یقین دلایا جائے کہ قرآن اور جملہ احکام الٰہی اپنے ظاہری اور باطنی معنی کے اعتبار سے دو الگ الگ چیزیں ہیں، لوگوں نے ظاہری احکام پر عمل کر کے سخت غلطی کی ہے، اسی خیال کو اخوان الصفا

کی چوتھی جلد چھٹے رسالے میں ناموس الٰہی کی ماہیت اور نبوت کے شرائط کے تحت لکھا گیا ہے ۔

"تمام آسمانی کتابیں(۱) اپنے مفہوم اور معنی کے اعتبار سے دو معنی ہیں ایک تو وہ معنیٰ ہیں جو اس کے ظاہری الفاظ دلالت کرتے ہیں، دوسرے وہ حقیقی معنی جو کہ لفظ کی تہہ میں پوشیدہ ہیں، اس بنا پر ہر شرعی احکام کے دو پہلو ہیں ایک اس کا ظاہر اور دوسرا اس کا باطن جو لوگ ظاہری احکام کے پابند ہوتے ہیں وہ دنیاوی حیثیت سے بیشک کامیاب ہیں لیکن اصلی اور آخری کامیابی ان لوگوں کے حصے میں ہے جو اس کے مخفی معنی سے واقف اور اس کو اپنا عملی شعار بناتے ہیں.....

خدائی قانون کی غرض اصلی یہی ہے کہ لوگ اسرار سے واقف اور اس پر عامل ہوں جو لوگ ان اسرار سے واقف ہونے کے باوجود کوئی جدوجہد بھی اس سلسلے میں نہیں کرتے تو ان کا حشر مرنے کے بعد یہ ہوگا کہ عام بہائم اور ان کے رتبے میں کوئی فرق نہ ہوگا"

رسالہ بعثت میں عام مسلمانوں کے اس اعتقاد سے کہ ہم اپنے اسی جسم سے قیامت کے دن دوبارہ اٹھیں گے انکار کیا ہے جس کو اسماعیلیوں نے نفی قیامت کا پہلا زینہ قرار دیا ہے۔

یہ اسماعیلی دولت عباسیہ کے خلاف پروپیگنڈا کرتے پھرتے تھے اور یہ یقین عوام کو دلا رہے تھے کہ اب خدا کا وعدہ پورا ہونے والا ہے ، حکومت اور خلافت ہمارے خاندان میں بہت جلد منتقل ہوگی۔ اس چیز کی تائید ایک دوسرے رسالے "الدعوۃ الی اللہ" سے ہوتی ہے۔

"ملک(۲) اور دولت ہر زمانے اور ہر دور میں ایک خاندان سے دوسرے خاندان ایک قوم سے دوسری قوم، ایک ملک والوں سے دوسرے ملک والوں میں تبدیل ہوتی رہتی ہے، اس لئے اب یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اچھی حکومت اور دولت جو اب شروع ہونے والی ہے اور جس حکومت کے کل وزرا اچھی قوم کے اچھے افراد ہوں گے، اس کوشش کے لئے یہ

---

(۱) اخوان الصفا جلد چہارم صفحہ ۱۹۰ - ۱۸۹

(۲) اخوان الصفا جلد چہارم صفحہ ۲۲۳

ملے پایا ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ کسی مخصوص مقام پر جمع ہوں ایک رائے اور طریقے پر متفق ہونے کے بعد یہ عہد کریں کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے معاون اور مددگار رہو نگے، ان کے تمام افراد کی مجموعی حیثیت تمام امور میں صرف شخص واحد کی اور تمام تدابیر میں صرف ایک نفس منفرد کی ہوگی اور یہ معاملہ دین کی مدد اور آخرت کی طلب کا ہو۔ اس لئے صرف (خدا کی رحمت کے طلبگار ہوں گے۔)

بھائیو! اس اچھی خبر سے خوش ہو، اللہ کی مدد پر اعتماد کرو جس نے ہر کوشش کرنے والے کو اس کی کوشش کا پھل دینے کا وعدہ کیا ہے۔ والذین جاہدو منہا لنہدینہم سبلنا ولیصرن اللہ من ینصرہ اوان حزب اللہ ہم الغالبون "

بہت سے عقائد اور خیالات جو ان اسماعیلیوں کے تھے بالکل ملتے جلتے ہوئے اکثر رسائل میں موجود ہیں جو یہاں صرف مضمون کے زیادہ بڑھ جانے کے خوف سے چھوڑے جاتے ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں اخوان الصفا کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

"چوتھی صدی ہجری کے آخر نصف میں ایک شیعی مذہبی اور سیاسی جماعت تھی جس کے عقائد اور خیالات اسماعیلی فرقے سے ملتے جلتے تھے۔ اس کا مرکز بصرہ تھا اس کے اراکین اپنے آپ کو صافی اور مومن کہتے اس لئے کہ اس کا مقصد اپنی روح کی نجات باہمی اعانت اور مدد سے حاصل کرنا تھا، اس جماعت کا نام اخوان الصفا رکھا۔ ان کے سیاسی کارناموں کے متعلق بہت کم معلومات ہیں، سوائے ان کے رسائل کے جو بہت مبہم زبان میں ہوتے تھے۔"

افغانوں کا سیاسی عروج وزوال

افغانوں کا نسب | تاریخ اسلام میں افغان ایک عجیب وغریب قوم ہے جس کے سلسلہ نسب کے متعلق مشرقی اور مغربی مورخین میں سخت اختلاف ہے، افغانوں کی نسبی تحقیق و تدقیق کے متعلق محققین نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ لیکن جب ان کی تحقیقات پر غور کیا جاتا ہے تو ان میں بہت تباین پایا جاتا ہے۔

بعض مغربی مورخین کا خیال ہے کہ بعض قبائل افغان اُن سپاہیوں کی اولاد سے ہیں جو سکندر اعظم کے ساتھ آئے تھے اور فتح کے بعد افغانستان کے پہاڑوں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ایک دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ افغان قوم اُن نوآبادلوگوں کی نسل سے ہے جو سکندر اعظم کے جانشینوں کے عہد میں یونان سے ہجرت کرکے افغانستان میں آکر آباد ہو گئے تھے۔

مشرقی مورخین کا ایک بڑا گروہ اس بات پر متفق ہے کہ افغان قوم کا سلسلہ نسب بنی اسرائیل سے ملتا ہے یعنی افغان سامی النسل ہیں۔

"دی افغانز" کتاب کے مصنف کا خیال ہے کہ افغان قوم کا سلسلہ نسب البانیوں سے ملتا ہے اور یہ لوگ البانی النسل ہیں۔ مصنف موصوف نے اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ وہ البانی قبائل جو سواحل بحر اسود اور بحر متوسط پر سکونت پذیر تھے اور جو آئے دن شاہان ایران کو پریشان کرتے رہتے تھے وہ "اغوان یا اوغان" کے نام سے مشہور تھے۔ شاہان ایران ان لوگوں کو وقتاً فوقتاً بحر اسود اور بحر متوسط کے سواحل سے جلاوطن کرکے افغانستان میں لالا کر بساتے تھے۔ چنانچہ اس مورخ کے خیال کے مطابق افغانی البانی النسل ہیں۔

خود افغان مورخین اپنے آپ کو یہودی النسل کہتے ہیں اور اپنے آباؤ اجداد کے وسط ایشیا میں آنے کا حال اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ افغانہ جس کے نام سے افغانوں کو منسوب کیا جاتا ہے حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے ایک شخص تھا۔ بخت نصر نے یہودیوں کو قید کرکے کوہستان غور میں

بھیج دیا تھا، جہاں ان کی نسل پھلی پھولی اور بڑھی۔ اگرچہ یہ لوگ ارض مقدس سے دور جلاوطن کر کے بھیج دیے گئے تھے تاہم ان لوگوں کا مذہب ظہور اسلام تک یہودی مذہب تھا اور اس وقت تک یہ اپنے مذہب پر قائم تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بعض لوگ ارض مقدس میں آکر اپنے مذہبی جذبات تازہ کر کے واپس جاتے اور اپنے ہموطنوں کو یہودیت پر قائم رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے ان لوگوں کے اسلام لانے کے متعلق یوں مشہور ہے کہ ایک یہودی خالد نامی آنحضرت کی خدمت میں آکر مشرف باسلام ہوا اور افغانستان میں اپنے بھائی بندوں کو اسلام کا پیغام پہنچایا۔ رفتہ رفتہ جب تمام افغانوں نے اسلام قبول کر لیا تو خالد نے چند افغانی سرداروں کو خدمت نبوی میں حاضر کیا۔ ان لوگوں نے خدمت نبوی میں اپنا سلسلہ نسب بیان کیا اور کہا کہ ہم لوگ حضرت ابراہیم کی نسل سے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے ان لوگوں کے ساتھ بہت مہربانی کا سلوک فرمایا۔ انھیں افغانی سرداروں میں سے ایک سردار قیس نامی تھا آنحضرت نے اس کا نام عبدالرشید رکھا۔ افغانی مورخین میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ افغانی سردار خدمت نبوی میں رہ کر بعض غزوات میں ہمرکابی کے شرف سے بھی مشرف ہوئے تھے لیکن یہ واقعہ بعید از قیاس ہے کیونکہ سیرت کی کتابوں میں اس واقعہ کا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔ ہاں البتہ افغانوں کے اسلام لانے کے متعلق ایک دوسری روایت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے جو ایک افغانی مورخ اس طریقے پر بیان کرتا ہے کہ لفظ افغان عربی لفظ ہے جو اصل میں عبرانی سے مشتق ہے ملک طالوت جو یہودیوں کا سردار تھا اس کے ایک لڑکے کا نام افغان تھا جس کے نام سے اس کی نسل افغان مشہور ہوئی۔ یہودیوں میں آپس میں ایک عرصہ دراز تک خانہ جنگی ہوئی اور بخت نصر کے حملہ بیت المقدس تک جاری رہی۔ بخت نصر نے ستر ہزار سے زیادہ یہودیوں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ ان میں سے جو لوگ باقی رہ گئے تھے وہ بیت المقدس سے بھاگ کر ایک عرصہ تک عرب میں سکونت پذیر رہے لیکن معاش کی قلت نے ان کو مجبور کیا کہ وہ ایشیا کے کسی سرسبز حصے میں جا کر آباد ہوں۔ چنانچہ انھوں نے کوہستان سلیمان کو پسند کر کے وہیں سکونت اختیار کی۔ باقی ماندہ افغان خلیفہ اول کے عہد میں مشرف باسلام ہوئے اور ایران میں جا کر آباد ہو گئے۔ یہ لوگ چنگیزی

حملہ تک ایران میں رہے اس کے بعد چنگیزی مظالم کی تاب نہ لاکر کوہ سلیمان میں ہجرت کر کے اپنے بھائی بندوں کے ساتھ اقامت پذیر ہو گئے۔

افغان قوم مختلف قبائل اور جرگون میں منقسم ہے۔ تمام افغانی قبیلوں کا دعویٰ ہے کہ یہ لوگ ملک طالوت کی نسل سے ہیں۔ افغانوں کی قومی خصوصیت آزادی۔ مہماں نوازی۔ اور شجاعت ہے۔ افغان سنی المذہب ہیں اور بعض شیعہ مذہب بھی رکھتے ہیں۔ لیکن کثرت سنیوں کی ہے۔ افغانوں کی قومی زبان پشتو ہے۔ جو افغانستان کے مختلف حصوں میں مختلف لب و لہجہ کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ قندھار کی پشتو ایران کے قرب کی وجہ سے نرم ہے برخلاف اس کے مشرقی افغانستان کی پشتو سخت لہجہ رکھتی ہے۔ فارسی زبان تمام ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ سرکاری دفاتر تمام کے تمام فارسی زبان میں ہیں۔ گویا افغانستان کی سرکاری زبان فارسی ہے۔

افغانستان | افغانستان فارسی کا ایک مرکب لفظ ہے جس نے "افغان" اور "ستان" سے ترکیب پائی ہے جس کے معنی ہوے افغانوں کا ملک یا افغان قوم کا مسکن۔ افغان اپنے ملک کو قلاجیت اور کابلستان بھی کہتے ہیں۔ افغانستان کے حدود اربعہ یہ ہیں شمال میں ترکستان۔ مشرق میں پنجاب۔ جنوب میں بلوچستان اور مغرب میں خراسان۔

افغانستان کا رقبہ دو لاکھ پندرہ ہزار مربع میل سے بھی زیادہ ہے۔ باشندوں کی تعداد دس ملین کے لگ بھگ ہے۔ افغانستان کے مشہور شہر یہ ہیں۔ کابل۔ غزنی۔ قندھار۔ ہرات اور جلال آباد۔ ہرات اپنے موقع و محل کی وجہ سے مغربی ایشیا اور وسطی ایشیا کا تجارتی مرکز ہے جس کی وجہ سے ایک عرصہ تک روس اور برطانیہ کی استعماریت کا مرکز توجہ بنا رہا۔

افغانستان، ایران کی سطح مرتفع کا سب سے بلند حصہ ہے۔ جس کی بلندی چار ہزار فیٹ سے لیکر سات ہزار فیٹ تک ہے۔ افغانستان کا شمالی پہاڑ یعنی کوہستان ہندوکش بیس ہزار فیٹ بلند ہے۔ اور مشرق میں کوہ سلیمان ہے جس کی چوٹیاں سات ہزار فیٹ سے

سے کر گیارہ ہزار فیٹ تک بلند ہیں۔ کوہستان ہندوکش کی مغربی شاخیں یہ ہیں۔ کوہ بابا کوہ سفید۔ اور کوہ سیاہ۔ ان سلسلوں کے شمال میں افغانی ترکستان واقع ہے۔ افغانی اور روسی ترکستان کے درمیان حد فاصل دریائے جیحوں قائم کرتا ہے۔

افغانستان ناہموار سطح کا ملک ہے۔ بلند پہاڑیوں۔ عریض و عمیق میدانوں اور ندیوں کی تنگ گھاٹیوں اور دروں سے ترکیب پاتا ہے۔ افغانستان کے میدانوں میں کثرت سے باغات ہیں جن میں انگور، سیب، شفتالو، امرود، بہی، انار۔ بادام اور پستہ بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ جو افغانی باشندوں کی ضروریات کو پورا کرکے ہندوستان کے بازاروں میں بھی خشک و تر بکثرت آتا ہے۔ افغانستان کے اونچے اونچے پہاڑوں میں جو گھنے جنگلات سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ کفتار۔ لومڑی اور بعض حصوں میں شیر اور چیتا بھی پایا جاتا ہے۔ پالتو جانوروں میں ایک قسم کی ایرانی بکری ہوتی ہے۔ جو اپنے لمبے بالوں کی وجہ سے کافی شہرت رکھتی ہے گائے، بھینس، گھوڑا، گدھا، خچر بکثرت پائے جاتے ہیں۔ افغانستان میں وہ تمام پرندے ملتے ہیں جو ایشیا کے دوسرے حصوں میں ہیں۔ قدرت نے افغانستان کو بکثرت معدنیات عطا کی ہیں۔ لیکن ابھی تک صرف چند معدنیات نکالی گئی ہیں مثلاً شورہ، گندھک، نمک، رانگا اور لوہا۔ افغانستان کا لوہا اپنی خصوصیات میں دنیا کے کسی حصہ کے لوہے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

افغانستان میں دریا بہت کم ہیں۔ سب سے بڑے دریا صرف دو ہیں رود ہلمند اور دریائے کابل۔ یہ دونوں دریا کوہ ہندوکش سے نکلتے ہیں۔ چند چھوٹی چھوٹی ندیاں بھی ہیں جن کا تذکرہ باعث طوالت ہوگا۔

افغانی حکمران خاندان | عہد بنو امیہ اور بنو عباس میں افغانستان اموی اور عباسی گورنروں کی ماتحت رہا۔ عباسی خلافت کے زوال کے بعد جب طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا تو افغانستان پر خراسان کے گورنر اسمٰعیل سامانی نے قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد الپتگین حاکم افغانستان ہوا

اس کے بعد سبکتگین اس کے بعد محمود کا دور شروع ہوتا ہے۔ جس کی تلوار ایک طرف تو وسط ایشیا میں چمکی اور دوسری طرف ہندوستان میں بے نیام ہوئی۔ دولت غزنویہ کے عہد حکومت میں افغانستان اپنی قومی حکومت قائم نہیں کر سکے۔

غوری خاندان | دولت غزنویہ کی تباہی کے بعد کوہستان غور میں غوریوں نے ایک حکومت قائم کی جس کو مورخ پہلی افغانی حکومت کہتے ہیں۔ یہ دولت غوریہ وہ ہی ہے جس کے حکمرانوں میں شہاب الدین غوری بھی تھا جو ہندوستان کا مشہور فاتح اور سرزمین ہند میں اسلامی حکومت کا بانی ہے۔ یہ خاندان چنگیزی حملہ تک افغانستان میں نہایت شاندار طریقہ پر حکومت کرتا رہا۔ چنگیزی حملہ کے بعد افغانی قوم اپنے وطن میں ایک عرصہ دراز تک کوئی حکومت قائم نہ کر سکی کیونکہ مغلوں کے پے درپے حملوں نے ایشیا کی سیاست میں ایک طوفان عظیم پیدا کر دیا تھا۔

لودھی خاندان | ہندوستان میں تغلق خاندان کی تباہی کے بعد طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوگیا۔ جس سے فائدہ اٹھا کر بہلول نامی ایک لودہی سردار نے دہلی پر قبضہ کر لیا لیکن طوائف الملوکی کی گرم بازاری اس کے زمانہ میں بھی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افغانی حکومت صرف دہلی ہی تک محدود رہی۔ البتہ سکندر لودھی کے زمانہ میں سلطنت لودھی نے کافی وسعت حاصل کر لی تھی۔ سکندر بڑا عالم اور انصاف پسند حکمران تھا۔ ہمیشہ رعایا کی بہبودی کیلئے کوشاں رہتا تھا۔

سکندر لودہی کے بعد اس کے جانشینوں میں وہ قابلیت نہ تھی جو ہندوستان کے ایک حکمران میں ہونی چاہیئے۔ خود لودہی سرداروں میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ دولت خاں لودہی پنجاب کا گورنر تھا۔ اس نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور بابر نے اس کی دعوت پر ہندوستان پر حملہ کیا۔ بابر اور ابراہیم لودہی کی فوجوں کا پانی پت کے مشہور میدان میں مقابلہ ہوا۔ ابراھیم لودہی کو شکست فاش ہوئی اور وہ مارا گیا۔ یہ واقعہ ۱۵۲۶ء کا ہے۔

سوری خاندان | تیرہ چودہ سال تک افغان اپنی کوئی سلطنت قائم نہیں کرسکے اس کی وجہ یہ تھی کہ بابر کی فوجی طاقت بہت زیادہ تھی اور افغان اس کے مقابلہ میں کمزور تھے۔ بابر نے ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کو توسیع دینے کی سر توڑ کوشش کی جس سے ہندوستان کے مختلف صوبے مرکز یعنی حکومت آگرہ سے ملحق ہوگئے۔ بابر کے انتقال کے بعد ہمایوں نے بھی سلطنت کی توسیع و ترقی کی بے حد کوشش کی گجرات و مالوہ فتح کرکے مرکز کے ماتحت لایا۔ اور اس کے بعد چاہتا تھا کہ بنگال اور بہار کو بھی اپنی سلطنت کے ساتھ ملحق کرے۔ چنانچہ گجرات سے واپسی کے بعد اس نے بنگال و بہار کا رخ کیا بہار میں اس زمانے میں افغانی حکومت تھی جس کا بادشاہ ایک نابالغ شہزادہ جلال خان نامی تھا۔ حکومت کا نظم و نسق اس کی ماں اپنے ہاتھ میں رکھتی تھی۔

اس زمانہ میں ایک نوجوان افغان جو اپنی شجاعت اور علمی تبحر کی وجہ سے شہرت تامہ رکھتا تھا۔ میدان سیاست میں نمودار ہوا۔ یہ نوجوان ایک نووارد افغانی سردار کا بیٹا تھا جس کی جاگیر سہسرام میں تھی۔ عنفوان شباب میں اپنے باپ سے خفا ہوکر جونپور چلا گیا۔ جہاں اس نے فارسی ادب اور تاریخ کا بہت محنت سے مطالعہ کیا اس نے مذکورہ بالا دونوں فنوں میں زبردست قابلیت حاصل کرلی تھی۔ تاریخ ہند اس نوجوان کو شیر خان کے نام سے یاد کرتی ہے۔ شیر خان مختلف اوقات میں مختلف بادشاہوں کی خدمتیں ادا کرتا رہا۔ کبھی لودھی حکومت میں فوجی خدمت ادا کی کبھی ہمایوں کے دربار میں رہا اور ستارہ اقبال چمکا تو بہار کی افغانی حکومت میں سیاہ و سفید کا مالک ہوگیا۔ شیر خان جلال خان نابالغ بادشاہ بہار کی ماں پر اس قدر اثر رکھتا تھا کہ وہ اپنے مرتے وقت حکومت بہار کا تمام نظم و نسق شیر خان کے سپرد کرگئی۔ چنانچہ اب شیر خان اور جلال خان کے تعلقات کشیدہ ہوگئے۔ جلال خان نے اپنی امداد کے لئے حاکم بنگالہ کو درخواست بھیجی۔ اس نے شیر خان پر حملہ کردیا جس زمانے میں شیر خان اور حاکم بنگالہ کی فوجیں برسرپیکار تھیں ہمایوں کی فوجوں نے بہار کے قلعوں پر قبضہ کرکے بنگالہ کے قدیم دارالحکومت گور کو مسخر کرلیا۔

موسم باران کی وجہ سے دو تین ماہ تک ہمایوں مع اپنی فوج کے گور میں رہا۔ اس اثنا۔ میں شیر خاں بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوا۔ لیکن بعد میں میدانی علاقوں میں نکلکر بنارس اور جونپور پر قابض ہوگیا۔ اس طریقہ پر شیر خان نے ہمایون کا راستہ روک لیا اب ہمایوں کے لئے آگرہ سے کمک بھی نہیں آسکتی تھی۔ ہمایون نے مجبوراً برسات کی وجہ سے آگرہ واپس جانے کا ارادہ کرلیا۔ ہمایوں جب پٹنہ پہونچا تو اس کو یہ معلوم ہوا کہ شیر خان کی فوجیں راستہ روکے کھڑی ہیں۔ ہمایوں نے گنگا پار کرنے کے لئے کشتیوں کے پل تیار کرنے کا حکم دیا تاکہ دوسری طرف خیمہ زن ہوکر دشمن کا مقابلہ کرسکے اسی اثنا میں شیر خان کی طرف سے صلح کے لئے سلسلہ جنبانی ہوئی۔ چنانچہ ہمایوں نے اپنے کوچ کو ملتوی رکھا۔ لیکن درحقیقت یہ صلح ایک دھوکہ تھا۔ جس کے بعد شیر خان نے ہمایون پر شب خوں مارا۔

رات کے وقت شیر خانی فوجوں نے ہمایونی فوجوں پر بہت زور کا شب خوں مارا جس کی وجہ سے ہمایوں کو سخت شکست اٹھانی پڑی اور اس نے جان بچانے کی غرض سے مع اپنے ہمراہیوں کے دریا پار ہوکر بھاگنا چاہا لیکن اس کے بہت سے ساتھی غرق ہوگئے اور وہ خود بھی ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ اس جنگ کو تاریخ ہند میں جنگ بکسر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور یہ ۱۵۳۹ء کا واقعہ ہے۔

دوسرے سال ہمایوں نے شیر خان (جس نے اب شیر شاہ کا لقب اختیار کرلیا تھا) کی سرکوبی کے لئے از سر نو فوج تیار کی اور کوچ کیا۔ اس دفعہ شیر شاہی اور ہمایونی فوجوں کا مقابلہ دریائے گنگا پر قنوج کے قریب ہوا۔ ہمایوں کی فوج کے لئے بارش نے لشکرگاہ میں رہنا مشکل کردیا۔ اور بعض سرداروں نے عین وقت پر ہمایوں کو دغا دی۔ اس حالت میں شیر شاہی فوجیں ہمایونی فوجوں پر شدت سے حملہ آور ہوئیں۔ ہمایون کو پھر شکست ہوئی۔ افتاں وخیزاں آگرہ پہونچا شیر شاہی فوجیں برابر تعاقب کررہی تھیں۔ مزید براں آگرہ

میں ہمایوں کے بھائیوں کی ظاہری مخالفت بھی ہمایوں کیلئے دلشکنی کا باعث ہوئی۔
ان دو اسباب کی بنا پر ہمایوں نے بادل ناخواستہ ہندوستان کو خیر باد کہا۔
ہمایوں۔ پنجاب اور سندھ ہوتا ہوا ایران پہونچا۔ شاہ ایران نے اس کی بڑی خاطر و مدارات کی اور اپنا خاص مہمان بناکر رکھا یہ واقعات ۱۵۴۵ء کے ہیں۔ ہمایوں کے جانے کے بعد تقریباً تمام شمالی ہند شیر شاہ کے قبضہ میں آگیا۔ شیر شاہ نے مالوہ اور مارواڑ فتح کر کے اپنی حکومت کی توسیع کی پانچ سال تک حکومت کرنے کے بعد راہی ملک عدم ہوا۔

شیر شاہ کا سب سے بڑا کارنامہ ملکی زراعتی انتظامات ہیں جن کی وجہ سے اس کا نام تاریخ ہند میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اور اسی چیز نے مورخین کے اس نظریہ کو بالکل باطل کر دیا کہ افغان حکومت کرنا نہیں جانتے۔ لیکن ایک فاتح یا بہترین سپاہی بن سکتے ہیں۔ شیر شاہ کے رفاہ عام کی چیزوں میں سے آج بھی ہم کو ایک یادگار ملتی ہے۔ اور وہ مشہور سڑک اعظم ہے جو کلکتہ سے پشاور تک اب بھی رہروؤں کی رہبری کرتی ہے۔

شیر شاہ کے بعد اس کا بیٹا سلیم شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے نو سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کی اور اپنے باپ کے نامکمل کاموں کی تکمیل کی اس کے بعد سوری حکومت نالائق حکمرانوں کے ہاتھ میں آئی جنھوں نے اپنی ناقابلیت کی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں میں حکومت کھو دیا۔ سلطنت کھونے کی سب سے بڑی وجہ سوری سرداروں کا باہمی نفاق تھا۔ سوری سرداروں کی باہمی کشمکش کے دوران میں ہمایوں نے مناسب موقع پاکر ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ سوری اور ہمایونی فوجوں میں پانی پت کے میدان میں مقابلہ ہوا۔ میدان ہمایوں کے ہاتھ رہا۔ سوری فوجیں بھاگ نکلیں۔ ہمایوں کامیابی و کامرانی کے ساتھ دہلی اور آگرہ پر پھر قابض ہوا ۱۵۵۶ء میں افغانی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور سلطنت مغلیہ کی از سر نو بنیاد پڑی۔

درّانی خاندان

۱۷۰۲ء تک جب تک سلطنت مغلیہ میں انحطاط و تنزل نہ ظاہر ہوا تھا اس وقت تک مغلوں نے افغانوں کو بالکل دبائے رکھا تھا۔ اگر افغان سردار کسی علاقہ میں سر اٹھاتے تھے تو نہایت سختی سے ان کی سرکوبی کی جاتی تھی۔ افغانوں کا اصل وطن، افغانستان بھی ہمیشہ مغلوں کے گورنروں کے ماتحت رہا یہ حالت تقریباً دو سو برس تک رہی اس عرصہ میں افغانی کوئی اپنی قومی حکومت قائم نہ کر سکے۔

قدرت نے ایک دفعہ پھر سلطنت مغلیہ کے انحطاط کے بعد افغانوں کو اپنے وطن افغانستان میں حکومت کرنے کا موقع دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کی ابتدا میں ایرانی حکومت نہایت تنزل و انحطاط کو پہنچ گئی۔ مغربی افغانستان کے باشندوں میں سپاہیانہ جذبہ ایک دفعہ اور ابھرا۔ چنانچہ انھوں نے ایران کی کمزور حکومت کو پئے در پئے حملوں سے پریشان کر دیا۔ اور دوسری طرف ترکوں نے ایرانیوں کے ایک بڑے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

اس زمانہ میں قدرت نے ایران کی حفاظت کے لئے نادر شاہ افشار کو پیدا کیا۔ جس نے ایک طرف تو افغانون کو شکست دے کر ان کے وطن افغانستان پر قبضہ کیا اور دوسری طرف ترکوں کو سخت شکستیں دیکر ایرانی علاقے خالی کرائے۔ ۱۷۴۷ء میں جب نادر شاہ افشار قتل ہوا تو ہر افغانی سردار کی تمنا تھی کہ افغانستان کی عنان حکومت اس کے ہاتھ میں آئے۔ چنانچہ تمام افغانی سرداروں کا جرگہ منعقد ہوا جس میں اتفاق رائے سے یہ طے ہوا کہ احمد شاہ ابدالی شاہ افغانستان ہو۔ اور جمال خان بارک زئی اس کا وزیر اور مشیر ہو۔ احمد شاہ ابدالی "نادر شاہ افشار کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدہ پر تھا اور نادر شاہ افشار کا مختلف معرکوں میں ہمرکاب رہ چکا تھا۔ سب سے پہلے اس نے افغانستان کے سرکش قبائل کو رام کیا اس کے بعد اپنی حکومت کیلئے کوشاں ہوا۔ کشمیر، پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سیستان کو اپنی حکومت سے ملحق کر لیا۔ اور آخر میں پانی پت کے میدان

میں مرہٹوں کی طاقت کو پاش پاش کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد مرہٹہ طاقت پھر سنبھل نہ سکی۔
احمد شاہ نے چھبیس سال تک حکومت کی۔ اس کا دور نہایت کامیاب رہا۔ اس زمانے میں حکومت افغانستان کی حد ایک طرف مشہد تک پہونچتی تھی۔ دوسری طرف دہلی تک
اس کے مرنے کے بعد اس بیٹا تیمور وارث تخت ہوا۔ اس کے زمانہ میں بھی حکومت کا وہی عالم تھا جو احمد شاہ کے زمانہ میں تھا۔ لیکن بعد اس کے جب زماں شاہ تخت افغانستان پر آیا تو ایک طرف تو سلطنت میں تنزل شروع ہوا۔ اور دوسری طرف ابدالی شہزادے عنان حکومت کے لئے برسرپیکار نظر آنے لگے۔ چنانچہ ایک قلیل عرصہ میں افغانستان کی وہ وسیع سلطنت جو احمد شاہ ابدالی نے قائم کی تھی، کوہ سلیمان کی گھاٹیوں ہی میں محدود ہو گئی۔

سنہ ۱۸۰۱ء میں زماں شاہ کے بھائی شجاع نے جو پشاور میں مقیم تھا۔ اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے کابل پر حملہ کر دیا۔ لیکن محمود شاہ کی فوجوں سے شکست کھا کر درۂ خیبر میں پناہ گزین ہوا۔ لیکن سنہ ۱۸۰۲ء میں وہ تخت کابل لینے میں کامیاب گیا۔ اور محمود شاہ کو تخت سے اتار کر اسے قید کر دیا، اور خود رونق افروز تخت کابل ہو گیا۔

اس کے بعد سات سال تک شاہ شجاع نے افغانستان پر حکومت کی۔ مگر آئے دن بغاوتوں اور شورشوں سے پریشان رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ شجاع نہ تو جنگ وجدل کا مرد میدان تھا۔ اور نہ تدبر و سیاست کی چالیں جانتا تھا۔ مزید برآں بڑھاپے نے اس کے قویٰ کو اور بھی شل کر دیا تھا اس لئے ہر افغان شاہ شجاع سے نفرت کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس نفرت نے افغانستان میں ایک عالمگیر بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۰۹ء میں وزیر خان نے شاہ شجاع کو شکست فاش دے کر تخت کابل چھین لیا اور شجاع افغانستان کو چھوڑ کر ہندوستان میں اوّل اوّل رنجیت سنگھ کے ہاں پناہ گزین ہوا۔ لیکن رنجیت سنگھ نے بجائے خاطر و مدارات کے شاہ شجاع کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا۔ شاہ شجاع کے پاس جتنے جواہر

تھے اس نے وہ سب اس سے غضب کر لئے۔

اب بحالت مجبوری شاہ شجاع نے انگریزوں کے ہاں جاکر پناہ لی۔ انگریزوں نے اسکے لئے ایک وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیکن ابھی تک شاہ شجاع تخت کابل کا خواب دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ ایک بار اور تخت کابل کے لئے قسمت آزمائی کی۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شاہ شجاع نے سکھوں اور انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ طاقتیں افغانستان کا تخت اس کے اصلی اور حقیقی وارث شاہ شجاع کو دلائیں گی۔

چنانچہ افغانستان کی پہلی جنگ کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا انگریزی فوجیں براہ درۂ بولان افغانستان میں داخل ہوئیں۔ قندھار، غزنی اور کابل پر قابض ہو کر شاہ شجاع کو تخت کابل پر بٹھایا۔ دوست محمد خان بارکزئی جو شاہ شجاع کے بعد تخت کابل پر قابض ہوا تھا بھاگ کر امیر بخارا کے ہاں پناہ گزین ہوا۔ لیکن چند دنوں کے بعد امیر بخارا نے اس کو قید کر لیا۔ اتفاقی طور پر دوست محمد خان نے رہائی پاکر اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے اس کو کلکتہ میں نظر بند رکھا۔ اور دو لاکھ روپیہ سالانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ افغانی قبائل شاہ شجاع کی حکومت سے ناراض تھے۔ اب اس ناراضگی میں اور اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ اس نے کفار و نصاریٰ کو کابل میں بلایا تھا۔ نیز اس نے ہمیشہ قوم کے ساتھ منافقانہ برتاؤ کیا۔ افغانستان کی پہلی جنگ کے بعد جو برطانوی فوجیں شاہ شجاع کی حفاظت کے لئے کابل میں مقیم تھیں۔ افغان چاہتے تھے کہ ان کا کلی استیصال کر کے برطانوی قدموں سے افغانستان کی زمین کو پاک کر دیں۔ اس زمانہ میں شاہ شجاع بظاہر تو قوم سے ملا ہوا تھا۔ مگر خفیہ طور پر برطانوی نمائندوں سے سازباز رکھتا تھا۔ اس چیز نے افغانوں کو مشتعل کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے شاہ شجاع کو قتل کر ڈالا۔ الغرض ۱۸۴۳ء میں ابدالی خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور بارک زئی خاندان نے اس کی جگہ لی۔

بارک زئی خاندان | اس زمانہ میں تمام افغانستان میں انگریزوں کے خلاف ایک عام نفرت کی

جذبات پھیل گئے جنھوں نے ترقی پاکر بغاوت کی شکل اختیار کرلی جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ اس زمانہ میں دوست محمد خان انگریزوں کی پناہ میں کلکتہ میں مقیم تھا۔ دوست محمد خان کا بیٹا اکبر خان جو شجاعت میں اپنے باپ سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھا۔ اس نے افغانوں کی رہنمائی کی۔ آخر الامر انگریزوں اور اکبر خان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی خاص دفعات یہ تھیں کہ دوست محمد خان کو افغانستان کا بادشاہ بنایا جائے۔ اور انگریزوں کی فوجیں جلد سے جلد افغانستان کے تمام شہروں کو خالی کردیں۔ چنانچہ معاہدہ کی رو سے انگریزی فوجیں واپس آرہی تھیں کہ برف باری اور افغانی قبائل دونوں نے مل کر تمام انگریزی فوج کا خاتمہ کردیا۔ ایک ڈاکٹر بمشکل جلال آباد سے پشاور تک پہونچا جس کی زبانی یہ سرگذشت دوسروں کے کانوں تک پہونچی۔ اس کے بعد انگریزوں نے دوسری مہم محض اپنا وقار برقرار رکھنے کے لئے افغانستان روانہ کی جس نے کابل کے سب سے خوبصورت بازار کو جو ایشیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا گرا کر پیوند خاک کردیا۔ اور چن چن کر افغانوں کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد انگریزی فوجیں واپس ہوئیں اس وقت انگریزوں نے افغانی قیدیوں کو رہا کیا۔

اب دوست محمد خاں کو افغانستان کا امیر تسلیم کیا گیا۔ اس نے ایک عرصہ تک افغانستان پر حکومت کرنے کے بعد ۱۸۶۳ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد شیر علیخان اور افضل خان افغانستان کے دعویدار ہوئے۔ شیر علی خان نے انگریزوں سے امداد کی درخواست کی جس کو انگریزوں نے یہ کہہ کر رد کردیا کہ ہم نہیں چاہتے کہ افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کریں۔ اس خشک جواب کے بعد شیر علی خاں تن تنہا اپنی قوت بازو سے تمام افغانستان پر قابض ہوگیا۔

اس باہمی نزاع کے دوران میں انگریزوں نے موقعہ پاکر خان قلات سے ایک خفیہ معاہدہ کیا اور کوئٹہ لے لیا۔ اس چیز نے شیر علی خاں کو انگریزوں سے متنفر کردیا۔ وہ

روسی حکومت سے اپنے تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔ انگریزوں نے اب تیسرا حملہ افغانستان پر کیا۔ شیر علی خان بھاگ کر روسی سرحد میں پناہ گزین ہوا۔ جہاں موت نے ہمیشہ کے لئے اس کو کشمکش زندگی سے نجات دے دی۔

اب انگریزوں نے ایک معاہدہ کی رو سے امیر یعقوب علی خاں کو تخت کا مالک بنایا۔ لیکن یعقوب علی خان سے افغان خوش نہ تھے۔ کیونکہ ابھی شاہ شجاع کی طرح اپنی حکومت انگریزی تلواروں کے زیر سایہ قائم کی تھی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے میں بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی افغانوں نے انگریزی ریزیڈنسی کو جلادیا۔ یعقوب علی خاں نے اپنے آپ کو انگریزوں کے سپرد کر دیا۔ انگریزوں نے اسے ہندوستان میں نظر بند رکھا اور وظیفہ مقرر کر دیا۔

یعقوب علی خان کے بعد افغانون کی حکومت کا خاتمہ تقریباً ہو گیا تھا۔ تمام احکامات جنرل رابرٹس جاری کرتا تھا۔ شیر علی خان کے دوسرے بیٹے ایوب خان نے ہرات سے میوند پر حملہ کر کے انگریزوں کو شکست دی۔ اب انگریزون نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ افغانوں پر بزور شمشیر حکومت قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

چنانچہ انگریزی مدبرین نے یہ مناسب سمجھا کہ کسی افغان شہزادے کو تخت افغانستان دے کر انگریزی فوجیں ہندوستان کو واپس ہوں۔ انگریز مدبرین کی نظریں عبدالرحمان خان پر پڑیں جو ایک عرصہ سے روس میں پناہ گزین تھا۔ اور اب روس چھوڑ کر حدود افغانستان میں اپنی قوت مجتمع کر رہا تھا۔ اور موقع کا منتظر تھا کہ اتنے مین انگریزی قاصد پیغام لے کر پہونچا۔ عبدالرحمٰن خاں نے انگریزوں کی دعوت قبول کر کے تخت کابل کو سنبھالا اور انگریزی فوجیں ہندوستان واپس چلی آئیں۔

عبدالرحمان خان اپنے زمانہ کا ایک بڑا مدبر شخص تھا۔ انقلاب زمانہ نے اس کے ذہن کو اور جلا دیدی تھی۔ اس نے اپنے طویل عہد حکومت میں ملکی اور فوجی محکموں کی اصلاحات

کی اس سے پہلے افغانستان پس ماندہ ممالک میں شمار کیا جاتا تھا لیکن اس کی شبانہ روز کی محنت شاقہ نے افغانستان کو تہذیب حاضر سے آشنا کر دیا عبدالرحمان خان نے اس بات کی بہت کوشش کی کہ افغانستان انگریزی اور روسی اقتدار سے ہمیشہ آزاد رہے۔ چنانچہ امیر موصوف نے اپنے سب سے چہیتے بیٹے نصراللہ خان کو انگلستان اس مقصد کے لئے بھیجا کہ شاہ انگلستان سے اس بات کی اجازت حاصل کرلے کہ افغانی اور برطانوی معاملات حکومت انگلستان سے براہ راست طے ہوا کریں۔ نہ کہ حکومت ہند کے توسط سے۔

لیکن شاہ انگلستان نے اس درخواست کو منظور نہیں کیا جس کی وجہ سے عبدالرحمان خان کو انگریزوں سے بددلی پیدا ہو گئی۔ انگریزوں نے اس کی تلافی اس طریقہ پر کرنی چاہی کہ راولپنڈی میں ایک دربار منعقد کر کے عبدالرحمان خان کو بلایا جس میں ویسرائے ہند اور امیر موصوف کی کی ملاقات ہوئی۔ حکومت برطانیہ نے شاہ افغانستان کے سالانہ وظیفہ میں اضافہ کر کے بارہ لاکھ کے بجائے اٹھارہ لاکھ کر دئے۔ امیر موصوف نے اس اضافہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور برطانوی مدبرین کو یقین دلایا کہ افغان ہمیشہ حکومت برطانیہ کے سچے دوست رہینگے اور وہ بوقت ضرورت حکومت برطانیہ کی مدد کرنے کو ہر طرح تیار ہیں۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں جب امیر عبدالرحمان خان نے رحلت کی تو ان کے بیٹے حبیب اللہ خان افغانستان کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ امیر حبیب اللہ خان نے اپنے پہلے دربار میں تمام سرداران قبائل کے سامنے اس امر کا اعلان کیا تھا کہ ان کی حکومت کی پالیسی وہی رہیگی جو ان کے والد امیر مرحوم کی تھی۔ حقیقت یہ ہے حبیب اللہ خان کو عبدالرحمان نے اپنی زندگی میں اچھی طرح ملکی معاملات کا عملی تجربہ سکھا دیا تھا۔ لیکن حبیب اللہ خان نے کوئی خاص جوہر نہیں دکھایا۔ جو اس کے باپ امیر عبدالرحمان خان میں تھا۔ امیر حبیب اللہ خان کو افغانستان کی عنان سلطنت اس وقت ملی جب تمام ملک منظم تھا۔ تمام افغانستان میں امن وامان کا دور دورہ تھا۔ عبدالرحمان خان کے انتقال کے بعد تخت کے لئے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ ان حالات

میں حبیب اللہ خان کا فرض تھا کہ ملک کو ایک قدم اور آگے بڑھاتے۔ لیکن حبیب اللہ خان میں باپ کے انتقال کے بعد وہ ولولہ نہیں رہا تھا جو وقتاً فوقتاً باپ کی زندگی میں ظاہر ہوتا رہا۔ غرضیکہ ۱۹۱۴ء میں جب یورپ کی جنگ عظیم چھڑی تو اس زمانہ میں ایک جرمن و ترکی وفد افغانستان پہونچا اور حبیب اللہ خان سے استدعا کی کہ افغانستان کی فوجیں ہندوستان پر حملہ کرکے اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کریں۔ حبیب اللہ خان نے اس مشورہ کو ٹھکرا دیا۔ جرمن و ترکی وفد بے نیل ومرام واپس گیا۔

اس واقعہ نے نوجوان افغانون کے دلوں میں حبیب اللہ خان کے خلاف نفرت انگیز جذبات پیدا کردئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۱۸ء میں حبیب اللہ خان جلال آباد کے قریب شکارگاہ مین ایک نوجوان افغان کے ہاتھ گولی کا نشانہ بنا۔ اور قاتل کا آج تک کوئی پتہ نہیں چلا۔

حبیب اللہ خان کے بعد تخت افغانستان پر وہ شخصیت جلوہ آرا ہوئی جس کو دنیا۔ امان اللہ خان کے ہر دلعزیز نام سے جانتی ہے۔ امان اللہ خان بھی بلا کسی مخالفت کے شاہ افغانستان ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں جب انگریزی قوت باوجود فتح یابی کے چور چور ہوگئی تھی۔ اسی وقت امان اللہ خان نے زرین موقع دیکھ کر انگریزون کے خلاف اعلان جنگ کردیا چنانچہ افغانی فوجوں نے نادرخان موجودہ شاہ افغانستان کی قیادت میں انگریزی سرحد پر حملہ کرکے انگریزون کو اس شرط کی ماننے پر مجبور کیا کہ حکومت برطانیہ افغانستان کے استقلال کو تسلیم کرے۔ کیونکہ افغان اب انگریزی اقتدار کو کسی حالت میں برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ افغانی اور انگریزی نمائندون نے راولپنڈی اور دہرہ دون میں معاہدہ تیار کیا۔ اس مین افغانستان کو دولت مستقلہ کیا گیا۔ اور انگریزون نے وظیفہ کی وہ رقم جو شاہان افغانستان کو سالانہ دیتے تھے بند کردی۔

اب افغانستان کی سلطنت " دولت خداداد مستقلۂ افغانستان " کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور تمام مشرقی اور مغربی طاقتوں نے افغانستان کے استقلال کو تسلیم کیا۔ مختلف ممالک

میں افغانی سفراء مقرر ہو کر رہنے لگے۔
حقیقت یہ ہے کہ کارکنان قضا و قدر نے امان اللہ خان کو وہ ذہن رسا عطا کیا تھا کہ جس کی قدر و قیمت افغانوں جیسے قدامت پسند لوگ نہیں کر سکتے تھے۔ امان اللہ خان اپنے دادا کی طرح چاہتا تھا کہ افغان قوم اقوام عالم کے ساتھ ترقی کی دوڑ میں دوش بدوش چل سکے۔ لیکن افغانوں جیسی قدامت پسند قوم نے امان اللہ خان کی شخصیت کو نہیں سمجھا۔ ایسے افراد کسی قوم میں ہر روز نہیں پیدا ہوا کرتے۔ بلکہ قدرت اپنی یہ نعمت ایک عرصۂ دراز کے بعد دیتی ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (اقبال)

۱۹۲۸ء میں امان اللہ خان نے اپنے ملک کی اصلاح و ترقی کیلئے ضروری سمجھا کہ بذات خود یورپ کے مختلف ممالک کی سیاحت کرکے وہاں کے تعلیمی، صنعتی اور تجارتی اداروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اپنے ملک، افغانستان میں ان طریقوں کو رائج کریں۔ چنانچہ امان اللہ خان نے یورپ کے مختلف ممالک کا دورہ کیا۔ خصوصاً جب وہ انگلستان، فرانس، جرمنی اور روس میں گئے تو ان کی حکومتوں نے امان اللہ خان کا شاہانہ استقبال کیا۔ یورپ اور ایشیا کے جرائد و اخبار نے امان اللہ خان اور افغانستان پر مفصل مضامین شائع کئے۔ افغانستان کی شہرت دنیا کے دور و دراز گوشوں تک پہونچی۔ امان اللہ خان یہ سفر تقریباً سات آٹھ ماہ میں ختم کرکے بخیریت اپنے وطن کو واپس ہوئے۔ امان اللہ خان کے دل میں اپنے وطن کی محبت تھی وہ چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے افغانستان ترقی کرکے دنیا کے متمدن ممالک میں شمار ہونے لگے۔ آتے ہی امان اللہ خان نے ملک میں اصلاحات جدیدہ جاری کر دیں۔ اس فوری اقدام نے افغانی قوم کو ناراض کر دیا۔ اور قوم کی ناراضگی نے بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ الغرض امان اللہ خان نے کابل کو خیرباد کہا

قندھار میں پناہ لی۔ باغیوں کے سرغنہ بچہ سقہ نے تخت کابل پر قبضہ کرلیا۔ اور امیر حبیب اللہ کے لقب سے تخت نشین ہوگیا۔

امان اللہ خان نے قندھار میں فوجی قوت درست کی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ باغیوں سے مقابلہ کیا لیکن اس مقابلہ میں ان کو معلوم ہوگیا کہ ان کا افغانستان میں رہنا محال اور بے فائدہ ہے۔ چنانچہ امان اللہ خان ہندوستان کی راہ یورپ چلے گئے۔ اور روم میں سکونت پذیر ہو گئے۔ امان اللہ خان کے جانے کے بعد تمام افغانستان پر بچہ سقہ کا قبضہ ہوگیا سقوی مظالم نے افغانوں کے لئے عرصہ حیات تنگ کردیا۔ قدرت نے افغانستان کی بہبود اور نجات کے لئے ایک مریض سردار کو جو فرانس میں صاحب فراش تھا جس کو دنیا نادر شاہ کے نام سے جانتی ہے لاکر کھڑا کر دیا۔ بیماری کی حالت میں نادر خاں کو حب الوطنی کے جذبات نے مجبور کیا کہ فرانس جیسے ملک کی پر لطف زندگی کو ترک کرکے افغانستان میں جو اس وقت سقوی مظالم کی وجہ سے کرۂ آتش بنا ہوا تھا آئے اور ملک کو ڈاکوؤں کے ہاتھ سے چھڑا کر ایک منظم حکومت قائم کرے۔ چنانچہ نادر خان نے مع اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے ۱۹۲۹ء میں افغانستان پہونچکر ملک کو ڈاکوؤں سے صاف کرکے افغانستان کے تاج کو قومی جرگہ کے سامنے رکھا۔ کہ قومی جرگہ اس تاج کے قابل جس کو سمجھے اس کے سر پر رکھ دے۔ چنانچہ تمام افغانستان کے سرداروں نے یہی فیصلہ کیا کہ موجودہ ابتری کی حالت میں افغانی تاج کا سزاوار صرف نادر خان کا سر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ نادر خان ہی تھا کہ جس نے ۱۹۱۹ء میں ملک کو استقلال کی دولت سے مالا مال کردیا تھا اور پھر اب مصیبت کے وقت ملک کو اسی نے نجات دلائی۔

اس لئے افغانی تاج نادر خان کے سامنے پیش کیا گیا۔ جسکو انھوں نے بڑے اصرار کے بعد زیب سر کیا۔ اس کے بعد سے اپنے وطن عزیز افغانستان کی ترقی اور بہبودی کے لئے برابر کوشاں ہیں۔ اور تدریجی طریقہ سے ملک کو اسی منزل کی طرف لے جا رہے ہیں

س کی طرف امان اللہ خان نہایت تیزی سے لیجانا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ ان اللہ خان اور نادر خان دو قابل فخر فرزند ہیں۔ دونوں کے دل افغان قوم کی ترقی کے لئے بے قرار ہیں۔ دونوں چاہتے ہیں کہ افغانستان تمام دنیا میں عزت و وقار حاصل کرے۔ ر فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ امان اللہ خان بہت تیزی سے ملک کو تہذیب جدید سے آشنا رنا چاہتے تھے اور نادر خان تدریجی طریقے پر ملک کو ترقی کی طرف لیجا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے ہ افغانوں جیسی قدامت پسند قوم کو یہ ہرگز گوارا نہ ہوگا کہ یک وقت تہذیب حاضرہ سے ہمکنار ہو جائیں۔ ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ ان کو تدریجی طریقے سے ترقی کی طرف لیجایا جائے۔

امیر عبدالرحمان خان افغانی زندگی کا سب سے بڑا نباض تھا؛ بالفاظ دیگر جس نے افغانی فطرت کا نہایت عمیق مطالعہ کیا تھا اس نے اپنے جانشینوں کو اپنی خود نوشتہ سوانح حیات میں چند نصیحتیں کی ہیں اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ کہ

> "میرے جانشینوں کا یہ فرض ہے کہ جو اصلاحی تحریک ملک میں جاری کرنا چاہیں وہ سوچ سمجھ کر جاری کریں۔ ایسا نہ ہو کہ افغان قوم کے جذبات کو ٹھیس لگے مغربی تعلیم کے دار العلوم اور جمہوری طرز حکومت کے قوانین بتدریج جاری کریں"

ماہر فطرت افغانی، امیر عبدالرحمٰن خان کی یہ نصیحت کس قدر تجربہ اور حقیقت پر مبنی ہے امان اللہ خان اس نصیحت کو ترک کر کے سرعت کے ساتھ اپنی قوم کو اصلاحات کی طرف لیجانا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ دنیا کے سامنے موجود ہے۔ اس لئے افغانستان کے ہر حکمران کے لئے ضروری ہے کہ وہ افغانستان کے سامنے اصلاحی پروگرام تدریجی طور پر پیش کرے۔

نادر خان نے اس قلیل عرصہ میں افغانستان کو جس طرح منظم کیا ہے۔ اس کی مثال۔ افغانی تاریخ میں مشکل سے ملیگی۔ اس وقت افغانستان خدا کے فضل سے تدریجی رفتار سے ترقی

کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آج افغانستان کی فوجیں منظم ہیں ملک کی سیاسی، تعلیمی، تجارتی، مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے لئے موجودہ فرمانروا ہر طرح سے کوشاں ہے۔ مذہبی اصلاح کیلئے اس نے ایک جماعت جمعیتہ علمائے افغانستان کے نام تشکیل دی ہے۔ سیاسی ترقی کے لئے اسی سال افغانی پارلیمینٹ اور افغانی دارالامراء کا افتتاح ہو چکا ہے۔ ان اداروں کا افتتاح کرتے ہوئے نادر خان نے جو تقریریں کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فرمانروا کا دل اپنی قوم اور مذہب سے کس قدر معمور ہے اور وہ اسلامی اصولوں کے احترام و وقار کے لئے اپنی ہر چیز قربان کرنے کیلئے آمادہ ہے۔

خاتمہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ افغان بجائے حکمران ہونے کے سپاہی بہتر ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ خیال غلط ہے۔ اس لئے کہ ایک افغانی جس طرح میدان جنگ میں سپاہیانہ جوہر دکھلا سکتا ہے۔ اسی طرح تخت حکومت پر بیٹھ کر بہتر طریقے پر انتظام مملکت بھی کر سکتا ہے۔

دولت غوریہ سے لے کر موجودہ زمانہ تک اگر افغانوں کی سیاسی تاریخ دیکھی جائے تو افغانوں میں سینکڑوں افراد ایسے ملیں گے جنھوں نے اس امر کا کافی ثبوت بہم پہونچایا ہے۔ کہ افغان قوم اصول جہانبانی میں کسی قوم سے کم نہیں۔ قدرت نے افغانوں کو جہاں سپاہیانہ جوہر مرحمت فرمایا ہے وہاں حکمرانی کا سلیقہ بھی عنایت کیا ہے۔ یہ سلیقہ حکمرانی افغانوں میں اگر کسی قوم سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ سکندر لودھی کا عدل و انصاف۔ شیر شاہ کا انتظام مملکت احمد شاہ ابدالی کی فوجی قابلیت۔ امیر عبدالرحمٰن خان کے سیاسی تجربات اور امان اللہ خان کی حب الوطنی اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ افغانوں کو قدرت نے جہاں سپاہیانہ مادہ عنایت کیا ہے وہاں ملکۂ فرمانروائی میں بھی بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ یہ دونوں خاصیتیں کسی قوم میں بیک وقت کم پائی جاتی ہیں۔

افغانی حکمران خاندانوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ افغانی حکومتیں رعایا پروری عدل و انصاف میں دوسرے حکمران خاندانوں سے اگر آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں ہیں۔

رفاہ عام اور ملک کی اندرونی امن واماں ان کی حکومتوں کا مقصد اولین تھا۔ غوریوں کی حکومت میں تمام افغانستان میں امن واماں تھا۔ لودھیوں نے طوائف الملوکی کے زمانہ میں سلطنت ہندوستان کو جس طرح لامرکزیت سے نکال کر مرکزیت میں کردیا۔ کیا یہ واقعہ ان کے ملک جہانبانی کے ثبوت کے لئے کافی نہیں؟ شیر شاہی عہد اپنی برکات کی وجہ سے تاریخ ہند میں ایک نمایاں امتیاز رکھتا ہے۔ ابدالی فتوحات افغانی تاریخ میں ایک زرین صفحہ ہے۔ بارک زئی خاندان کی شجاعت کے کارنامے ہر افغان بچے اور بوڑھے کی زبان پر جاری ہیں۔ اسی خاندان نے اپنی شجاعت اور تدبیر سے روس اور برطانیہ جیسی استعماریت پرست طاقتوں کو متعدد بار نیچا دیکھایا۔ دونوں طاقتوں کو معلوم ہوگیا کہ افغانی قوم کوئی تر لقمہ نہیں جس کو آسانی کے ساتھ ہضم کیا جاسکے۔ برطانوی مدبرین اپنی انتہائی سیاسی چالبازیوں اور فوجی طاقت کے مظاہروں کے باوجود افغانوں کو اپنے قبضہ میں نہ لاسکے۔ انگریزوں کو اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ افغانوں جیسی حریت پسند قوم پر حکومت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چنانچہ ایک انگریز مورخ افغانی اور برطانوی جنگوں پر تنقید کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے کہ "بتیس کروڑ مصارف کثیرہ اور ہزارہا جانیں ضائع ہونیکے باوجود ہم کو افغانوں کی عداوت کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔"

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ افغان قوم باوجود ان مندرجہ بالا خصائص کے ایک خرابی رکھتی ہے جو ان کی تمام خوبیوں پر پردہ ڈالے ہوئے ہے اور وہ نفاق ہے۔ افغانی تاریخ بتاتی ہے کہ متعدد شخصیتوں نے افغانوں کو اتحاد کی تلقین کی۔ ان شخصیتوں میں نمایاں شخصیت شیر شاہ کی ہے۔ شیر شاہ نے افغانوں کے اتحاد کے لئے بے انتہا کوشش کی۔ لیکن شیر شاہ کے مرنے کے بعد افغان سرداروں میں وہی نااتفاقی عود کر آئی جس نے شیر شاہ کی قائم کی ہوئی وسیع سلطنت کو تباہ وبرباد کرکے چھوڑا۔ شیر شاہ کے بعد دوسری شخصیت عبدالرحمان خان کی ہے جس نے افغان قوم کو متنبہ کیا کہ "تمھاری نااتفاقی تمھاری تباہی وبربادی کا سبب بنی ہوئی ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ افغانستان کی حکومت مضبوط ہو تو تمھارا

سب سے مقدم فرض ہے کہ قوم کے منتشر افراد کو رشتہ اخوت میں منسلک کرو۔"

عبدالرحمان خان کے بعد اس کے پوتے امان اللہ خان نے بھی قوم کے سامنے اپنے دادا کے پیغام کو دہرایا اور کہا کہ" افغانوں کی ترقی کا راز اتحاد اور محض اتحاد میں مضمر ہے۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج تک افغان قوم نے اپنی جہالت کی وجہ سے اتحاد کی برکت کو نہیں سمجھا۔ مگر گردشِ زمانہ افغانوں کو ایک نہ ایک روز رشتۂ اتحاد میں منسلک کر کے چھوڑے گی۔ اس وقت یہ ملت آوارہ کوہ و دمن میدان میں نکل کر ایشیا کی رہنمائی کا فخر حاصل کرے گی۔

حوالے

اردو:
(۱) نیرنگ افغانستان — از اغلب حسن حسرت
(۲) تاریخ فرشتہ — دارالترجمہ حیدرآباد
(۳) تاریخ ہند — از ہاشمی

فارسی:
(۱) تاریخ سراج الاخبار
(۲) تزک عبدالرحمانی
(۳) فارسی جرائد (افغانستان - اصلاح)

(1) The History of Kabul vol: I by Elphinstone.

خطابت کی سحر کاریاں

شیکسپیر کا ایک مشہور ڈرامہ (جولیس قیصر) ہے یہ افسانہ عقول عوام کی ایک دردناک داستان اور خطبا کی ہوس رانیوں اور فریب کاریوں کی ایک مکمل تصویر ہے۔ تمہیں اس قصہ میں نظر آئیگا کہ جس طرح کھلاڑی فٹ بال کو اپنے حسب منشا اوپر پھینکتے نیچے گراتے اور ٹھوکریں دیتے ہیں ٹھیک اسی طرح عوام کے لیڈر، بڑے بڑے خطبا، اور اچھے سے اچھے مقررین انکے جذبات ان کے خیالات اور انکے احساسات سے کھیلتے ہیں۔ کبھی اپنے قطرہائے اشک کے سیلاب میں انہیں ڈبکیاں دیتے ہیں تو کبھی اپنے برق صفت تبسم سے انکے خرمن سکون وراحت کو جلاکر خاکستر کردیتے ہیں کبھی اپنی پرجوش تقریروں سے قلب کو گرما اور روح کو تڑپا دیتے ہیں۔ تو کبھی اپنی جادو بیانیوں سے ساری قوم کو اپنی ہوا و ہوس اور ذاتی اغراض و مقاصد کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

بروٹس ایک ہمدرد قوم و ملک اور شریف و معزز رومی تھا اسنے شدت کیساتھ یہ محسوس کیا کہ جولیس قیصر نے پوری رومی قوم کو غلام بنا رکھا ہے۔ انکی شرافت نفس فنا کے گھاٹ اتر چکی ہے۔ ابدی ذلت نے انکے حواس و شعور پر پورا قابو پالیا ہے۔ انہیں اپنی زندگی کی تلخی کا احساس نہیں۔ چندے یہی لیل و نہار رہا تو بحیثیت ایک منہ و خود دار قوم کے انکا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ جائیگا۔ کافی غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس مہلک مرض کا واحد علاج قیصر کا قتل ہے۔

قیصر بروٹس کا نہایت ہی محبوب دوست تھا لیکن قوم و ملک کی خاطر اسنے اپنی محبوب متاع کو اپنے ہی تلوار سے موت کے خوفناک گڑھے میں ڈھکیل دیا

رومی قوم قیصر کے قاتل سے انتقام لینے کیلئے بیتاب ہوگئی۔ لوگوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا اور بروٹس کو گھیر لیا۔

بروٹس اس غضبناک مجمع کے سامنے تقریر کرنیکے لئے کھڑا ہوا۔ یہ نہایت ہی نازک موقع

سرفرازی وسربلندی کا تاج یا ذلت ورسوائی کا قہر بے پناہ۔ بہادروں اور جان نثاروں کا درخشاں تمغہ یا خائن وغدار گروہ کا سا تاریک انجام۔ یہ ظاہر ہے کہ تقریر کی تاثیر وعدم تاثیر پر موقوف تھا۔ مجمع غصے میں بھرا ہوا تھا۔ کسی طرح تقریر سننے کیلئے تیار نہیں تھا۔ زبان پر انتقام انتقام کی رٹ تھی۔ بارے بعض زعما کی کوششوں سے سکوں کی فضا پیدا ہوئی اور بروٹس نے تقریر شروع کی۔

بروٹس کی تقریر

بزرگانِ قوم۔ کیا میں امید کروں کہ آپ حضرات میری بھلی یا بری کڑوی یا میٹھی بکواس تھوڑی دیر کیلئے عدل وانصاف کی خاطر صبر وسکون کے ساتھ سنیں گے۔ میں آپ لوگوں کو دھوکا دینا نہیں چاہتا اور نہ آپ کے جذبات واحساسات کی توہین کرنا اور آپ کے دلوں اور دماغوں سے کھیلنا چاہتا ہوں بلکہ آپ لوگوں سے میری پرزور درخواست ہے کہ واقعہ کا نہایت ہی حزم واحتیاط کے ساتھ مطالعہ فرمائیے میں آپ لوگوں کو کامل صداقت وخلوص سے دعوت دیتا ہوں کہ قضیہ بہ النزاع کا فیصلہ متانت وسنجیدگی اور سکون قلب واطمینان خاطر کیساتھ عدل وانصاف کی روشنی میں کیجئے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میرا یہ اقدام مبنی برحق ہے اسکے دامن پر کوئی ایسا داغ نہیں جسے میں آپ لوگوں کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کروں۔

برادرانِ وطن! اگر آپ میں کوئی قیصر کا دوست یہاں موجود ہوا اور وہ اسکے قتل پر اپنے جگر کے ٹکڑے کر رہا ہو تو مجھے معاف کرے اگر میں اس سے یہ کہوں کہ اے میرے معزز دوست! قیصر کے قاتل بروٹس کو قیصر تم سے زیادہ محبوب تھا۔ قیصر کی وقعت تمہارے دل میں اتنی نہیں جتنی اسکے دل میں تھی۔

اکابرِ ملت! میں تمام دنیا کے سامنے جھوٹ بول سکتا ہوں لیکن آپ لوگوں کے سامنے کوئی جھوٹا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ آپ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے اپنے محبوب دوست قیصر کو کسی ذاتی بغض وعناد کسی شخصی عداوت ودشمنی کی بنا پر قتل نہیں کیا ہے بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے قتل کیا ہے کہ روم مجھکو اس سے کہیں زیادہ محبوب تھا۔

قیصر ایک بڑی شخصیت کا مالک تھا اس لئے مجھے وہ محبوب تھا وہ شجاع اور بہادر تھا اسلئے میں اُسکا احترام کرتا تھا لیکن وہ طماع و حریص تھا اس لئے مینے اُسکا کام تمام کر دیا۔ پس ایک ہی وقت میں میں نے اسپر آنسو بھی بہائے اور خنجر بھی چلایا۔

مجھے یقین نہیں کہ آپ لوگوں میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جسے قیصر کی موت پر حقیقی اور واقعی رنج وغم اور افسوس وحسرت ہو آپ رومی ہیں اور رومی کبھی ذلت کیساتھ زندہ رہنا پسند نہیں کرتا۔

آپ لوگوں میں وہ کون ایسا شخص ہے جو رومی کہلایا جانا پسند نہیں کرتا۔ وہ کون ہے جو آزاد رہنا عیب سمجھتا ہے۔ وہ کون ہے جو اپنے نفس وضمیر کی توہین گوارا کرتا ہے۔ وہ کون ہے جو اپنے وطن عزیز کی ذلت وحقارت کی اپنے اندر تاب رکھتا ہے۔ اگر آپ لوگوں میں کوئی ایسا شخص ہو تو جواب دے وہی اس بات کا حقدار ہے کہ مجھ سے قیصر کے خون کا مطالبہ کرے کیونکہ میں نے اس شخص کے علاوہ کسی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہونچایا ہے۔

مجمع۔ نہیں ہم میں کوئی ایسا نہیں۔

بروٹس۔ تو پھر میں نے کسی کو اذیت نہیں دی۔

بروٹس نے مشکل ہی سے یہ جملہ ختم کیا تھا کہ قیصر کا دوست اور طالبان انتقام کا سرگروہ انٹونیو مع اپنے رفقا کے قیصر کی لاش لئے ہوئے مجمع میں نوحہ ومرثیہ خوانی کے لئے پہونچا۔ بروٹس نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے یہ قیصر کی لاش ہے اور یہ انٹونیو قیصر کا دوست ہے۔ یہاں پر یہ قیصر کے فضائل ومحاسن بیان کرنے آیا ہے۔ آپ لوگ غور سے سنئے مگر اس فرق کو ذہن میں محفوظ رکھئے کہ گنہگار قیصر اور ہے اور نیک وپرہیزگار قیصر اور ہے۔ گنہگار قیصر کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا اسے تو آپ سُن چکے اب پرہیزگار قیصر کے متعلق جو کچھ کہا جائے اسے سنئے۔ آخر میں میں ایک جملہ پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

عظمائے روم! جس تلوار سے میں نے روم کے لئے قیصر کو قتل کیا ہے وہ تلوار قیصر کی

خاطر بروٹس کے قتل کے لئے بھی جب کبھی بھی روم چاہے ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

تقریر کا اثر

مجمع۔ زندہ باد بروٹس

ایک۔ اس جاں نثار ملک و فدا کار قوم کا ایک مجسمہ نصب کرنا چاہئے۔

دوسرا۔ اس لائق فرزند وطن کو قیصر کے تاج و تخت کا مالک بنا دیا جائے۔

تیسرا۔ قیصر فضل و کمال اور شرافت نفس میں اس کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔

چوتھا۔ قیصر ظالم و جفا کار تھا۔

پانچواں۔ اجی وہ سراپا جور و ستم اور ظلم و جفا تھا۔

چھٹا۔ اب روم کو اس ظالم و سفاک سے نجات ملی۔

ساتواں۔ کیا ہمیں انٹونیو کے ساتھ قیصر کے مرثیے میں شرکت کرنا چاہئے۔

آٹھواں۔ ہاں ضرور کیونکہ بروٹس نے ہم کو حکم دیا ہے۔

بروٹس اسٹیج سے اب اتر پڑا اور مجمع پروانہ وار اس پر ٹوٹ پڑا۔ لوگوں کے دل اس کے قدموں پر لوٹ رہے تھے اور آنکھیں اس کے لئے بچھی جاتی تھیں۔ انٹونیو اسی عالم میں کھڑا ہوا تھا۔ غضبناک اور خشم آلود آنکھوں نے اس کو گھورا۔ اگر بروٹس نہ روکتا تو مجمع اسے چشم زدن میں فرش زمیں پر ڈھیر کر دیتا۔ انٹونیو نے اس غبار آلود فضا میں حسب ذیل معرکۃ الآرا تقریر شروع کی۔

انٹونیو کی تقریر

انٹونیو۔ اے رومیو!

ایک۔ خاموش، سنو، انٹونیو کیا کہتا ہے

دوسرا۔ نہیں، ہم نہیں سنیں گے۔ ہم اُس کی بات نہیں سنیں گے۔

انٹونیو۔ پیارے بھائیو! سنو بروٹس کے حکم کی عزت کرو۔ بروٹس کی خاطر میری سنو۔

کوئی ایک۔ دیکھو سنو تو سہی کہ بروٹس کے متعلق یہ شخص کیا کہتا ہے۔

دوسرا۔ اماں کچھ نہیں۔ ہم اس کی بکواس نہیں سنیں گے۔

تیسرا۔ نہیں ہم لوگوں کو سننا چاہئے، دیکھیں کہتا کیا ہے۔

انٹونیو۔ دوستو! میں قیصر کا مرثیہ پڑھنے نہیں بلکہ اس کی نعش کو دفن کرنے اور اس کے مردہ جسم کو سپرد خاک کرنے کے لئے آیا ہوں۔

ہر شخص اپنی زندگی میں اچھے اور برے کردار کا مالک ہوتا ہے، اس کے اعمال حسنہ تو اس کی موت کے ساتھ مٹ جاتے ہیں لیکن اس کے اعمال سیئہ قیامت تک باقی رہتے ہیں قیصر بھی انسان تھا اس کے بھی حسنات وسئیات کا یہی حشر ہونا تھا اور ہوا۔

براوران قوم! اگر بروٹس مجھے اسٹیج پر آنے اور کچھ عرض کرنے کا حکم نہ دیتا تو اس وقت میں ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہ نکالتا، اس نے مجھکو حکم دیا، میں نے اس کی اطاعت کی اور اس کے فرمان والاشان کے سامنے سر تسلیم و انقیاد خم کر دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ ایک شریف ولائق عزت شخص ہے۔

برادران! معزز دوست بروٹس نے کہا کہ قیصر ایک طماع و حریص شخص تھا۔ میں اس کی مخالفت کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ ایک سچا آدمی ہے، جھوٹ نہیں بولتا۔

میں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قیصر قناعت پسند اور بے طمع آدمی تھا کیونکہ محترم بروٹس نے اس کے خلاف اعلان کیا ہے۔ میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ یہی وہ لالچی قیصر تھا جس نے قیدی دشمنوں سے اتنا کثیر زر فدیہ وصول کیا کہ روم کا خزانہ گہر و جواہر سے لبریز ہو گیا اور ملک دولت و ثروت کی اس بارش سے سرسبز و شاداب ہو گیا۔ میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میری ان آنکھوں نے قیصر کو غربا کے فقر و فاقے پر اکثر آنسو بہاتے، گریہ و بکا کرتے، آہیں بھرتے اور نالہ و فغاں کرتے دیکھا ہے، کتنی ہی ایسی راتیں ہیں جنہیں قیصر نے تنگدستوں کی اصلاح حال اور فراہمی معاش کی فکر میں آنکھوں میں کاٹ ڈالا ہے۔

میں نے خود کئی دفعہ "لوپر کال" میں تاج و تخت قیصر کی خدمت میں پیش کیا ہے لیکن اس نے ہمیشہ اس سے اعراض و انکار کیا، اس کو تاج کا شوق نہیں تھا وہ تو خدمت وطن کا بھوکا تھا، اسے عیش و آرام سے الفت نہیں تھی، اس کو تو قوم کی خوشحالی کی خاطر آلام و مصائب کے برداشت کرنے میں لطف آتا تھا۔

بروٹس ایک نہایت ہی معزز شخص ہے، میں کسی حال میں بھی اس کی مخالفت نہیں کر سکتا ورنہ میں تم سے دریافت کرتا کہ کیا حرص و آز کا مسکن ایسا ہی قلب ہو سکتا ہے، کیا ایسے پاکیزہ دل میں، کیا ایسے خدا ترس قلب میں طمع اور لالچ کے لئے کوئی گوشہ ڈھونڈنے سے بھی مل سکتا ہے؟

رومیو! آج سے پہلے قیصر تمہیں دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب تھا تم اس پر نثار ہونے اس کی خاطر اپنا خون بہانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ پھر آج تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے کہ آنسو کا ایک قطرہ بھی تمہاری آنکھوں سے نہیں گرتا۔

اگر تم اس عمدہ صفات، بہتر خصائل اور لائق تعریف شمائل پر نہیں روتے تو نہ روؤ لیکن کم از کم اس کے لئے تو روؤ کہ وہ تم کو محبوب تھا، تم کو پیارا تھا۔ دنیا جہان میں سب سے زیادہ تمہارا چہیتا تھا۔ تم اس لئے روؤ کہ کل یہی وہ شخص تھا جس کی ایک جنبش لب پر بڑے بڑے بہادروں اور سورماؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ جس طرح بجلی کی ایک کڑک سے اس سرے سے لے کر اس سرے تک زمین و آسمان کی ساری فضا لرز جاتی ہے، لیکن آج وہی شخص ہے جو ایک دیوار کے کنارے ذلیل و خوار بے یار و مددگار پڑا ہوا ہے۔ نہ اس کا کوئی نوحہ خواں ہے نہ غمخوار۔ آہ آج اس پر کوئی رونے والا نہیں۔

اے عقل انسانی! آج یہ تجکو کیا ہو گیا ہے؟ تو کیوں انسانوں کے دلوں سے نکل کر وحشی حیوانوں کے سینوں میں سما گئی ہے؟ تو نے اپنا رستہ کیوں کھو دیا؟ تو کیوں گم کردہ راہ ہو گئی؟ تو مبہوت ہو کر رہ گئی ہے۔ تو نے خیر کو شر اور شر کو خیر قرار دے لیا ہے۔ کیا تجھ سے قوت ممیزہ چھین لی گئی؟ کیا تجھے اب صواب و خطا کھوٹے کھرے میں تمیز نہیں رہی؟ کیا جرائم و محاسن کی پہچان

سے تو عاجز ہو گئی؟

رومیو! میری ژولیدہ بیانی و پریشاں گوئی سے اگر تم کو تکلیف ہوتی ہو تو معاف کرنا کہ اس فاجعۂ عظمیٰ وحادثۂ کبریٰ نے میرے دماغ کو منتشر اور قلب کو پراگندہ کر دیا ہے۔

دوستو! میرے پہلو میں ایک ایسا دل ہے جو تمھاری محبت والفت میں سرشار تمھاری خیر اندیشی و نکوکوشی میں غرق، تمھاری فلاح وبہبود کے لئے بیچین اور تمھاری آرام وآسایش کے لئے بیتاب ہے۔ اگر مجھے ڈر نہ ہوتا کہ تمھارے سینے شدت رنج ومحن وکثرت وحزن والم سے پھٹ جائیں گے تو میں کہتا قیصر مظلوم ہے وہ بلا قصور قتل کر دیا گیا۔

بروٹس اور اس کے رفقا ر فخر قوم اور ملک کے سر بر آوردہ فرزند ہیں۔ ان کو مجرم وخطا کار کہنے سے پہلے میرے ضمیر کو، روم کو، اور خود قیصر کی پاک روح کو بڑا دکھ ہو رہا ہے۔

اتنا کہہ کر انٹونیو خاموش ہو گیا اور اس کی چشمہائے پرنم سے آنسوؤں کا سیلاب ابل پڑا۔

انقلاب

ایک۔ (اپنے ہم نشیں کی طرف مخاطب ہو کر) مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ شخص نہایت ہی معقول بات کہہ رہا ہے۔

دوسرا۔ یقیناً، اگر تم ذرا غور کرو تو تم پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ قیصر کا قتل سفاکی و بے رحمی کا بدترین نمونہ اور انتہائی بزدلانہ جرم ہے۔

تیسرا۔ قیصر کے تاج وتخت سے استغنا نے تو میرے دل کو اپنا لیا۔ اس کا یہ فعل کتنا مستحسن اور کس قدر مبارک ہے

چوتھا۔ وہ کیسا نرم دل، رقیق القلب اور رحم صفت تھا کہ مصیبت زدوں اور فاقہ کشوں کی حالت زار پر رنج وغم کے آنسو بہاتا اور جگر کے ٹکڑے کرتا تھا۔

پانچواں۔ فقیروں اور آفت رسیدوں کا ایسا مونس وغمخوار ایسا ہمدرد وغمگسار طماع وظالم نہیں ہو سکتا۔

چھٹا۔ اب تو جناب! قیصر کی خونریزی نے بڑی اہم نازک صورت حال اختیار کر لی۔

ساتواں۔ قاتل سے ضرور انتقام لینا چاہئے۔
آٹھواں۔ (اپنے ہم جلیس کی طرف مخاطب ہو کر) دیکھو انٹونیو کس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا اور نوحہ کرتا ہے۔
نواں۔ روم میں انٹونیو سے بڑھ کر ملک کا کوئی سچا بہی خواہ نہیں۔
انٹونیو۔ کیا آپ لوگ مجھے اس بات کی اجازت دیں گے کہ تھوڑی دیر کے لئے میں یہاں سے ہٹ جاؤں اور اس بیکس و مظلوم میت پر نذر عقیدت کے چند پھول چڑھا آؤں۔
مجمع۔ ضرور۔ ضرور۔
انٹونیو اسٹیج سے اترآیا اور آہستہ آہستہ قیصر کی لاش کے پاس گیا۔ لاش اب تک انھیں کپڑوں میں لپٹی پڑی ہوئی تھی جس میں کہ وہ قتل کی گئی تھی اور خنجر کے زخم لباس کے اندر سے ظاہر ہو رہے تھے۔ انٹونیو نے مجمع کو پکار کر کہا۔
انٹونیو۔ لوگو! یہی وہ قیصر ہے جس کے ابر کرم کی بارش سے تم بارہا سیراب ہو چکے ہو۔ اس کی لاش زخم و خون میں شرابور ہے۔ آؤ اور اپنے آنسوؤں کی جھڑی سے اس کو غسل دو۔ قیصر کی لاش کا رواں رواں نہایت بے کسی و عاجزی کے ساتھ تم سے اس کا مطالبہ کر رہا ہے۔
تم سب لوگ اس لباس کو دیکھتے ہو مگر شاید اس کی تاریخ و اہمیت سے واقف نہیں ہو۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ یہ خون میں لتھڑا ہوا لباس قیصر نے اس شام کو زیب تن کیا تھا جس شام کو قیصر نے وہ شاندار فتحیابی حاصل کی تھی جس پر روم قیامت تک فخر کرے گا۔
(اس موقع پر انٹونیو نے قیصر کی عبا کے ایک شگاف کو نمایاں کیا اور کہا۔)
اسی بڑے سوراخ سے اس فاتح اعظم کے جسم کو چھلنی کیا گیا۔ اسی سوراخ سے ہو کر بروٹس کا خنجر قیصر کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اسی سوراخ سے قیصر کا بے گناہ خون بہایا گیا۔
زخموں نے خنجر کے اس بنائے ہوئے جھروکے سے اپنے قاتل کی خوفناک صورت کو رحم طلب نگاہوں سے دیکھا بلکہ میرا تو خیال ہے کہ قیصر نے بروٹس سے طلب رحم کرنے سے پہلے روم کے ہر ہر فرد کو دادرسی کے لئے آواز دی مگر افسوس صد افسوس کہ کسی نے بھی اس کی دادرسی نہیں کی

اور وہ بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔

قیصر نے پہچان لیا کہ میرا قاتل میرا دوست ہے۔ وہ شخص ہے جس کی گردن اس وقت بھی میری عنایتوں اور نوازشوں، میری کرمفرمائیوں اور مہربانیوں کے بارگراں سے جھکی ہوئی ہے۔

اس خلاف توقع کمینگی و غداری سے اس کی ہمت ٹوٹ گئی، مقابلے کی جرأت نہ رہی، اس جانگداز واقعے نے جتنا کاری اثر اس کے دل پر کیا وہ کسی حیثیت سے اس زخم سے جس نے اس کے لاشے کو ماہی بے آب بنا رہا تھا کم نہ تھا۔ تیغ و خنجر تیر و سناں کا خوفناک منظر اس کے لئے اتنا بھیانک اور ڈراؤنا نہ تھا جتنی کہ خیانت غداری اور بیوفائی کی مکروہ اور نفرت انگیز صورت اسی لئے قیصر کے لبوں پر مہر لگ گئی اور وہ صرف اتنا آخری اور الوداعی مختصر جملہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا کہ

اور تو بھی اے بروٹس؟

قیصر مجسمہ " پامپی " کے نیچے مقتول پایا گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے چہرہ کو اپنی عبا کی آستین سے چھپا لیا تھا تاکہ اس کی روح ناشکر گزاری، احسان فراموشی اور کفران نعمت کے کریہہ و بدمنظر مجسمہ کے دیکھنے سے دوبارہ متنغص، رنجیدہ و غمگین نہ ہو۔

قیصر کی موت کے غم میں زمین و آسمان تاریک ہو گئے ہیں شجر، حجر، بشر سبھی اپنے لختہائے جگر اپنی آنکھوں کی راہ سے بہا رہے ہیں مگر مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہو رہی ہے کہ تمھارے دل نہایت ہی غمگین ہیں اور تمھاری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی ہے۔ میں تم کو مبارکباد دیتا ہوں کہ تم اپنے سیلاب اشک سے سفاکانہ خونریزی و بے رحمانہ قتل و غارت کی وہ خونی علامت و نشانی بہا لے گئے جس سے کہ ظالموں کے ہاتھ نے اس زمین کو ملوث کر دیا تھا۔ تم قیصر کی دریدہ عبا دیکھ کر زار و قطار رو رہے ہو، اگر تم اس کی نعش کے ٹکڑے اور جسم کے شگاف دیکھو تو تمھارا کیا حال ہو۔

داانٹونیو لاش کے قریب آیا اور اس پر سے چادر ہٹا کر مجمع سے یوں مخاطب ہوا،

ہر ہر زخم اپنی زبان حال سے تم سے دادرسی و انصاف کا طالب ہے، غور سے سنو کہ مرثیہ

میں اس سے زیادہ گویائی کی قوت نہیں۔ مرثیے سے جگر پاش و دلگداز واقعہ اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ سننے میں نہیں آسکتا۔

ایک شخص۔ کیا ہی قیامت آفریں منظر ہے۔

دوسرا۔ اے لوگو! قیصر پر رحم اور اس کے ساتھ انصاف کرو۔

تیسرا۔ قیصر کا یوم قتل نہایت ہی شر انگیز دن تھا جس کی چنگاریوں نے روم کی شاندار روایتوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

چوتھا۔ یہ دنا،ت اور سفلہ پن روم کے چہرے پر انتہائی بدنما داغ ہے۔

پانچواں۔ اس خیانت اور غداری نے روم کو دنیا والوں کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔

چھٹا۔ انتقام، انتقام۔

مجمع۔ (سخت اشتعال میں) قاتلوں کو جلا ڈالو، ان کے جسم کے ٹکڑے فضا ر آسمانی میں بکھیر دو، کسی ایک پر بھی ترس نہ کھاؤ۔ یہ رحم کے قابل نہیں۔

انٹونیو۔ ٹھہرو، ٹھہرو۔ میں تمھارے اشتعال سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ملک میں فتنہ و فساد برپا کرنا نہیں چاہتا کہ قاتلوں سے خون کا مطالبہ کر کے وطن کی فضا ر کو تیرہ و تاریک بنا دوں میرا ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ یہ قوم کے بہی خواہ ، ملک کے ہمدرد اور ملک کے معزز افراد ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ قیصر کے قتل کے ان کے نزدیک وہ معقول وجوہ موجود ہوں جن کو ہم نہ جانتے ہوں۔ میرا مطلب تو اس وقت صرف یہ ہے کہ قیصر تم کو دل و جان سے پیار کرتا تھا، اس لئے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ تم اس کا مرثیہ بیان کرو۔ مجلس عزا جماؤ اور اس پر نوحہ کرو۔ اگر مجھکو تمھارے ہاتھ سے عنان صبر کے چھوٹ جانے، تمھارے بے قابو ہو جانے کا خوف نہ ہوتا اور اگر مجھکو ڈر نہ ہوتا کہ تمھارے قلوب غم و الم میں اور رنج و محن میں ڈوب جائیں گے تو میں تمھیں اس فقید عصر کی وصیت سناتا پھر تمھیں معلوم ہو جاتا کہ قیصر کو تم کتنے زیادہ محبوب تھے، وہ تمھارا کتنا جان نثار و فدا کار سردار تھا اور وہ ہرگز اس لائق نہ تھا کہ وہ تمھارے سامنے اس بیدردی سے قتل کر دیا جائے۔ درانحالیکہ تمھاری

آنکھیں دیکھتی ہوں اور تمھاری رگوں میں خون کی گردش ودوادوش ہو۔

مجمع۔ وصیت ضرور سنائیے۔

انٹونیو۔ مجھے ڈر ہے کہیں تمھارے سینے اس شہید اعظم کے قتل پر شدت حزن والم سے شق نہ ہو جائیں۔

مجمع۔ نہیں ہم وصیت ضرور سنیں گے۔

انٹونیو۔ قیصر نے وصیت کی ہے کہ رومی قوم کے ہر ہر فرد کو میرے خزانۂ خاص سے ۵،
فرنک دئے جائیں اور تمام رومی قوم کے لئے میرے تمام باغات اور تفریح گاہیں وقف ہیں۔

ایک شخص۔ قیصر کیا ہی فیاض طبع وغریب پرور آدمی تھا۔

دوسرا۔ کیا ہی شریف وکریم تھا۔

تیسرا۔ قاتل تباہ وبرباد ہیں۔

چوتھا۔ انتقام! انتقام!!

پانچواں۔ ہم بروٹس کا گھر جلا کر رہیں گے۔

اس کے بعد طوفانی مجمع سڑکوں پر لہریں مارتا ہوا نظر آنے لگا۔ ٹھیک اس طرح جس طرح
زخار سمندر میں موجیں بل کھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

انٹونیو (تنہا اپنی جگہ پر) اے تاریک شر! اے بھیانک فتنہ! میں نے ہی تجھکو تیری
خوابگاہ سے اٹھایا ہے۔ بس تو جا اور اپنا کام کر۔ تو مشتعل ہو جا اور سقف آسمان اور فرش زمین کو
جلا کر خاک سیاہ کر دے۔

دیکھو یہ کس قدر عبرتناک منظر ہے کہ رومی قوم نے ابھی قیصر کی غلامی سے پورے طور پر
نجات بھی نہیں پائی تھی کہ انٹونیو نے اپنے دام عبودیت میں ان کو جکڑ دیا۔ جاہل وغلام ملک
کی یہی حالت ہوتی ہے یا تو وہ صاحب تاج وتخت کے زیر نگیں ہوتا ہے یا کسی جادو بیاں خطیب کے
دامن سحر کا شکار۔ (ترجمہ)

غربت

بوڑھا سیمون عرف لال بھکڑ اور ایک نوجوان تاتاری جس کا کوئی نام تک نہیں جانتا تھا، دریا کے کنارے الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔ باقی تین ملّاح جھونپڑی کے اندر تھے۔ سیمون کوئی ساٹھ سال کا دُبلا پتلا، پوپلا آدمی تھا۔ اُس کے شانے چوڑے چکلے تھے۔ اور چہرے سے ابھی صحت کے آثار ٹپکتے تھے۔ اِس وقت وہ نشے کی ترنگ میں تھا۔ اُس کی جیب میں شراب کی بوتل تھی۔ اور دِل میں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کہ کہیں میرے ساتھی اس میں سے حصّہ نہ مانگ بیٹھیں۔ یہ نہ ہوتا تو وہ کبھی کا سو جاتا۔ تاتاری بیمار، اور تھکا ماندہ، پھٹے پُرانے چیتھڑے بدن سے لپیٹے، صوبہ سمبرسک کی مزے دار زندگی اور اپنی بیوی کے حُسن وجمال، فہم وفراست کی داستان بیان کر رہا تھا۔ اس کی زیادہ سے زیادہ عمر پچیس ۲۵ سال ہوگی۔ مگر الاؤ کی روشنی میں اُس کے زرد بیمار اور مغموم چہرے کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا۔ کہ ابھی لڑکا سا ہے۔

لال بھکڑ بولا "بھئی یہ جگہ کچھ جنّت تو ہے نہیں۔ تم خود ہی دیکھتے ہو۔ کہ سوائے پانی اور دریا کے چٹیل کناروں، اور لیسدار مٹی کے کچھ بھی نہیں۔ جاڑا ہو چکنے کو آیا۔ دریا میں برف بہ کر آ رہی ہے۔ آج سویرے بھی تھی "

تاتاری نے کہا، مصیبت ہے مصیبت! اور گھبرا کر چاروں طرف نظر ڈالی۔

دس قدم کے فاصلے پر ٹھنڈا برف کا سیاہ دریا بہ رہا تھا جھلّاتا تھا، کھوکھلے ریتیلے ساحل سے ٹکراتا تھا اور کہیں دور سمندر کی طرف تیزی سے بہتا چلا جا رہا تھا، کنارے سے ملی ہوئی ایک بڑی ناؤ کی سیاہ پرچھائیں نظر آتی تھی۔ بہت دور دریا کے اُس پار، روشنیاں کبھی دھندلی ہو جاتی تھیں۔ کبھی جھلملانے لگتی تھیں۔ اور چھوٹے چھوٹے سانپوں کی طرح بل کھاتی تھیں۔ یہ پچھلے سال کی گھاس تھی جو جلائی جا رہی تھی ان سینوٹیوں کے پیچھے پھر اندھیرا تھا۔ ہوا مرطوب اور سرد تھی۔

طرف اُسی قدر اندھیرا تھا۔ لیکن یہاں کسی بات کی کمی محسوس ہوتی تھی، صوبہ سمبرسک میں تارے یہاں سے بالکل مختلف تھے۔ اور آسمان بھی دوسرا تھا۔

تاتاری نے پھر کہا۔ "مصیبت ہے مصیبت"

سیموں ہنسا، رفتہ رفتہ طبیعت مانوس ہو جائیگی، ابھی پکّے ہو..... منہ سے ابھی دودھ بُو آتی ہے۔ اپنی نادانی سے سمجھتے ہو کہ مجھ سے زیادہ بُرا حال کسی کا نہیں۔ کوئی دن جاتا ہے۔ اپنے دل میں کہو گے، خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے! مجھے دیکھو۔ ہفتہ بھر میں پانی اُتر جائیگا۔ ڈونگے چلنے لگیں گے۔ تم سب سائبیریا کا راستہ لوگے، میں یہاں پڑا اِس کنارے سے اُس کنارے، اُس کنارے سے اِس کنارے کشتی کھیتا رہ جاؤں گا۔ بائیس سال سے میرا دن رات یہی کام ہے۔ پانی کے تلے مچھلیاں، پانی کے اوپر میں، پھر بھی شکر ہے کہ مجھے کسی بات کی شکایت نہیں۔ خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے!

تاتاری نے آگ میں کچھ خشک ٹہنیاں جھونکیں اور شعلوں کے قریب سکڑ کر بیٹھ گیا اور بولا میرے والد ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔ میری ماں اور بیوی وعدہ کر چکی ہیں، کہ اُن کے مرنے کے بعد یہاں آجائیں گی۔

لال جھکڑ نے پوچھا ماں اور بیوی کو لے کر کیا کروگے؟ ارے میاں اس حماقت میں نہ پڑو۔ شیطان ملعون تم کو بہکا رہا ہے۔ اُس مردود کی ایک نہ سنو! اُس کے دم میں ہرگز نہ آؤ۔ اگر وہ عورتوں کا ذکر چھیڑ کے ورغلائے۔ تو اُسے جلانے کے لئے کہ دو، مجھے اُن کی کوئی ضرورت نہیں۔ آزادی کے بہانے اکسائے تو اُس کا مردوں کی طرح مقابلہ کرو۔ اور کہ دو مجھے نہیں چاہیئے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بیوی، نہ آزادی، نہ ڈاک، نہ کھیت کھلیان، خدا ان سب کا ستیاناس کرے۔ مجھے اِن میں سے کچھ نہیں چاہیئے۔

لال جھکڑ نے اپنی بوتل میں سے ایک گھونٹ لیا۔ اور پھر بولنا شروع کیا: "میں معمولی

ٹرسک میں رہتا تھا۔ ایک زمانے میں مَیں بھی فراک کوٹ ڈاٹا کرتا تھا۔ مگر میں نے اپنا یہ حال بنا لیا ہے کہ زمین پر ننگا سو سکتا ہوں۔ اور ضرورت پڑے تو جڑی بوٹی پر گذارہ کرنے کو تیار ہوں۔ خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے! نہ منہ سے کچھ مانگتا ہوں۔ نہ دل میں کسی سے دبتا ہوں۔ اپنے سے زیادہ شاد اور آزاد کسی کو نہیں سمجھتا جس دن سے روس سے یہاں بھاگ آیا، میں نے دل کڑا کر کے ٹھان لی: مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ شیطان نے مجھے بھی بیوی، گھر، آزادی کا دم دے دے کر پھسلانا چاہا۔ میں نے اُس سے صاف کہدیا، مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ اور اپنے خیال پر جما رہا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کتنے مزے میں ہوں۔ کسی بات کی مطلق شکایت نہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ جو ذرا سا شیطان کے پھیر میں آیا۔ اور اس کا فیصلہ ہوا۔ پھر بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ چند یا تک دَل دَل میں دھنس جائیگا۔ اور نکالے نہیں نکلے گا۔

تم دہقان لوگ ہی شیطان کی چالوں میں نہیں آتے۔ خاندانی پڑھے لکھے لوگ بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ کوئی پندرہ سال کا ذکر ہے کہ ایک شخص روس سے جلاوطن ہو کر یہاں پہنچا۔ بھائیوں میں جائیداد کی تقسیم اور جعلی وصیت کا کچھ جھگڑا تھا، لوگ سمجھے کہ ہو نہ ہو یہ ضرور کوئی شہزادہ یا جاگیردار ہے، یہ بھی ممکن ہے۔ صرف معمولی سرکاری ملازم ہو۔ کسی کو کیا معلوم؟ خیر، تو وہ صاحب یہاں تشریف لائے۔ اور آنے کے ساتھ ہی انہوں نے ایک مکان اور کچھ زمین خرید لی۔ فرمانے لگے "میں خود روزی کما کر کھاؤنگا۔ اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی پر گذارا کروں گا۔ میں اب رئیس نہیں رہا۔ معمولی جلاوطن ہوں" میں نے سنکر کہا ارادہ تو بہت ٹھیک ہے!

وہ اس وقت نوجوان تھا۔ مزاج میں دوڑ دھوپ کے ساتھ احتیاط کا مادہ بھی تھا۔ خود گھاس کاٹتا اور مچھلیاں پکڑتا، گھوڑے پر ساٹھ میل کی سواری اس کے لئے معمولی بات تھی، مگر آگے چل کر یہ نقشہ بدل گیا پہلے ہی سال گھوڑے پر چڑھ کر ڈاک لینے گائی رینو آنے جانے لگا۔ میری کشتی میں کھڑا ہو جاتا۔ وہ ٹھنڈا سانس کھینچ کر کہتا۔ کیوں، شمیوں گھر والوں نے کتنے عرصہ سے خرچ نہیں بھیجا! میں، کہتا۔ وسیلائی سرگے یوچ، روپے کی تمہیں ضرورت نہیں، روپیہ لے کر کیا کرو گے؟ اگلے زمانے کو بھلا دو جیسے کبھی تھا ہی [illegible] تو محض ایک خواب تھا۔ نئے سرے سے زندگی شروع

کرو۔ شیطان کی گھاتوں میں نہ آؤ! اِس کا انجام بُرا ہوگا۔ اُس کے جال میں پھنس جاؤ گے۔ ابھی تو صرف روپیہ چاہتے ہو، تھوڑے دنوں میں کچھ اور چاہو گے۔ پھر کچھ اور، پھر کچھ اور...... خوش رہنے کی ترکیب یہ ہے۔ کہ کسی چیز کی خواہش نہ کرو... اگر تقدیر نے ہم پر تم پر زیادتی کی تو اُس کے آگے ہاتھ پھیلانے اور سر جھکانے سے فائدہ؟ چاہئے یہ کہ اُسے ٹھکراؤ، اس کا مذاق اُڑاؤ، نہیں تو وہ تمہارا مذاق اُڑائے گا، میں اسے یہ مشورہ دیتا رہا.......

اِس کے دو سال بعد مجھے اُسے دریا کے اُس پار اُتارنے کا اتفاق ہوا۔ خوشی کے مارے پھُولا نہیں سماتا تھا۔ کہنے لگا، اپنی بیوی کو لینے گائی رنیو جا رہا ہوں، آخر اُس کا دل پسیج گیا۔ اور وہ یہاں آنے پر رضامند ہوگئی۔ کتنی نیک اور مہربان ہے! اُس کی باچھیں کھلی جاتی تھیں، دوسرے دِن وہ بیوی سمیت واپس ہوا۔ وہ سر پر ٹوپی لگائے ایک نوجوان بانکی عورت تھی، گود میں ایک دودھ پیتی بچّی تھی، اور منوں نے مختلف قسم کا مال اسباب، سر گئے یو پچ صاحب اُس کا طواف کر رہے تھے۔ کیا مجال ہے جو آنکھیں دم بھر کو بیوی کے چہرے سے اُٹھ جائیں، اُس کی تعریف میں اُن کا منہ سوکھتا تھا۔ مجھ سے فرمانے لگے، ہاں بھائی سمیوں، لوگ سائبیریا میں بھی لطف سے زندگی بسر کر سکتے ہیں! میں نے دِل میں کہا، یہ چند دن کی بہار ہے، رت بدلتے دیر نہیں لگتی، اُس دن سے ہر ہفتہ اس کا معمول بندھ گیا، کہ ڈاک خانہ جا کر پوچھے کہ گھر سے روپیہ تو نہیں آیا۔

ایک دِن مجھ سے کہا، میری خاطر وہ اپنا حُسن، اپنی جوانی سائبیریا میں گنوا رہی ہے اور میرے ساتھ کڑیاں جھیل رہی ہے، لہٰذا مجھ پر واجب ہے، کہ اُس کے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھوں، بیگم صاحبہ کا جی بہلانے کے لئے اُس نے مقامی افسروں اور اہل خیر اسب سے راہ و رسم پیدا کی، پھر لازم ہوا اِس لشکر کی خاطر تواضع کا بندوبست ہو، ضروری سمجھا گیا کہ ایک پیانو خریدا جائے۔ اور صوفا پر ایک بالوں والا گدو کا کتا ہو۔ غارت ہو کم بخت! الغرض، ہر طرح کے ٹھاٹ، بلکہ عیاشی ہونے لگی، اِس پر بھی وہ نک چڑھی بیگم زیادہ عرصہ تک اُس کے پاس نہ ٹکیں۔ اور ٹکیں بھی کیوں؟ کیچڑ اور پانی، کڑاکے کی سردی، نہ پھل نہ پھلواری، بوڑھوں کو دیکھو

تو جاہل، شرابی، جنہیں نہ اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ، نہ بات کرنے کا ڈھنگ۔ اور وہ ٹھیریں ماشاءاللہ پیٹرزبرگ یا ماسکو کی مزاج دار خاتون۔۔۔ یہاں اُن کے لئے کھیاں مارنے کے علاوہ کیا دھرا تھا، اِس پر طرہ یہ کہ خاوند کی حیثیت بھی پہلے سے گر گئی تھی، ایک بیچارے جلا وطن کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے۔

اِس کے تین سال بعد کا ذکر ہے، مجھے خوب یاد ہے۔ کہ لیلتہ القدر کی شام کو پرے کنارے سے کسی نے زور سے پکارا، میں ناؤ اُدھر لے کر پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہی بیگم صاحبہ کانوں تک اوڑھنی لپیٹے کھڑی ہیں، اور پہلو میں ایک نوجوان افسر ہے۔ ایک ٹکڑی ساتھ کھڑی ہے۔۔۔ میں نے انہیں پار اتار دیا، وہ گاڑی میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا، ہوا ہو گئے، اگلے دن علی الصباح گھوڑا اُڑاتے وسیلائی سرگے یوچ صاحب گھاٹ پر نمودار ہوئے۔ پوچھنے لگے، "تمہیں میری بیوی تو کسی عینک والے آدمی کے ساتھ پار نہیں گئی؟ میں نے جواب دیا، "جی ہاں" آپ میدانوں میں جاکر ہوا پکڑیں مارئیے! اس نے ان کے پیچھے سرپٹ گھوڑا ڈال دیا، دن رات پانچ روز تک اُن کا تعاقب جاری رکھا۔ واپسی پر جب میں اسے پار اتار رہا تھا۔ تو وہ بے دم ہو کر میری کشتی میں ڈھیر ہو گیا۔ اور اپنا سر تختوں پر پٹختا اور چیخیں مار مار کے روتا رہا۔ میں نے کہا "تو یہ معاملہ ہے" ہنس کر اسے یاد دلایا کہ "لوگ سائبیریا میں بھی لطف سے زندگی بسر کر سکتے ہیں!" وہ اپنا سر اور زور سے پیٹنے لگا۔

اِس کے بعد آزادی کی ہوس اُس کے دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اُس کی بیوی فرار ہو کر، روس پہنچ چکی تھی، اُس کے دل میں ہوک اٹھی کہ جاکر اُسے عاشق کے پنجے سے چھڑاؤں، میاں! اُس دن سے وہ مارا مارا صبح شام گھوڑا دوڑائے پھرنے لگا، کبھی ڈاک خانہ ہے، تو کبھی کیمان کا دفتر، عرضیوں کا تانتا باندھ دیا۔ کہ میرے حال پر رحم کیا جائے۔ اور روس واپس جانے کی اجازت دیدی جائے۔ زمین بیچ ڈالی مکان یہودیوں کے ہاتھ رہن کر دیا۔ بال سفید ہو گئے۔ کمر جھک گئی۔ چہرہ دق کے ماروں کی طرح زرد پڑ گیا۔ بھلا چنگا ایکا ایکی

کمی کمی کرنے لگتا ۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر لاتا ۔ اس طرح آٹھ سال تک عرضیوں کا تار باندھ رکھا۔ مگر اب پھر اُس کی جان میں جان آ گئی ہے ۔ کیوں نہ ہو خیر سے بیٹی کے سیانے ہونے سے ایک نیا بہلاوا ہاتھ لگ گیا ہے ۔ وہ اسے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتا ہے ۔ اور آنکھ کی پتلی کی طرح رکھتا ہے ۔ یہ ضرور ہے ۔ کہ لڑکی میں کسی قسم کا عیب نہیں ، اچھی شکل ، کالی کالی بھویں ، مزاج میں شوخی ، ہر اتوار کو اسے ساتھ لے کر گرجا جاتا تھا۔ دونوں کشتی میں پاس پاس کھڑے ہو جاتے ، لڑکی مسکراتی ، اور باپ کی نظریں بیٹی کے مکھڑے سے پل بھر کو اُٹھنے کا نام نہ لیتیں۔

کہتا ، ہاں ، میوں ، سائبیریا میں بھی زندگی لطف سے بسر ہو سکتی ہے ، سائبیریا میں بھی انسان خوش رہ سکتا ہے ۔ میری بیٹی کو دیکھو ، ماشاء اللہ کتنی پیاری ہے ! میں شرط لگاتا ہوں کہ اتنی پیاری لڑکی تم چراغ لے کر ڈھونڈو تب بھی نہیں پا سکتے ، میں جواب دیتا ، بے شک تم ٹھیک کہتے ہو ، تمہاری لڑکی میں کوئی خرابی نہیں ، اور اپنے دل میں کہتا ، ذرا صبر کرو...... اس کی اٹھتی جوانی ہے ۔ خون میں اُبال ہے ، جی میں مرادیں ہیں ، یہاں بھلا راگ رنگ کہاں ! اور میاں ، لڑکی سچ مچ گھلنے لگی ، سوکھتی گئی ، سوکھتی گئی ، اور ایڑیاں رگڑ رگڑ رینگ رہی ہے ، دق ، ......

دیکھ لی آپ نے سائبیریا کی خوشی ، لعنت ہو کم بخت پر ، یہاں زندگی اس طور سے بسر ہوتی ہے ..... خیر تو اب ڈاکٹروں کی ڈھونڈ مچی ، ایک کو چھوڑا ، دوسرے کو پکڑا ۔ آج ابھی دکھا ، کل اُسے ، جہاں کسی ڈاکٹر یا جادوگر کا پتہ چلا اور اسے لینے پہنچا ، ڈاکٹروں کے پیچھے ہزاروں روپیہ برباد کر دیا ۔ میرے نزدیک تو بہتر ہوتا ، کہ یہ روپیہ شراب میں اُڑا دیتا ، لڑکی تو مر کر رہیگی ، اب کسی کے بچائے نہیں بچتی ، پھر اس کی کمر ٹوٹ جائیگی ، اور اس کا یقین رکھو کہ یا تو صدمے سے خودکشی کرے گا ۔ یا روس بھاگ جائے گا ، فرار ہوگا ، پکڑا جائے گا ، مقدمہ چلے گا ، سزا ہوگی ،

تاتاری نے جو سردی میں سکڑا بیٹھا تھا بڑبڑا کر کہا ، اچھا ہے ، اچھا ہے ، اچھا جا کیا ...

اُس کی بیوی، اُس کی بیٹی ... اس کے مقابلہ میں قید کی، صدمے کی کیا حقیقت ہے!
اپنی بیوی، اپنی بیٹی کی شکل تو دیکھنے کو مل گئی۔... تم کہتے ہو، کچھ نہ مانگو، یہ بہوت بُری، اس کی بیوی تین سال تک اُس کے ساتھ رہی، یہ پروردگار کی دین تھی، بہوت بُری، تین سال اچھے، کچھ سمجھے بھی؟

سروی سے اٹک اٹک کے اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے روسی لفظ سوچ سوچ کر اُسے فقر گنتی کے روسی لفظ آتے تھے، تاتاری نے کہنا شروع کیا، کہ خدا وہ گھڑی نہ لائے، کہ کوئی بیمار پڑے اور پردیس میں جان دے، اور ٹھنڈی، کالی زمین میں گاڑا جائے، میری بیوی میرے پاس دِن بھر نہ سہی، گھنٹہ بھر کو آجائے، تو اس نعمت کے بدلے میں ہر طرح کا دُکھ درد سہ لوں گا، اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گا، خوشی کا ایک دن بہوت سے اچھا،

وہ پھر اپنی حسین و ذہین بیوی کی حکایت لے بیٹھا، پھر اُس نے اپنا سر ہاتھوں میں پکڑ لیا، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، سمیوں کو اس نے یقین دلایا، کہ میں بے گناہ ہوں، اور مفت میں مصیبت بھگت رہا ہوں، میرے دو بھائیوں اور چچا نے مل کر اُس کسان کے گھوڑے پار صاف کیا تھا، اور انہی نے گھوڑے والے کو مار مار کے ادھ موا کیا تھا، پنچایت نے انصاف سے کام نہیں لیا، بلکہ کچھ ایسی کاری گری کی، کہ ہم بھائیوں کو کالا پانی ہوگیا، اور ہمارا پیسے والا چچا صاف چھٹ گیا۔

سمیوں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا، کچھ دنوں میں خود بخود جی لگ جائے گا،

تاتاری دم بخود بیٹھا اپنی اشک آلود آنکھوں سے آگ کی طرف دیکھتا رہا۔ چہرے سے حیرانی اور تردد پڑا ٹپکتا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیوں گھر سے اتنی دور اِس تاریکی اور نمی میں انجان لوگوں کی صحبت میں پڑا سڑ رہا ہوں،

لال بھبکڑ آگ کے قریب لیٹے لیٹے کسی بات کا دھیان کرکے آپ ہی آپ ہنسا، اور دھیمی سلیقے ایک دُھن گنگنانے لگا۔

تھوڑی دیر میں بولا۔ لڑکی کے لئے باپ کی صحبت میں کیا لطف ؟ یہ ضرور ہے کہ وہ اسے دِل و جان سے چاہتا ہے۔ مگر، بھائی، اس کے سامنے انسان کو اپنے مشش۔ تی کا خیال رکھنا پڑتا ہے، بڈھا مزاج کا سخت اور چڑچڑا ہے، جوان لڑکیوں کو بھلا سختی سے کیا سروکار ؟ انہیں تو چاؤ چونچلے چاہئیں۔ اور ہا ہا! ہو ہو ہو! عطر چاہیئے۔ اور غازہ چاہیئے۔ جی ہاں... آہ زندگی زندگی، سیموں نے وقت کے ساتھ اُٹھتے ہوئے ایک آہ کھینچی۔ شراب ختم۔ معلوم ہوتا ہے۔ سونے کا وقت آپہنچا۔ بھاں، میاں تو چلا.....،

تاتاری اکیلا رہ گیا، تو اس نے الاؤ میں کچھ اور ٹہنیاں ڈالیں۔ لیٹ رہا۔ اور شعلوں پر ٹکٹکی باندھ کر اپنی بیوی کے تصور میں ڈوب گیا۔ مہینہ بھر، دِن بھر کو وہ میرے پاس آجائے۔ خواہ جی چاہے تو پھر چلی جائے۔ ایک مہینہ یا ایک دِن سدا کی محرومی سے بہتر ہے۔ اچھا، فرض کرو، اس نے اپنے وعدہ کو پورا کیا۔ اور وہ آبھی گئی۔ آخر کھائیگی تو کیا کھائیگی ؟ رہیگی تو کہاں رہیگی! سوچتے سوچتے اُس کی زبان سے نکلا، کھانے کو کچھ نہوا، تو رہیگی کیونکر ؟

دِن رات چپو چلانے پر بھی کُلّہم دس کوپک اُس کے پلے پڑتے تھے، یہ سچ ہے کہ سواریاں شراب یا چائے کے لئے کچھ بخشش دے دیتی تھیں۔ وہ دوسرے ملاح آپس میں بانٹ لیتے تھے، اور نہ صرف بیچارے تاتاری کو سوکھا ٹرخاتے تھے، بلکہ اُس کا اُلٹا مذاق اُڑاتے تھے، خرچ کی تنگی کی وجہ سے وہ بھوک، سردی اور وحشت کا شکار تھا..

اب کہ وہ سردی کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا، اور اُس کا جوڑ جوڑ ٹوٹا جاتا تھا۔ چاہئے تھا کہ وہ جھونپڑی میں جا کر پڑ رہتا، اور سو جاتا، مگر وہاں اس کے پاس اوڑھنے کو کوئی چیز نہ تھی، اور اندر سردی باہر سے بھی زیادہ تھی، ساحل پر بھی اگرچہ اوڑھنے کو کچھ نہ تھا، مگر کم از کم آگ تو دہکا سکتا تھا۔

ہفتہ بھر میں پانی اتر جائیگا۔ اور چھوٹے ڈونگے چلنے لگیں گے۔ اور سوائے سیموں کے کسی ملاح کی ضرورت نہیں رہیگی۔ تب تاتاری گاؤں گاؤں روزگار ڈھونڈتا اور بھیک مانگتا پھریگا

اس کی بیوی صرف سترہ سال کی تھی، خوب صورت، نازک مزاج، شرمیلی، کیا وہ بھی شرم وحیا چھوڑ، نقاب الٹ در بدر جھولی لئے پھرے گی؟ نہیں اس کے خیال ہی سے اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے...

پو پھٹ رہی تھی، کشتی، پانی میں بید مجنوں کی جھاڑیاں، دریا کی لہریں صاف چمکنے لگی تھیں پلٹ کر دیکھنے سے ترچھی ریتلی ڈھال نظر آتی تھی، اس کے دامن میں چھپر کی جھونپڑی تھی، ذرا اوپر گاؤں کی جھونپڑیاں پاس پاس پڑی تھیں، گاؤں میں مرغ بانگ دینے لگے تھے۔

تاتاری سوچنے لگا، کہ یہ سرخ ریتلی ڈھال، کشتی، دریا، اجنبی کھردرے لوگ، بھوک، پیاس، بیماری، شاید یہ سب مایا ہو، بلکہ بعید نہیں کہ یہ سب کچھ صرف خواب نکلے، اُسے ایسا معلوم ہوا، کہ میں سو رہا ہوں، اور اپنے خراٹوں کی آواز میرے کان میں آ رہی ہے.... وہ اپنے وطن سمبرسک میں ہے، اُس نے اپنی بیوی کو نام لیکر پکارا، اور وہ بولی؛ دوسرے کمرے میں اس کی ماں ہے۔ لوگ کیسے کیسے ڈراؤنے خواب دیکھتے ہیں! خواب آخر آتے کیوں ہیں؟ تاتاری نے مسکرا کر آنکھیں کھولیں۔ یہ کون سا دریا ہے؟ والگا؟

برف پڑ رہی تھی

"کشتی"! دریا کے دوسرے کنارے پر کوئی شخص چیخ رہا تھا "کشتی"!

تاتاری چونک کر اٹھ بیٹھا اور دوسری طرف جانے کے لئے اپنے ساتھیوں کو جگانے لگا، روا روی میں چھٹی پرانی بیٹر کی کھالیں پہن، اپنی بھاری نیند بھری آواز میں گالیاں دیتے سردی سے ٹھٹھرتے ملاح گھاٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ کچی نیند سے اٹھ کر دریا کی تیز ہوا اُن کے بدن کے پار ہوئی جاتی تھی، آہستہ آہستہ سب اچھل کر کشتی میں سوار ہوئے۔... تاتاری اور تین اور ملاحوں نے بڑے بڑے، چوڑے پھل کے پتوار سنبھالے جو اندھیرے میں کیکڑوں کے پنجے معلوم ہوتے تھے، سمیوں پیٹ کے بل پتوار کے پیرم کے سہارے لیٹ گیا، دوسرے کنارے سے چیخنے کی آواز بدستور آ رہی تھی، دو مرتبہ تمنچہ شاید اس خیال سے چلایا گیا۔ کہ ممکن ہے ملاح

سو رہے ہوں، یا گاؤں کے شراب خانے میں گئے ہوتے ہوں،

سن لیا" آخر ایسی کیا گھبراہٹ ہے؟ لال بجھکڑ کے لہجے سے ٹپکتا تھا، کہ اس میں جلدی کرنا فضول ہے، یا کم از کم جلدی کا کوئی نتیجہ نہیں"

لمبی چوڑی، بھدی ناؤ کنارے سے روانہ ہوئی، اور بید مجنوں کی جھاڑیوں میں سے ہو کر چلنے لگی، درخت چلتے نظر آتے تھے۔ اور صرف اسی بات سے اندازہ ہوتا تھا، کہ کشتی ساکن نہیں، بلکہ حرکت میں ہے، ملاح پیچھے تلے ہاتھوں سے چپو چلا رہے تھے، لال بجھکڑ پیٹ کے بل کمان کی شکل لیٹا تھا، کبھی اس طرف کو لڑھک جاتا کبھی اس طرف کو، اندھیرے میں یہ معلوم ہوتا تھا، کہ ملاح کسی باوا آدم کے وقت کے لمبے لمبے پنجوں والے دقیانوسی جانور کی پشت پر بیٹھے ایک برفانی لق و دق ملک میں سے چلے جا رہے ہیں، ایک ایسے ملک میں جو کبھی کبھی ڈراؤنے خواب میں دکھائی دیتا ہے، ناؤ بید مجنوں کی جھاڑیوں سے نکل کر کھلے دریا پر بہنے لگی، چپوؤں کے برابر برابر چلنے کی آواز دریا کے دوسرے کنارے پر سنائی دیتی تھی، کوئی شخص چلاتے جاتا تھا۔ جلدی کرو! جلدی کرو!

دس منٹ کے بعد ناؤ زور سے گھاٹ سے جا کر ٹکرائی،

سمیوں اپنے منہ سے برف پونچھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "برف کی بوچھاڑ ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آتی، خدا جانے اتنی برف کہاں سے نازل ہوتی ہے،

کنارے پر ایک میانہ قد و قامت کا مختصر سا آدمی لومڑی کی کھال کا چھوٹا کوٹ پہنے سفید بھیڑ کی کھال کی ٹوپی اوڑھے بے حس و حرکت اپنے گھوڑے سے الگ ہٹ کر کھڑا تھا۔ غم واندوہ اور از خود رفتگی اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ گویا کوئی بھولی بسری بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اپنے ناقص حافظہ پر دانت پیس رہا ہے، سمیوں اس کے قریب پہنچا اور مسکرا کر ٹوپی اتاری، اس نے کہا مجھے انستاسائیفسکا جانے کی جلدی ہے، میری لڑکی کی حالت پھر خراب ہو گئی، سنا ہے کہ وہاں کوئی نیا ڈاکٹر آیا ہے۔

گاڑی نالہ میں دھکیلی گئی، اور ملاحوں نے اسے بہاؤ کے خلاف کھینا شروع کیا۔ وہ شخص جسے سیموں نے ویسیلائی سرگے یوچ کے نام سے پکارا تھا بالکل ساکت کھڑا اپنے موٹے موٹے ہونٹ دبائے ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہا۔ کوچوان نے اُس سے سگریٹ پینے کی اجازت مانگی تو اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔ سیموں نے اُس کی طرف طنز کی نظر سے دیکھا۔ اور کہا جی ہاں، سائبیریا میں بھی لوگ لطف سے زندگی بسر کرسکتے ہیں، لطف سے! 'لال بھبکڑ' کے چہرے پر فاتحانہ رنگ جھلک رہا تھا، جیسے اس نے کوئی بات ثابت کردی، اور اسے خوشی ہے کہ میری پیشین گوئی پوری ہو کے رہی، صاف ظاہر تھا کہ وہ ویسیلائی سرگے یوچ کی غمزدہ بے بسی سے بہت لطف اٹھا رہا ہے،

جب گھوڑے ساحل پر پہنچ کر جوتے جانے لگے، تو اُس نے کہا، ویسیلائی سرگے یوچ، اس موسم میں آپ کو بہت کیچڑ ملے گی، آپ کو چاہئے تھا، کہ ابھی زمین کے سوکھنے تک توقف کرتے، یا سرے سے سفر کا خیال ہی دل سے نکال دیتے، سفر سے کچھ حاصل ہو، تب بھی ایک بات ہے۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ سالہا سال سے دن رات اِدھر سے اُدھر حیران و پریشان مارے مارے پھرتے ہیں، ایمان کی بات تو یہ ہے، کہ اس دوڑ دھوپ کا نتیجہ خاک نہیں نکلتا۔

ویسیلائی سرگے یوچ چپ چاپ اسے انعام دیکر گاڑی میں بیٹھا، اور روانہ ہوگیا، سیموں نے سردی سے سکڑ کر کہا، پھر وہی ڈاکٹر کی تلاش! گویا معقول ڈاکٹر کا ملنا اتنا ہی آسان ہے، جتنا میدان کی ہوا کا، یا شیطان ملعون کی دُم کا ہاتھ آنا! عجب آدمی ہے، خدایا، مجھ گناہ گار کو معاف کر!

تاتاری، 'لال بھبکڑ' کے قریب پہنچا، اور تھوڑی دیر تک اُسے نفرت اور بیزاری کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر سردی سے تھرتھراتے ہوئے اپنی ٹوٹی پھوٹی روسی میں تاتاری الفاظ گڈمڈ کرکے اُس نے کہنا شروع کیا، وہ نیک ہیں، نیک، اور تم بُرے ہو، تم بُرے ہو! ان کی رُوح پاک ہے اور تم حیوان ہو، پلید! وہ زندہ ہیں اور تم ایک مُردہ لاش ہو۔ خدا نے انسان کو

اس لئے بنایا ہے۔ کہ دُکھ سُکھ سہے، تمہارے دِل میں کوئی خواہش نہیں تم بے جان ہو... تم پتھر ہو، مٹی کا ڈھیر ہو!

اللہ میاں تمہیں نہیں چاہتا، اُنہیں چاہتا ہے!

ملاح ہنسنے لگے، تاتاری کی پیشانی پر حقارت سے بل آگیا۔ ہاتھ کے ایک جھٹکے سے اُس نے اپنے پھٹے پُرانے چیتھڑے بدن سے لپیٹ لئے، اور الاؤ کے قریب چلا گیا، سیموں اور دوسرے ملاح ٹہلتے ہوئے جھونپڑی کی طرف چلے گئے۔

ایک ملاح خشک گھاس پر لیٹے ہوئے بھاری آواز میں بولا 'سردی ہے'!

دوسرے نے اتفاق کیا 'ہاں، گرمی نہیں ہے، زندگی کیا ہے جنجال ہے....'

سب لیٹ گئے دروازہ ہوا کے جھونکے سے کھل گیا، اور برف کی بوچھاڑ اندر آنے لگی، کسی میں مارے سردی اور کاہلی کے اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اُٹھ کر دروازہ بند کر دیتا۔

سیموں غنودگی کا جھونکا آتے وقت بولا 'میں تو مزے میں ہوں' خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے!'

تمہاری دلاوری کا لوہا ہم سب مانتے ہیں، شیاطین بھی تمہیں ہاتھ نہیں لگائیں گے!

باہر سے ایسی چیخیں آئیں جیسے کوئی کُتا بھوں بھوں کر رہا ہے،

کیا ہے؟ کون ہے؟

تاتاری باہر بیٹھا سو رہا ہے،

عجب دیوانہ ہے!

سیموں نے کہا، رفتہ رفتہ عادی ہو جائیگا، اور فوراً اس کی آنکھ لگ گئی، باقی لوگ بھی تھوڑی دیر میں سو گئے۔ دروازہ کھلا پڑا رہا،

(چیخوف)

خواجہ منظور حسین

تنقید و تبصرہ

کتب

المسیح الدجال و یاجوج ماجوج ۔ مثنوی یاد اسلام ۔ پانصد در نادر ۔ جواہرات اسلام ۔ تناسخ ۔ پیام عمل ۔ انارکلی

المسیح الدجال و یاجوج و ماجوج | مصنفہ مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے۔ امیر جماعت احمدیہ لاہور۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت فی نسخہ ۸ر۔

ملنے کا پتہ : احمدیہ انجمن اشاعت اسلام۔ لاہور۔

اس رسالہ میں مولوی محمد علی صاحب نے بعض علامات قیامت کی تشریح کی ہے مثلاً یاجوج و ماجوج۔ مسیح دجال۔ دابۃ الارض اور مغرب سے طلوع شمس۔ یاجوج و ماجوج جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے ان کے متعلق کوئی تفصیلی بحث مولوی صاحب نے نہیں کی نہ ان کے تاریخی حالات پڑھنے کی زحمت گوارا کی نہ ان کتابوں کا مطالعہ کیا جو خود علمائے مغرب یا بائبل کے شارحین نے اس موضوع پر لکھی ہیں۔ صرف حزقیل نبی کی کتاب کے حوالے سے اقوام مغرب کو یاجوج و ماجوج قرار دیدیا۔

زیادہ توجہ انھوں نے مسیح دجال پر صرف کی ہے بلکہ یہ سارا رسالہ اسی کے متعلق ہے۔ مگر اس بحث میں تاویلیں اس قدر کمزور ہیں جن کے لکھنے کی جرأت صرف انھیں کو ہو سکتی ہے مثلاً دعویٰ یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج اور دجال دونوں ایک ہی ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ

> "صحیح حدیث نے سورۂ کہف کو فتنۂ دجال کا علاج بتایا ہے، اور سورۂ کہف بالخصوص عیسائیت کے فتنہ پر ہے۔ تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے غلبۂ عیسائیت ہی کو فتنۂ دجال قرار دیا ہے۔" صفحہ ۱۲۔

اگر مولوی صاحب اس دلیل کو ترتیب دیکر اپنے سامنے رکھ لیتے تو ان کو خود معلوم ہو جاتا کہ

اس کے کتنے مقدمات ممنوع ہیں۔

دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ دجال ایک فرد کا نام نہیں ہے بلکہ ایک قوم کا نام ہے۔ دلیل یہ لکھی ہے کہ

"یہ پیشین گوئیاں نبی کریم علیہ السلام کے کشوف (؟) ہیں اور کشف یا رویا میں جب ایک قوم دکھائی جائے گی تو ایک فرد واحد ہی کے طور پر دکھائی جائیگی" صفحہ ۱۷۔

سوال یہ ہے کہ "ایک فرد واحد" کس طور پر دکھایا جائے گا؟ مولوی صاحب نے خود ابن صیاد کے ذکر میں نقل کیا ہے کہ حضرت جابر صحابی نے قسم کھا کر کہا کہ وہ دجال ہے۔ نیز خود آنحضرتؐ بھی جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے اس کے دجال ہونے کا گمان رکھتے تھے۔ کیا وہ "ایک فرد واحد" تھا یا ایک قوم؟

اس کے علاوہ یہ بھی حدیث میں ہے کہ "میری امت میں تیس۳۰ دجال نکلینگے"۔ کیا وہ "ایک فرد واحد" ہوں گے یا ایک ایک قوم؟

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت عیسیٰؑ کا کام صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صلیب کو توڑیگا اور خنزیر کو قتل کرے گا۔ یہاں قتل دجال کا نام تک نہیں" صفحہ ۱۴۔

پھر آگے لکھتے ہیں:۔

"آنے والے مسیح کے کارناموں میں قتل دجال کا نام تک نہ لینا اس بات کی قطعی اور کھلی شہادت ہے کہ فتنۂ دجال اور غلبۂ صلیب ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں" صفحہ ۱۴۔

دعویٰ، دلیل اور نتیجہ کی مطابقت کی منطقی بحث کو جانے دیجئے کیونکہ مولوی صاحب اس سے کبھی سروکار نہیں رکھتے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جن حدیثوں میں کسر صلیب اور قتل خنزیر کا ذکر ہے ان میں پہلے تصریح کے ساتھ قتل دجال کا بھی ذکر ہے جس کا اس شدومد سے مولوی صاحب نے بار بار انکار کیا ہے۔ مجھے ان احادیث کے نقل کرنے کی یہاں ضرورت نہیں کیونکہ آخر میں خود مولوی صاحب ممدوح ہی کے قلم سے یہ پردہ اس طرح فاش ہوتا ہے:۔

"بعض قلوب میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ مسیح موعود وہی شخص ہوسکتا ہے جو دجال کو قتل کرے اور حضرت مرزا صاحب نے دجال کو قتل نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ احادیث میں مسیح موعود کے دجال کو قتل کرنے کا ذکر آتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ قتل دجال سے مراد کیا ہے۔" صفحہ ۵۱۔

قتل دجال کی اگر پہلے ہی تاویل کر دیتے اور یہ نہ لکھتے کہ "آنے والے مسیح کے کارناموں میں قتل دجال کا نام تک نہیں ہے" تو کیا ہرج تھا۔

ذوالقرنین بعض لوگوں نے سکندر کو کہا ہے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ ان کے نزدیک ذوالقرنین دارائے اول ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تاریخی لحاظ سے یہ اس سے بھی زیادہ غلط ہے کیونکہ دارا کا سد بنانا کسی طرح ثابت نہیں۔ اس بارے میں کتاب التیجان کا بیان زیادہ قابل قبول ہے جس نے ملک یمن کے ذوالقرنین کے سفر مغرب و مشرق اور سد یاجوج بنانے کے مفصل حالات لکھے ہیں۔

دابۃ الارض جس کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح پر ہے

"جب ان کے اوپر عذاب کا فیصلہ ہو چکے گا اس وقت ہم زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو لوگوں سے یہ کہے گا کہ وہ اللہ کی آیتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔"

(پ ۲۰ رکوع ۲)۔

مولوی صاحب نے اس سے عیسائی علماء کو مراد لیا ہے۔ لکھتے ہیں

"اقوام یورپ کے تین مختلف حصوں کا تین ناموں کے تحت میں ذکر کیا ہے۔ دجال ان کے پادری ہیں۔ یاجوج ماجوج انکا وہ گروہ ہے جس کے ہاتھ میں ملکی طاقت ہے اور دابۃ الارض ان کے وہ علماء ہیں جو مادہ پرستی میں منہمک ہیں۔" صفحہ ۶۴۔

لیکن مرزا صاحب نے دابۃ الارض خود علماء اسلام ہی کو قرار دیا ہے جو زمینی باتوں پر گرے ہوئے ہیں۔ اس لئے مولوی صاحب کو اس تحقیق کے سامنے بھی سر جھکانا تھا۔ لکھتے ہیں:

"کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ یہ آج ہمارے علماء کی ہوبہو تصویر ہے۔ اگر ایسے لوگوں کو دابۃ الارض کہا گیا ہو تو کیا بعید ہے۔" صفحہ ۶۶۔

لیکن کیا علمائے اسلام کی آج ہو بہو تصویر یہ ہے؟ میں تو یہی ان کی ذہنیت ایک ہزار سال سے ثابت کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن اس کو چھوڑئے اور یہ دیکھئے کہ قرآن میں دابۃ الارض کا خروج مشروط ہے کہ اس وقت ہوگا جب عذاب یا قیامت کا فیصلہ ہو چکے گا۔ لیکن بقول مولوی محمد علی صاحب علمائے مغرب اور بقول مرزا صاحب علمائے اسلام جو دوسرے انسانوں کی طرح ماں کے شکم ہی سے پیدا ہوئے ہیں، زمین سے نکالے جا چکے ہیں اور کہتے پھرتے ہیں کہ لوگ آیات الٰہی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

دابۃ میں تنوین وحدت کی ہے جس کے معنی ہوئے ایک جاندار۔ مگر مولوی محمد علی صاحب کے لئے یہ آسان ہے کہ وہ "ایک فرد واحد" کو ایک قوم بنا لیں۔

آخر میں مغرب سے طلوع شمس کی یہ تاویل کی ہے کہ جماعت احمدیہ نے ممالک مغربیہ میں تبلیغی مرکز قائم کر دیا ہے جہاں سے آفتاب اسلام "ضیا باریاں" کر رہا ہے۔ مگر اس صورت میں تو طلوع آفتاب مشرق یعنی پنجاب ہی سے ماننا پڑے گا جس کی ایک کرن مغرب میں پہونچ گئی ہے نہ کہ مغرب سے۔

خاتمہ پر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ پیشین گوئیاں جو روایات میں بیان کی گئی ہیں ان کی نسبت خود ائمہ حدیث نے اپنا اطمینان ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ ملاحم میں ایک حدیث بھی صحیح نہیں۔ ایسی حالت میں ان کی اس قدر بے بنیاد تاویلوں میں پڑنا اہل علم و دین کے شایان شان نہیں۔ بے شک قرآن میں جو امور مذکور ہوئے ہیں ان پر مفید اور دلچسپ بحث ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسی بحث جس کی بنیاد علم و عقل پر ہو نہ کہ فرقہ وارانہ خیالات پر۔

مثنوی یاد اسلام | مصنفہ شاہ ممتاز علی صاحب آہ امیٹھوی۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ تقطیع خورد حجم پانچ جزو قیمت فی نسخہ ۱۰/۔ ملنے کا پتہ: مولوی محمد ساجد صاحب، محلہ مغلپورہ شہر فیض آباد۔

شاہ صاحب موصوف نے اس مثنوی میں اللہ کے صفات۔ رسول اللہ کے حالات طیبہ اور بزرگان دین کے بعض تاریخی واقعات نہایت عقیدت کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ ملحدوں، دہریوں اور بے دینوں کے اعتراضات کے جوابات بھی دئے ہیں اور موجودہ مسلمانوں کی دین سے بیزاری اور افرنجیت کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔

وہ ایک کہنہ مشق شاعر اور حضرت منشی امیر احمد مرحوم مینائی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اسلئے

ان کی شاعری ٹکسالی ہے مگر غزل گوئی اور واقعات منظوم کرنے میں بڑا فرق ہے چنانچہ اس مثنوی میں انکے شبدیز قلم نے وہ دلکش جولانیاں نہیں دکھائیں جو غزلوں میں ہیں۔ مگر پھر بھی پختہ کلامی کا جوہر ہر جگہ عیاں ہے۔

پانصد در نادر | مصنفہ مولوی محمد حسین خاں صاحب بی۔اے (علیگ) سابق رئیس تدریسات افغانستان۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ متوسط۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۰۰ صفحے۔ قیمت فی نسخہ ۸ر۔

ملنے کا پتہ: سید حمید خاں۔ بستی نو جالندھر۔

اس کتاب میں قدیم اولیا کرام اور بزرگان اسلام کے اقوال سے پانسو نصیحتیں جو دین اور دنیا دونوں میں کار آمد ہو سکتی ہیں اور انسان کی عقل و معرفت کو بڑھاتی ہیں تذکرۃ الاولیاسے التقاط کرکے لکھی گئی ہیں۔ غازی نادر خاں بادشاہ افغانستان کے نام کی نسبت سے اس کا نام پانصد در نادر رکھا گیا ہے۔ انتخاب عقل و فہم کے ساتھ کیا گیا ہے اور ترجمہ صاف اور واضح ہے۔ اس کا مطالعہ ہر چھوٹے بڑے اور جدید و قدیم تعلیم یافتہ سب کے لئے مفید ہے۔

جواہرات اسلام | مصنفہ چمپت رائے صاحب جین۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ تقطیع خورد۔ حجم ۱۵۲ صفحے۔ قیمت فی نسخہ ۸ر۔ ملنے کا پتہ: ہیرالال پنالال۔ دریبہ کلاں۔ دہلی۔

اس رسالہ کے مصنف مسٹر چمپت رائے دہلی کے ایک معزز بیرسٹر ہیں۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات کے حقائق کی زیادہ تر مولانا روم کی مثنوی سے تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اور بہت سے اہم مسائل کو بیان کیا ہے۔

تناسخ کو بھی انھوں نے اسلامی تعلیمات میں سے سمجھا ہے اور اس کے اوپر مثنوی کے بعض اشعار سے سند پیش کی ہے۔ لیکن دراصل یہ غلط فہمی ہے۔ اسلام نے تناسخ ارواح یعنی آواگون کی تعلیم نہیں دی ہے۔ خود مولانا روم نے بھی تخلیق کے مدارج دکھائے ہیں نہ کہ گناہوں یا نیکیوں کے عوض میں بار بار پیدائش کے یعنی جو اشعار سند میں پیش کئے گئے ہیں ان میں ارتقائے تخلیق ہے نہ کہ مسئلہ تناسخ۔ اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے نہ کہ مثنوی پر۔ کاش ایسی بے تعصب اور

سعادت مند طبیعتیں قرآن کو سمجھنے کی کوشش کریں تو اسلامی حقائق کو زیادہ صحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

تناسخ | مصنفہ ڈاکٹر بشارت احمد صاحب احمدی۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی۔ حجم چار جزو۔ قیمت فی نسخہ ۲ر۔ ملنے کا پتہ، منیجر صاحب دار الکتب اسلامیہ۔ احمدیہ بلڈنگس لاہور۔

ڈاکٹر صاحب نے اس رسالہ میں ایک سوال کے جواب پر تناسخ کے متعلق تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ اعتقاد زمانہ لاعلمی کا ایک غلط نظریہ ہے۔ اس مسئلہ کی تردید میں اگرچہ پہلے بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر یہ رسالہ سب سے زیادہ واضح، مبیّن اور مدلل ہے۔ ان کے دلائل کا خلاصہ تین امور ہیں۔ اول یہ کہ ہر ایک آدمی جانتا ہے کہ میں اس سے قبل اس دنیا میں کبھی نہیں آیا۔ دوم یہ کہ مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعے سے انسان کو جو علم ملا ہے یعنی سائنس اس نے ارتقا کو مان کر تناسخ کی جڑ کاٹ دی ہے۔ سوم یہ کہ خود خالق کائنات نے بنی نوع انسان کو آج تک جو علم الہام کے ذریعے سے دیا ان میں یہ بتا کر کہ مرنے کے بعد انسان اس دنیا میں واپس نہیں آتا تناسخ کی تردید کر دی۔

ساری کتاب ان تین اصولی دلائل کی تشریح اور توضیح ہے اور اس خوبی کے ساتھ ہے کہ علم اور عقل کی روشنی میں ان کا جواب ناممکن ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس رسالہ کو چار مختلف لکچروں میں تقسیم کیا ہے جس کی وجہ سے مضامین کا جابجا تکرار ہو گیا ہے۔ اگر مسلسل ایک مضمون لکھتے تو یہ عیب نہ واقع ہوتا۔ مگر تاہم اپنے موضوع پر بے مثل رسالہ ہے۔

پیام عمل | جزیرہ موریشس میں مولانا حکیم عبداللہ رشید نواب کی مدد سے ۱۹۲۳ء سے ایک مدرسہ قائم کیا گیا ہے جس میں مسلمان بچوں کو انگریزی نصاب کے ساتھ اردو اور دینیات کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس رسالہ میں اس مدرسہ کی ضروریات دکھا کر اس کی امداد کی تحریک کی گئی ہے۔ دستخط کنندگان میں کارکنان و ممبران مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی و دیگر مسلمانان موریشس ہیں۔

امداد بذریعہ خطیب صاحب مکہ مسجد ارود شریف حیدرآباد دکن ارسال کی جاسکتی ہے۔

انارکلی مصنفہ سید امتیاز علی تاج، دارالاشاعت پنجاب لاہور تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶، حجم ۲۰۰ صفحے۔

اردو پڑھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جسے یہ ڈراما دیکھ کر خوشی نہ ہوئی ہو۔ موضوع، پس منظر، ڈراما کے مخصوص اوصاف، ہر اعتبار سے یہ تصنیف قابل قدر ہے، اور ہمیں امید ہے ہندوستانی ڈراما اور تھیٹر کے شائقین کی عام بدمذاقی رفع کرنے میں یہ بہت مدد دے گا۔ اس میں حقیقت نگاری بھی ہے اور تصور کی رنگینی بھی، جذبات کا تلاطم بھی اور ایک اچھی کہانی کی ترتیب بھی۔ مصنف نے مغل بادشاہوں کے حرم سرا کی فضا اور طرز معاشرت کا نقشہ بہت صحت اور نکتہ رسی کے ساتھ پیش کیا ہے، اور انارکلی اور سلیم کی داستان کے لئے اس سے زیادہ موزوں پس منظر نہیں ہو سکتا تھا۔ ڈراما کے اشخاص مورخ کے تخیل کی بنائی ہوئی مورتیں نہیں معلوم ہوتے، بلکہ باغ اور چمن، دریا کے کنارے اور چاندنی رات کے ویسے ہی سچے قدردان جیسے کہ مغل واقعی تھے، ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ محلوں میں رہنے کے عادی ہیں، اپنے جسم، اپنے مکان، اپنی زندگی کو آراستہ کرنا جانتے ہیں، اور وہ آرائش اور نفاست جو ہمارے تصور میں نہیں سماتی ان لوگوں کی روزمرہ زندگی کی ایک معمولی حقیقت ہے۔ مغل حرم سرا کے پرستان میں عشق کی داستانیں کوئی نرالی بات نہ ہوں گی، مگر انارکلی کا عشق کوئی معمولی جذبہ نہیں ہے۔ اس کا تیز شعلہ اس طرح بھڑک اٹھتا ہے کہ محل اور باغ سب جگمگانے لگتے ہیں، اور کبھی کبھی اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ جلا کر چھوڑے گا، مگر شعلے کی چمک دم بھر کی ہے، وہ کچھ جلاتا نہیں، اپنی رونق دکھا کر بجھ جاتا ہے اور محل اور باغ شرمندہ ہو کر شام کے سے اندھیرے میں اپنا منہ چھپا لیتے ہیں۔

وہ جذبہ جس کا انارکلی ایک مجسمہ ہے ہر شاعر، داستان گو اور افسانہ نویس کا تختہ مشق رہا ہے، اور نہ صرف ہمارے ادب میں بلکہ تمام دنیا میں عشق سے زیادہ فرسودہ کوئی مضمون نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جو نگارنگی اس جذبے میں ہے، جو اثر اس کا ہر دل پر ہوتا ہے اور جو مختلف شکلیں یہ ہر طبیعت اور مذاق کے ساتھ اختیار کرتا ہے اس میں بہت وسعت پیدا کر دیتی ہیں اور ہر عاشق کی طرح عشق کا ہر مصور بھی خود بخود ایک موجد ہو جاتا ہے۔ لیکن انارکلی کے عشق کی تصویر میں اصلیت کم اور رنگینی زیادہ نظر آتی ہے جیسے ہمارے شاعر اپنے جذبۂ عشق کی شدت ظاہر کرنے کے لئے بیخودی اور محویت کی انتہا تک پہنچ جانے کا دعویٰ کرتے ہیں، ویسے ہی انارکلی

کا عشق ایک ایسے رنگ میں دکھایا گیا ہے جو شاید ہی کسی انسان میں نظر آتا ہو۔ انسانی جذبات کے ہزاروں محرک ہوتے ہیں، اور عشق کے جذبے کی ایک محرک کسی دوسری ذات میں محو ہو جانے کی آرزو بھی ہو جاتی ہے لیکن عشق کو محض محو ہو جانے کی خواہش ظاہر کرنا اور کسی انسان کو خالص عشق کا مجسمہ بنانا مبالغہ ہے۔ ممکن ہے یہ بعض لوگوں کو پسند آتا ہو، مگر جو لوگ انسانی سیرت کو اصلی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں انھیں یہ بے جا رنگ آمیزی معلوم ہوگی۔

اکبر کا طرزِ عمل بھی نفسیات کی رو سے ایک معمہ سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ مصنف نے عموماً اسے اپنے سیاسی منصوبوں میں ڈوبا ہوا دکھایا ہے، اور حرم سرا کی رنگیلی زندگی محض ایک دلچسپی ہے جس سے اس کے تھکے ماندے دماغ کو کسی قدر تفریح ہو جاتی ہے۔ سلیم سے اس کو جو شکایت ہے وہ بجا ہے، لیکن وہ صرف محل کی کنیزوں اور حرم سرا کی دلچسپیوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اکبر کو شکایت سلیم کی فطرت سے ہونا چاہئے، اس کی استعداد کی کمی، اور اس کے شوق کی گمراہی سے۔ محض انارکلی کی ایک گستاخی پر وہ اس قدر بگڑ جاتا ہے، حالانکہ ایسی حرکت حرم سرا میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہوگی، جب مرد اور عورتیں سب شراب کے عادی تھے اور خود جہاں پناہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح میخواری کی داد دیا کرتے تھے۔ سلیم کا انارکلی کو آزاد کرنے کی کوشش کرنا خصوصاً ایسے بھولے پن سے، اسے بھی سزا کا سبب بنانا دشوار ہے۔ اگر باپ بیٹے میں رقابت ہوتی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ اکبر کا غصہ انارکلی کو تباہ کر دیتا لیکن رقابت کا ڈراما میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر اکبر مطلق العنانی میں مست ہوتا اور اسے خواہ مخواہ اپنی طاقت استعمال کرنے کا شوق ہوتا تب بھی ہم سمجھ سکتے کہ اس نے انارکلی کو ایسی سزا کیوں دی، کیونکہ طاقت کے ناجائز استعمال کی ہزاروں مثالیں تاریخ میں اور ہمارے زمانے میں ملتی ہیں۔ لیکن اکبر کو انارکلی میں ایک نہایت روشن ضمیر، عاقل و دانا، مدبر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، اور وہ وحشیانہ طرزِ عمل جو اس نے سلیم اور انارکلی کو جدا کرنے کے واسطے اختیار کیا اس کی سیرت کے بالکل خلاف ہوتا ہے۔

مصنف نے دیباچے میں بیان کر دیا ہے کہ انارکلی کا قصہ بے بنیاد ہے، مگر ڈراما میں حقیقت نگاری کا ایسا رنگ ہے کہ ڈراما کے پڑھنے والے کو یقین ہونے لگتا ہے کہ قصہ ضرور سچا ہوگا۔ ہم انشاپردازوں کو کسی طرح پابند کرنا نہیں چاہتے، لیکن انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم جن لوگوں کی برائیاں بیان کریں ان کی بھلی باتوں کو بھی یاد کرتے رہیں۔ ہماری موجودہ غلامی اور بے مائگی ہمارے پیش روؤں کی گمراہی اور ان کی سیرت کی خامیاں واضح کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ کچھ ان باتوں کی طرف بھی توجہ کرنا چاہئے جو ہمارے پیش روؤں کو اس وقت مصروف رکھتی تھی جب شراب اور عیش کی طلب ان کو دنیا سے غافل نہیں کر دیتی تھی۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

پردیس میں ہندوستانیوں کا حال | یوں تو ہر ملک اور ہر دیس کے لوگوں کو اپنے وطن اور اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے لیکن ہندوستان کی قناعت پسند آبادی کو اپنے گھر اور اپنے دیہات کی چوپال سے اتنی زیادہ محبت اور تعلق تھا کہ دیس کو چھوڑ کر پردیس جانا برا اور سمندر پار کرنا مذہبی گناہ سمجھا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ ایسے سیاسی اور معاشی اسباب پیدا ہوتے گئے کہ انیسویں صدی کے وسط میں دنیا کے بعض غیر آباد ملکوں کو آباد کرنے کے لیے ہندوستان میں بھرتی شروع کی گئی اور طرح طرح کی ترغیبات دیکر ہندوستانیوں سے معاہدے کے کاغذ پر انگوٹھا لگوایا گیا اور سمجھا بجھا کر سمندر پار بھیج دیا گیا۔ چنانچہ اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں پردیسی ہندوستانیوں کی مردم شماری ½۲۶ لاکھ ہے جس میں سے تقریباً ½۲۵ لاکھ برطانوی نوآبادیات میں بس گئے اور باقی ایک لاکھ غیر برطانوی علاقوں میں ہیں جسکی تفصیل حسب ذیل ہے:-

برطانوی نوآبادیات		
	۱۔ جزیرہ سیلون (لنکا)	۹ لاکھ ۵۹ ہزار
	۲۔ ملایا	۷ لاکھ
	۳۔ ماریشس	۲ لاکھ ۸۱ ہزار
	۴۔ جنوبی افریقہ	۱ لاکھ ۶۰ ہزار
	۵۔ ٹرینیڈاڈ	۱ لاکھ ۳۰ ہزار
	۶۔ جزائر فیجی	۶۹ ہزار
	۷۔ دیگر	½۲ لاکھ
	میزان	½۲۵ لاکھ

غیر برطانوی علاقہ

۱۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ	۳۱۷۵
۲۔ مڈاگاسکر	۵۲۷۲
۳۔ جزائر الشرق	۵۰ ہزار
۴۔ سرینم	۲۴ ہزار
میزان	تقریباً ایک لاکھ



ابتداءً صرف مزدور پیشہ اور زراعت پیشہ طبقہ کے لوگ باہر گئے لیکن اس کے بعد پھر گویا دروازہ کھل گیا اور تاجر، دستکار، منشی، وکیل، ڈاکٹر غرض ہر پیشے کے لوگ بہتر مواقع کی تلاش میں باہر جانے لگے، لیکن بدقسمتی سے اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقہ کے لوگوں میں بیرون ملک جانے کا شوق اس زمانہ میں پیدا ہوا جب یورپ کے گورے آدمی ایشیا کے "سیاہ فام انسانوں" کو انتہائی ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، چنانچہ جہاں جہاں ہندوستانیوں کا گزر ہوا ہر جگہ وہی آسمان وہی زمین، وہی پابندیاں، امتیازات اور تعصبات۔ قدرتاً شکایات پیدا ہوئیں اور اس لئے اور بھی زیادہ کہ ۲۶ لاکھ

میں سے ۲۵ لاکھ ہندوستانی اس وسیع سلطنت میں آباد کئے گئے تھے جہاں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا لیکن پردیس میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے، نہ حکومت ہند نے اپنی رعایا کی پردیس میں کوئی فکر کی اور نہ برطانوی پارلمنٹ نے کبھی توجہ کی۔ مقامی طور پر کچھ تو ہندوستانیوں کی اپنی سعی و کوشش سے اور کچھ تنگ نظر فرنگیوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی کی وجہ سے اکثر نوآبادیات میں حالات روبہ اصلاح ہونے لگے اور اب کم از کم برطانوی گوئنا، ٹرینی داد، جمائیکا، سیلون اور مارشس میں ہندوستانیوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض دیگر نوآبادیات میں ہندوستانیوں کی حالت بہت پریشان کن ہے اور ان کے ساتھ ہر طرح کی زیادتیاں کی جاتی ہیں تاکہ وہ کسی طرح اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں مثلاً ایک شہر یا صوبے سے دوسرے شہر یا صوبے میں سکونت نہیں تبدیل کر سکتے، زمینات اور مکانات نہیں خرید سکتے، کئی کئی نسلوں سے وہاں آباد ہیں مگر حقوق شہریت نہیں ملتے، حق تجارت بہت مشکل سے ملتا ہے اور مخصوص بازار کے علاوہ دوسری جگہ دوکان نہیں لگا سکتے، مقررہ محلوں کے علاوہ دوسری جگہ سکونت نہیں اختیار کر سکتے، ریلوں میں صرف انھیں درجوں میں سفر کر سکتے ہیں جو ان کے لئے مخصوص ہوں، ہوٹلوں میں قیام ممنوع۔ مزدوری وغیرہ کے لئے جو قوانین حکومت نے بنائے ہیں ان سے وہ محروم ہیں، ان کے بچے اسکولوں میں تعلیم نہیں حاصل کر سکتے وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک ان شکایات کا تعلق ہے جنوبی افریقہ کی حکومت متحدہ کا رویہ ہندوستانیوں کے ساتھ سب سے زیادہ معاندانہ ہے، جنگ سے قبل مہاتما گاندھی نے کئی سال تک وہاں قیام کر کے ہندوستانیوں کی ان شکایات کو دور کرنے کی سعی و کوشش کی اور بالآخر مجبور ہو کر حکومت متحدہ کے خلاف ستیہ گرہ کی جنگ شروع کی جس کا اختتام ۱۹۱۴ء میں "گاندھی اسمٹس" سمجھوتہ پر ہوا۔ جنگ عظیم کے زمانے میں ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء کی "امپیریل وار کانفرنس" میں یہ مسئلہ کئی مرتبہ زیر بحث آیا اور مناسب قرارداد بھی منظور کی گئی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ۱۹۲۱، ۲۴، ۲۵ء میں حکومت متحدہ جنوبی افریقہ نے کئی مسودات قانون اپنی پارلیمنٹ میں پیش کئے جن کا مقصد صریحاً ہندوستانیوں کی تجارت اور کاروبار کا تباہ کرنا تھا۔ حالات بہت نازک ہوتے جا رہے تھے اس لئے مئی ۱۹۲۶ء میں حکومت ہند نے سر جارج پیڈیسن کی سرکردگی میں ایک وفد حکومت متحدہ سے گفت و شنید کے لئے جنوبی افریقہ بھیجا اور یہ طے پایا کہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں دونوں حکومتوں

کی ایک کانفرنس افریقہ میں منعقد ہو اور اس کانفرنس سے قبل جنوبی افریقہ کا ایک وفد ہندوستان آ کر یہاں کے حالات کا بچشم خود مطالعہ کرے۔ چنانچہ کانفرنس ہوئی اور گفت و شنید کے بعد ایک سمجھوتہ ہوا کہ حکومت جنوبی افریقہ مغربی طرز زندگی اختیار کرنے پر ہر جائز طریقے سے اصرار کر سکتی ہے اور جو ہندوستانی ایسا کرنا چاہیں گے ان کی اس معاملہ میں امداد کرنا بھی دونوں حکومتوں کا فرض ہے اور جو لوگ افریقہ چھوڑنا چاہیں گے ان کو دوسرے ملکوں میں آباد کرنے کے لئے ہر قسم کی امداد دونوں حکومتوں کی طرف سے دیجائے گی۔ تین سال کی مسلسل غیر حاضری کے بعد واپسی کا حق نہ ہوگا لیکن اگر اس سے قبل واپس آنا چاہیں تو جو رقم حکومت نے ان پر صرف کی ہے وہ ادا کرنا پڑے گی، جو مسودات پارلیمنٹ میں ہندوستانیوں کے متعلق پیش کئے گئے ہیں ان پر مزید کارروائی نہ کیجائے گی، حکومت ہند اپنا ایک ایجنٹ معاملات کی نگرانی اور دونوں حکومتوں کے خوشگوار تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے مقرر کرے گی۔

جون ۲۷ء میں سمجھوتے کے مطابق مسٹر شاستری حکومت ہند کی طرف سے افریقہ میں ایجنٹ مقرر کئے گئے اور ان کے دوران قیام میں حالات قابل اطمینان رہے، لیکن موصوف کو قبل از وقت استعفیٰ دینا پڑا۔ ان کے بعد مسٹر رڈی ایجنٹ مقرر ہو گئے۔ مسٹر رڈی کو بھی علالت کی وجہ سے رخصت لے کر دسمبر ۲۹ء میں ہندوستان واپس آنا پڑا، اور آپ کی غیر موجودگی میں حکومت متحدہ نے فرنگیوں کی درخواست پر یہ فیصلہ کیا کہ ٹرانسوال میں ہندوستانیوں کی جائداد غیر منقولہ کی ملکیت اور قبضہ وغیرہ کے متعلق قواعد و ضوابط پر نظر ثانی کی جائے۔ اس فیصلے سے ہندوستانیوں کو قدرتاً اندیشہ پیدا ہوا۔ حکومت ہند نے کوشش کی کہ یہ معاملہ کچھ عرصے کے لئے ملتوی ہو جائے مگر حکومت متحدہ نے کسی طرح منظور نہ کیا۔ مسئلہ تحقیقاتی کمیٹی سے گزر کر پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہو گیا۔ لیکن بالآخر حکومت ہند کے اصرار سے پارلیمنٹ کے دوسرے اجلاس کے لئے ملتوی کر دیا گیا اور یہ طے پایا کہ ۲۷ء کے سمجھوتے کے مطابق حکومت ہند اور حکومت متحدہ کے نمائندوں کی ایک کانفرنس پھر منعقد ہو اور از سر نو تمام مسائل پر غور کیا جائے۔ چنانچہ اس سال جنوری اور فروری کے مہینے میں کانفرنس ہوئی۔ ہندوستان کی طرف سے سر فضل حسین، مسٹر شاستری، مسٹر نیڈو اور مسٹر باجپی بھیجے گئے۔ حسب ذیل مختلف فیہ مسائل تھے جن پر بالآخر سمجھوتہ ہو گیا:-

(۱) جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو بالخصوص ہندوستان واپس بھیجنے کے متعلق جو سمجھوتہ ۱۹۲۷ء میں ہوا تھا وہ ناقابل عمل ہے۔ اول تو ۸۰ فی صدی ہندوستانی افریقی ہیں اور ہندوستان اب ان کے لئے ایک اجنبی ملک ہے، وہاں کی آب و ہوا ان کے موافق نہیں اس لئے وہ ہندوستان واپس جانا نہیں چاہتے۔ اس کے علاوہ خود ہندوستان میں کثرت آبادی کی وجہ سے مزید دشواریاں ہیں، لہذا ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو دنیا کے دوسرے غیر آباد علاقوں میں تحقیق حالات کرے اور اگر آب و ہوا مناسب ہو تو افریقی ہندوستانیوں کو وہاں آباد کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کمیٹی میں افریقہ انڈین کانگرس کا بھی ایک نمائندہ ہوگا۔

(۲) مغربی طرز زندگی کو اختیار کرانے کے لئے تعلیمی اور دیگر آسانیاں بہم پہونچانے کا جو وعدہ حکومت متحدہ نے ۱۹۲۷ء کے سمجھوتے میں کیا تھا اس پر وہ قائم رہے اور اس پر عمل بھی کرے۔

(۳) ٹرانسوال میں حقیت اراضی کے متعلق جو مسودہ قانون افریقی پارلیمنٹ میں پیش تھا اس پر بحث کرنے کے لئے جنوبی افریقہ کے نمائندے تیار نہ تھے۔ وہاں کی فرنگی آبادی کو اس پر سخت اعتراض تھا کہ جنوبی افریقہ کی پارلیمنٹ کے معاملات میں حکومت ہند کو اس طرح دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس لئے یہ طے پایا کہ افریقی نمائندے ڈاکٹر ملان ہندوستانی نمائندوں کے خیالات مجلس منتخبہ کے سامنے پیش کردیں اور کمیٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ خود مجوزہ مسودہ میں ضروری ترمیمات کردیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واضح کردیا گیا کہ کانفرنس کے سمجھوتے کا دار و مدار اسی پر ہے کہ اس خاص مسئلہ میں ہندوستانی نمائندوں کی تجاویز کو مسترد نہ کیا جائے۔ اس مسئلہ پر سب سے زیادہ اختلافات تھے لیکن بالآخر اس پر بھی سمجھوتہ ہوگیا جو بحالات موجودہ کافی سمجھا جاتا ہے۔

حکومت ہند کا ایک نمائندہ آیندہ بھی بحیثیت ایجنٹ کے جنوبی افریقہ میں رہے گا۔ مسٹر ریڈی کی میعاد ختم ہوگئی ہے، لیکن ان کے جانشین کا تقرر ابھی تک عمل میں نہیں آیا ہے۔

اس سمجھوتے کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں کی گئی ہے لیکن جنوبی افریقہ کے فرنگیوں کی ذہنیت سے اندیشہ ہے کہ پچھلے سمجھوتوں کی طرح سے یہ سمجھوتہ بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے گا۔ ہندوستان میں پنچ ذات اور اونچ ذات کے اختلافات پر فرنگیوں کو ہنسی آتی ہے لیکن خود ان کی بدترین ذہنیت اور نسل و رنگ کے تعصب کا جو حال ہے وہ آج بھی جنوبی افریقہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہندوستانیوں کو برطانوی پارلیمنٹ سے بجا طور پر شکایت ہے کہ ہندوستان میں تو بات بات پر صوبے کے گورنر سے لیکر ملک معظم تک سب اپنے "تصدیق" اور تردید کے اختیارات استعمال کرتے ہیں لیکن گو یہ سب اختیارات دیگر نوآبادیات کے متعلق بھی پارلیمنٹ اور ملک معظم کو حاصل ہیں لیکن آج تک کبھی ان کا استعمال ہندوستانیوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے نہیں کیا گیا حالانکہ امپیریل کانفرنس کی قرارداد کے صریحاً خلاف ہندوستانیوں کے ساتھ طرح طرح کی قانونی اور غیر قانونی زیادتیاں کی جاتی ہیں۔

اسلامی ممالک

حوادث فلسطین | ۱۹۳۱ء کی روئیداد مردم شماری کی رو سے فلسطین میں مسلم اور غیر مسلم آبادی کے شمار و اعداد یہ ہیں:-

مسلمان	۷۵۹۹۵۲
یہود	۱۷۵۰۰۶
عیسائی	۹۰۶۰۷

۱۹۲۲ء کی نسبت یہود کی تعداد اب دگنی ہوگئی ہے (یعنی ۸۳۷۹۴ سے ۱۷۵۰۰۶) لیکن یہودیوں کے لئے یہ امر کچھ بہت زیادہ قابل اطمینان نہیں اس لئے کہ گزشتہ ۹ سال میں مسلمانوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوا ہے وہ یہود کی کل تعداد کے تقریباً برابر ہے (یہود کی کل تعداد ۱۷۵۰۰۶ ہے۔ ۱۹۲۲ء میں مسلمانوں کی تعداد ۵۹۰۸۹۰ تھی اور اب ۷۵۹۹۵۲ ہے۔ گویا ان کی تعداد میں ۱۶۹۰۶۲ کا اضافہ ہوا ہے)۔ لہذا محض آبادی کے مسئلے میں مسلمانوں کو یہود سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ فلسطین کی کل آبادی ۱۰۳۵۱۵۴ ہے جس میں سے صرف بیت المقدس میں ۹۰۵۲۶

آدمی بستے ہیں۔

امید ہے کہ جس طرح باعتبار تعداد صیہونی تحریک فلسطین کو یہود کا "قومی وطن" بنانے میں ناکام رہی ہے اسی طرح اسلامیان فلسطین اپنے ہمت و استقلال کی بدولت برطانوی شہنشاہیت و استعمار کی تمام منصوبہ بازیوں کا خاتمہ کر دیں گے۔

اس سلسلے میں ایک تازہ خبر یہ آئی ہے کہ عرب رہنماؤں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ فلسطین کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا جائے اور ان میں سے ایک میں مسلمانوں اور دوسرے میں یہود کو حق خود اختیاری حاصل ہو۔ پھر ان دونوں حصوں کو ملا کر ایک متحدہ ریاست قائم کی جائے، عرب اور یہود دونوں اس میں شامل ہوں اور اگر اس تجویز پر کامیابی کے ساتھ عمل ہو سکے تو یہ متحدہ ریاست کم و بیش اسی حیثیت سے جو عراق کو حاصل ہے انجمن اقوام میں شرکت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہود کا ایک فرقہ اس تجویز کا سخت مخالف ہے۔ اس نے اس امر کے خلاف بھی ناراضگی کا اظہار کیا ہے کہ حکومت برطانیہ نے موجودہ ششماہی کے لئے یہودی تارکان وطن کی تعداد ۱۲۰۰ سے ۳۵۰ کیوں کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ طرفداران صیہونیت جو تمام فلسطین پر تغلب حاصل کرنے کی آرزو رکھتے ہیں اس امر پر کیونکر آمادہ ہو سکتے ہیں کہ ان کے خانہ ساز "وطن" کا ایک حصہ صیہونی دستبرد سے آزاد ہو جائے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ فلسطین برطانوی انتداب کی بجائے براہ راست انجمن اقوام کے زیر حکومت آجائے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں نو لاکھ آبادی میں سات لاکھ کے مقابلے پر زبردستی ڈیڑھ لاکھ یہودی ٹھونس دیئے گئے ہوں مٹھی بھر اجنبیوں کی خاطر ملک کے اصلی باشندوں کو حق ملکیت سے محروم کرنے کی تجویز پیش کرنا مغربی دستور و سیاست و فتنہ ہائے رعایات و حقوق کے ماتحت ہی ممکن ہے، البتہ یہ خیال کہ سیائیین مصر و ہندوستان تجزیہ فلسطین کی حمایت کر رہے ہیں سراسر لغو ہے مصریوں کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں لیکن مسلمانان ہندوستان جن کی ہر جماعت آزادیٔ مقامات مقدسہ کا حلف اٹھا چکی ہے کیونکر گوارا کر سکتے ہیں کہ وہ کسی ایسی تجویز پر صاد کریں جو فلسطین کے حقیقی استقلال اور حریت کے منافی ہو۔

ممالک اسلامی کی مالی حالت | اس وقت دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں جو مالی دشواریوں میں

گرفتار نہ ہو۔ ممالک اسلام جن کی معاشی حالت پہلے بھی کچھ اچھی نہیں تھی اور جہاں آقایان مغرب کی حرص غصب و اجارہ داری کی بدولت آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ پیدا ہوتا رہتا ہے دنیا کی عام اقتصادی مشکلات کی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ پریشان ہیں۔ ہم نے جامعہ کے ان صفحات میں بارہا ان کوششوں کی طرف اشارا کیا ہے جو دول مغرب میں سے کسی نہ کسی کی جانب سے ایران، ترکی، عرب، افغانستان ــ باقی ممالک کا نام لینا بیکار ہے ــ میں معاشی جبر و تغلب کا کوئی نہ کوئی ذریعہ پیدا کرنے کے لئے کی جاتی ہیں۔ اور چونکہ یہ امر مسلم ہے کہ جس طرح ہندوستان کا ہر مسلمان اپنے پڑوس کے بنیے کا دست نگر ہے اسی طرح جملہ ممالک اسلامی کسی نہ کسی مغربی بنیے کے شرمندۂ احسان۔ لہٰذا جب کبھی ان بنیوں کے معاملات کوئی اچھی یا بری صورت اختیار کرتے ہیں تو اس کا اثر دول اسلامی پر ضرور پڑتا ہے۔ اس وقت دنیا کا سارا معاشی نظام اہل مغرب کے ہاتھوں میں ہے۔ بنک ان کے ہیں، اندوختے ان کے پاس ہیں، چاندی اور سونے کے وہ مالک ہیں، معیار طلائی کی پابندی یا اس سے آزادی ان کے اختیار میں ہے، دنیا کے ہر ملک کا سکہ ان کے سکوں سے وابستہ ہے۔ ان کی حالت اچھی ہوتی ہے تو تجارت، کاروبار، لین دین، صنعت و حرفت سب کی حالت اچھی ہوتی ہے لیکن آج کل یہ لوگ خود اپنی پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ تاوان، قرضہ، تخفیف، میزانیے کا عدم تعاون، مقاطعہ، بے روزگاری یہ اور اس قسم کے مسائل ہیں جنھوں نے ان کی راہ میں طرح طرح کی دقتیں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس سے دنیا کی معاشی حالت پر جو خراب اثر پڑا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ممالک اسلامیہ کی معاشی حالت ہمیشہ سے پست چلی آتی تھی۔ اب اس میں اس عام کساد بازاری کا جس سے دنیا کا کوئی حصہ خالی نہیں، اور اضافہ ہوا۔ ممالک اسلام کو بھی دنیا کی تمام حکومتوں کی طرح اپنے میزانیوں کو درست کرنا ہے۔ اس کے لئے آمدنی کے جدید وسائل اور محاصل کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ ان کو بین الاقوامی ذمہ داریاں پوری کرنا ہیں، اپنے ملک کی معاشی ترقی کے لئے صنعت و حرفت کو فروغ دینا ہے اور یہ سب قرض کے بغیر ناممکن ہے لیکن قرضہ کس سے لیا جائے، آج کل کی دنیا میں سیاست اور معیشت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دنیا کی کوئی قوم بغیر کسی سیاسی غرض کے کسی دوسری قوم کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیار نہیں۔ خوش قسمتی سے ممالک اسلام اپنی ذمہ داریوں سے بے خبر نہیں۔ انھوں نے اس باب میں جو ذرائع عمل اختیار کئے ہیں ان کا اندازہ ذیل کی سطور سے ہو سکتا ہے۔

جمہوریہ ترکیہ :۔ ہم نے جامعہ کے کسی گزشتہ پرچے میں عرض کیا تھا کہ حکومت انگورہ روسی تجارت اور روسی مصنوعات کی درآمد کو روکنے کے لئے اس پر خاص پابندیاں عائد کر رہی ہے۔ حکومت ہر دو ماہ کے لئے درآمد کی تعداد مقرر کر دیتی ہے۔ اس تدبیر سے خاطر خواہ نتائج مترتب ہوئے ہیں۔ روسی مصنوعات کی آمد پہلے کی نسبت بہت کم ہو گئی ہے اور تین سو روسی افسر جو اپنے بال بچوں سمیت ترکی میں مقیم تھے اب واپس جا رہے ہیں۔

ایران :۔ ایران اور روس کے تجارتی تعلقات کے متعلق ہم نے جامعہ کی کسی پہلی اشاعت میں ایک طویل شذرہ سپرد قلم کیا تھا۔ اس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ دولت ایران نے خارجی تجارت کے تباہ کن اثرات کو روکنے کے لئے یہ قانون بنا دیا ہے کہ بجز سرکاری اجازت ناموں کے کسی خارجی حکومت کا مال ایران میں نہیں آسکتا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حکومت ایران سختی کے ساتھ اس قانون پر عمل نہیں کر سکی۔ امریکہ کو اس پابندی سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ ایران کی تجارت میں بھی سال گزشتہ کے مقابلے میں ۱۰ فیصدی کی کمی ہو گئی ہے لیکن اگر قیمت کا خیال کیا جائے تو یہی خسارہ سترہ فی صدی تک پہنچ جاتا ہے۔

مصر :۔ مصر کی حالت ایران کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ سال نو کا مصری میزانیہ اگرچہ ۱۰ کی بجائے اٹھارہ کروڑ اسٹرلنگ پر قائم ہوا ہے لیکن حکومت کے پاس ۱۵ کروڑ اسٹرلنگ بطور زر محفوظ موجود ہے۔ روئی کی برآمد کی مقدار بھی سال گزشتہ کی نسبت تیس فی صدی بڑھ گئی ہے۔

عراق :۔ نوری پاشا وزیر اعظم کے اس اعلان کے مطابق جو عراق کے تیل کی برآمد کے متعلق تھا اور جس کا تذکرہ جامعہ کے پچھلے نمبر میں آ چکا ہے حکومت عراق اور ایک انگریزی کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ مرتب ہوا ہے اور اس کے ماتحت جو رعایت حکومت برطانیہ کو دی گئی ہے اس میں بین الاقوامی مفاد کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جرمنی، اٹلی اور فرانس اس معاہدے سے بے تعلق نہیں ہوں گے۔ کمپنی کو ۷۵ برس تک تیل کی برآمد کا اجارہ حاصل ہوگا اور اس کے لئے دریائے دجلہ کے مغربی کنارے دو سو مربع میل کا رقبہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔

عرب :۔ حکومت نجد و حجاز کے متعلق ایک عرصے سے یہ خبر مشہور تھی کہ سلطان ابن سعود دولت برطانیہ سے کچھ روپیہ قرض لینا چاہتے ہیں جس کے عوض میں انگریزوں کو حجاز میں خاص مراعات حاصل

ہونگی۔ چونکہ یہ مراعات حجاز میں انگریزی سیادت کے مرادف ہیں اس لئے مسلمان بجا طور پر اس خبر سے مضطرب تھے۔ مقام مسرت ہے کہ حکومت نجد نے اس خبر کی تردید کردی ہے لیکن جو اعلان سلطان ابن سعود یا ان کے نمائندوں کی طرف سے شائع ہوا ہے اس کا آخری حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت نجد بجائے کسی مغربی قوم کے کسی دولتمند مسلمان سے قرض لینے کی خواہشمند ہے۔ اگر جلالۃ الملک کی حکومت واقعی سنجیدگی کے ساتھ اس تجویز پر غور کر رہی ہے تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑیگا کہ جلالۃ الملک یا ان کے نمائندے اپنے سوا تمام دنیا کو جاہل سمجھتے ہیں اور یہ کوئی بہت اچھی بات نہیں۔ اس لئے کہ اول تو ہماری دانست میں ایسے مسلمانوں کا وجود عنقا ہے جو کسی حکومت کو قرض دیسکیں اور اگر ہو بھی تو ان کی یہ کارروائی بین الاقوامی ذمہ داریوں سے خالی نہیں ہوسکتی۔ اگر اس قسم کا کوئی مسلمان واقعی دنیا میں موجود ہے تو اس انکشاف کا سہرا ہز میجسٹی عبدالعزیز ابن سعود سلطان نجد و ملحقاتہا کے سر ہوگا اور اس کے لئے مسلمان عالم جلالت مآب کو جس قدر بھی مبارکباد دیں کم ہے۔

وزارت معارف افغانستان کی تعلیمی روئیداد جریدۂ اصلاح کی تازہ اشاعتوں سے معلوم ہوا ہے کہ شروع اپریل میں مدارس کابل کے تقسیم انعامات کی رسم نہایت دھوم دھام سے منائی گئی۔ اس موقع پر خود اعلیحضرت شہریار غازی بنفس نفیس تشریف رکھتے تھے اور ممدوح کے علاوہ وزیر معارف اور دوسرے اعیان و مسائد مملکت بھی موجود تھے۔ اول والی بال کا میچ ہوا (مکتب امانی اور امانیہ کے درمیان) پھر تلاوت قرآن کے بعد آقائے محمد کبیر خاں متعلم مکتب حبیبیہ نے اعلیحضرت کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا جس کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:-

هزار شکر که از طالع نکو فرجام | مشرفیم بدربار شاه با اکرام
شهے که گشت ز تدبیر ناجئ ملت | ز سیل حادثهٔ انقلاب فتنهٔ خرام
زهی اوست که احیائے ملک و ملت شد | ز فرض اوست همیں راحت خواص و عوام
همیں زمین قدوم مبارکش از سر | گسسته رشتهٔ تامین خلق یافت نظام
اگرچه ره بترقی از وست جمله امور | نموده سوئے معارف وے توجهٔ تام
بماست فرض که دانیم قدر ایں نعمت | ز روئے صدق نمائیم شکر ایں انعام

وزیر معارف کی رپورٹ کے بعد اعلیٰحضرت نے انعامات تقسیم کئے اور موقعہ کی مناسبت سے کے لحاظ سے برجستہ ایک تقریر فرمائی۔

وزیر معارف کی روئیداد کا ملخص یہ ہے کہ سال گزشتہ حکومت افغانستان نے تین لاکھ روپیہ افغانی تعلیم پر صرف کیا۔ دارالامان کی اراضی اور باغات سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ وجہ تعلیم کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، اس کے علاوہ ہے تعلیمی حالت با عتبار معلمین و متعلمین دن بدن رو بہ اصلاح ہے۔ طلبا کی تعداد بڑھ گئی ہے اور بہتر معلموں کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔ انقلاب کے زمانے میں جو عمارات منہدم ہوگئی تھیں ان کی ازسر نو مرمت کرائی گئی ہے۔ بعض مدارس میں اضافہ ہوا ہے اور حتی الوسع ان کی تزئین و آرائش کی کوشش کی گئی ہے۔ سامان تعلیم کے علاوہ نصاب میں شعبہ ہائے نجاری و معماری کو بڑھا دیا گیا ہے۔ مکتب زراعت اور مکتب صنائع کا افتتاح ہوا۔ قندھار، قطغن، بدخشاں، ہرات، مزار شریف اور سمت مشرقی میں ایک ایک مکتب ابتدائی کھولا گیا ہے۔ سمت مشرقی میں ایک اور مدرسہ نجم المدارس کے نام سے قائم ہوا ہے۔ کیمیا اور طبیعیات کی تعلیم کے لئے معلموں کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ بوائے اسکاؤٹس (یعنی کشافان) کی تحریک بھی دن بدن مقبول ہو رہی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے مدارس کے علاوہ تمام مساجد میں تعلیم کا انتظام ہے۔ وزارت معارف نے صیغۂ تالیف و اشاعت سے بھی غفلت نہیں برتی۔ صیغۂ مذکور نے اس وقت تک ۴۲ کتابیں شائع کی ہیں۔ بیرونی ممالک میں جو افغان طلبا مختلف مضامین مثلاً زراعت، ہندسی، تعمیرات، ریڈیو، تار برقی، طب، دنداں سازی، آبرسانی، عسکریات وغیرہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کی تعداد ۸۰ ہوا ہے۔

اعلیٰحضرت شہریار غازی نے اس روئیداد پر اطمینان کا اظہار کیا لیکن وزارت معارف کو ہدایت کی کہ ابھی تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے اسے اپنی مساعی میں اور زیادہ اجتہاد اور سرگرمی سے کام لینا پڑیگا۔ جلالت مآب نے یہ بھی فرمایا کہ ان کا تعلیمی نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ افغان طلبا مذہب کے پابند اور خدمت ملک و ملت کی آرزو رکھتے ہوں۔

ممالک غیر

برطانیہ ناظرین کو معلوم ہے کہ برطانیہ نے ستمبر گذشتہ میں پونڈ اور سونے کا تعلق توڑا، پھر دسمبر سے اکثر اشیاء کی درآمد پر تامینی محصول لگائے۔ لیکن ان دونوں غیر معمولی معاشی کارروائیوں کے جو نتائج نظری اعتبار سے رونما ہونے چاہیئے تھے وہ ہنوز وضاحت کے ساتھ ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔ ان دونوں باتوں کا نتیجہ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ انگلستان میں درآمد اشیاء میں معتد بہ کمی ہو، برآمد اشیاء خوب بڑھے اور ملک میں قیمتیں چڑھیں اور تجارت کی کساد بازاری دور ہو۔ لیکن واقعی صورت حال نے اس نظری نقشہ کا پورا پورا ساتھ نہیں دیا۔ ستمبر میں پونڈ کو سونے سے جدا کرنے کا نتیجہ یہ تو ہوا کہ پونڈ کی قدر میں باعتبار زر کوئی ایک تہائی کی کمی ہوگئی لیکن تھوک فروشی کی قیمتیں ستمبر میں اگر ۹۹ تھیں تو ستمبر میں ۱۰۶ تک بڑھیں اور دسمبر میں پھر کچھ گھٹ کر ۱۰۶ سے کم ہوگئیں۔ اجرتیں ۹۶½ سے گھٹ کر ۹۶¼ رہ گئیں۔ قیمتوں میں بھی جتنی امید تھی اتنا اضافہ نہیں ہوا۔ تجارت پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ اس سے ہو سکے گا کہ ۱۹۳۱ء کے پہلے نو مہینوں میں انگلستان کی اوسط ماہوار درآمد ۶۹ ملین پونڈ تھی، اور پونڈ کے سونے سے جدا ہونے کے بعد آخری تین مہینوں میں ۶۷ ملین پونڈ۔ البتہ جنوری میں تامینی محصول لگنے کے بعد یکایک درآمد میں کوئی ۱۴ ملین پونڈ کی کمی ہوئی۔ لیکن ایک تو جنوری ۱۹۳۱ء میں بھی کوئی ۵ ملین پونڈ کی کمی ہوئی تھی، دوسرے محاصل درآمد کی خبر پاکر لوگوں نے جلد جلد مال منگا لیا تھا اس لئے جنوری ۱۹۳۲ء میں آنے والا مال دراصل نومبر اور دسمبر میں انگلستان پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ اعداد کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴ ملین میں سے صرف ۵ ملین کی کمی ان اشیاء کی درآمد میں ہوئی ہے جن پر تامینی محصول لگایا گیا ہے باقی کمی دوسری چیزوں کی ہے۔ ستمبر کے بعد کی برآمد کے اعداد سے بھی متوقع نتائج کا اظہار نہیں ہوتا۔ وہ اعداد یہ ہیں:۔

سنہ	اکتوبر	نومبر	دسمبر	جنوری
برآمد ۱۹۳۰-۳۱ء (ملین پونڈ)	۵۴٫۱	۵۰٫۱	۴۳٫۷	۴۳٫۷
برآمد ۱۹۳۱-۳۲ء (ملین پونڈ)	۳۸٫۱	۳۶٫۸	۳۷٫۷	۳۶٫۴

یہ نتائج ہرگز ایسے نہیں ہیں کہ انگلستان کی مالی حالت کے جلد درست ہو جانے کی توقع کیجاسکے۔ کہ اسی غرض کے لیے متحدہ 'قومی حکومت' قائم کی گئی تھی۔ اور جب پونڈ کو سونے سے جدا کرکے اور آزاد تجارت کی روایتی راہ کو چھوڑ کر بھی یہ اہم مقصد حاصل نہ ہوا تو غالباً اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ 'قومی حکومت' اپنی موجودہ شکل میں زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکے۔ چنانچہ حال ہی میں پارلیمنٹ کی ایک جگہ پر مزدور جماعت کے ایک رکن کا انتخاب پتہ دیتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر بدلنے والا ہے۔

موجودہ وزارت قومی میں اشتراک عمل کے امکانات زیادہ دن تک چلتے نظر نہیں آتے۔ خود وزیر اعظم مسٹر میکڈانلڈ کی حالت بہت قابل رحم ہے۔ یہ نام کو وزیر اعظم ہیں لیکن پہلے دن سے 'کنزرویٹو' جماعت ان کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کر رہی ہے مثلاً جنوری میں وزیر اعظم کے رفیق جوویٹ جنھوں نے جرأت کرکے اس رفاقت میں لیبر پارٹی کو چھوڑا تھا 'اٹارنی جنرل' کے عہدے سے مستعفی ہوئے۔ اس لئے کہ انھیں عام انتخاب میں شکست ہوگئی تھی۔ عام دستور کے مطابق سرکاری ممبروں میں کسی کو ان کے لئے ایسی جگہ خالی کر دینی چاہئے تھی جس پر ان کا انتخاب یقینی ہوتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ ان کی جگہ ایک کنزرویٹو طامس انس کیپ کو اٹارنی جنرل بنایا گیا اور ان کی جو جگہ خالی ہوئی اس پر بھی ایک کنزرویٹو سر فرینک مری مین بھیجے گئے۔ پھر تامینی محاصل کے قانون کے بارے میں بہت کچھ اختلافات رہے اور وزارت برطانوی کی متحدہ ذمہ داری کا مسلک سپرد طاق نسیاں کیا گیا۔ اور برطانوی وزرا نے برطانوی وزارت کے پیش کردہ قانون کے خلاف پارلیمنٹ میں تقریریں کیں۔ ہندوستان اور آئرستان کے مسائل کے متعلق بھی اس قدر مختلف الخیال جماعتوں کا باہمی تعاون زیادہ قرین قیاس نہیں ہے۔

جب وزارت کے باہمی تعاون کا یہ حال ہو اور ان کی تدابیر قوم کی مالی حالت کو بہتر بنانے میں واضح نتائج پیدا نہ کرسکیں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر آیندہ ۶ مہینے کے اندر اندر موجودہ وزارت ٹوٹے اور حکومت کی تشکیل نو کے مسئلہ سے انگلستان کے مدبر دوچار ہوں۔

۲

آئرستان | ڈی ویلرا کے انتخاب پر پچھلی اشاعت میں کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس انتخاب عام سے پہلے آئرستانی ڈیل (آئرستانی پارلیمنٹ) میں نشستوں کی تقسیم یوں تھی کہ ۶۵ کاسگریو وزیر اعظم کی پارٹی کے اراکین تھے اور ان کی حمایت میں ۱۲ غیر جانبدار، ۶ کسان، اور ۲ غیر جانبدار مزدور جماعت کے اراکین تھے کل ۸۵۔

مخالفوں میں ۵۶ فیانا فیل یعنی ڈی ویلیرا کی جماعت کے رکن تھے، ۱۰ مزدور اور ایک غیر جانبدار کل ۶۷-

نئی پارلیمنٹ میں فیانا فیل کے ۷۲ آدمی ہیں اور ان کی حمایت میں ۷ مزدور کل ۷۹-

مخالف جماعت میں ۵۶ کاسگریو کی جماعت کے لوگ ہیں اور ۱۷ غیر جانبدار کل ۷۳-

نئی وزارت کی اکثریت کا دارومدار مزدور جماعت کے اراکین پر ہے اور مزدور اپنی اس اہمیت کو سمجھ کر اس سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ مزدور جماعت اور 'فیانا فیل' کے معاشی پروگرام میں بہت کچھ ہم آہنگی ہے لیکن شاید خالص سیاسی یا جذباتی معاملات میں مزدور آخر وقت تک ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوں۔

جرمنی | مارچ کے جامعہ میں اس خیال کا یقین کے ساتھ اظہار کیا گیا تھا کہ گو فان ہنڈنبرگ پہلے انتخاب میں کامیاب نہ ہوسکے لیکن دوسرے انتخاب میں ان کا منتخب ہونا یقینی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس موقع پر بجائے پانچ امیدواروں کے صرف تین امیدوار میدان میں تھے۔ ہٹلر قومی اشتراکیوں اور بعض دوسرے قوم پرست گروہوں کی طرف سے، تھلمان اصلی اشتراکیوں (کمیونسٹوں) کی طرف سے اور فان ہنڈنبرگ تمام دوسری جماعتوں کی جانب سے۔ منتخب فان ہنڈنبرگ ہوئے اور اس طرح کہ انھیں منتخب کرنے والوں کی تعداد دوسرے دونوں امیدواروں کی مجموعی رایوں سے زیادہ تھی۔ جرمنی کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے فان ہنڈنبرگ کے لئے یہ بڑی کامیابی تھی۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہٹلر گو منتخب نہ ہوسکا مگر کامیابی اسے بھی بڑی حاصل ہوئی۔ فان ہنڈنبرگ جیسی شخصیت کے مقابلہ میں ایک کروڑ تیس لاکھ رائیں حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ قومی اشتراکیت کی تحریک روز بروز ترقی کر رہی ہے اور اگر آج نہیں تو کچھ دنوں بعد اس جماعت کا برسراقتدار آنا لازمی امر ہے۔

اس دعوے کی تائید مجالس قانون ساز کے ان انتخابات سے بھی ہوتی ہے جو ابھی اسی مہینے جرمنی کی پانچ ریاستوں میں منعقد ہوئے۔ ان ریاستوں میں پرشا کو قدرۃً بہت اہمیت حاصل ہے۔ جرمن قول کے مطابق جو پرشا پر حکومت کرتا ہے وہی جرمنی کا اصلی حاکم ہوتا ہے۔ اب تک اس ریاست میں اعتدال پسند اشتراکی بعض دوسری جماعتوں کی مدد سے برسراقتدار تھے مگر نئے انتخابات نے صورت حال بالکل بدل دی ہے۔ جہاں اب تک ہٹلر کے مؤیدین کی تعداد ۹ تھی اب ۱۶۰ سے بھی اوپر پہنچ گئی ہے۔ گو تمام دوسری جماعتوں کی مجموعی تعداد اس سے زیادہ ہے پھر بھی اس کا امکان ہے کہ قومی اشتراکی بعض

دوسری جماعتوں سے مل کر جو کم وبیش ان کے ہم خیال ہیں حکومت قائم کرسکیں۔ اگر انتہا پسند اشتراکیوں نے اپنے تمام وعدوں کے خلاف اعتدال پسندوں کا ساتھ دیا تب تو بیشک پرشا میں موجودہ حکومت قائم رہ سکتی ہے ورنہ اور کوئی صورت نہیں۔

اگر اس وقت پرشا میں قومی اشتراکی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر پرشا اور مرکزی حکومت میں پیچیدگیوں کا پیدا ہونا لازمی ہے اور کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر جرمنی کے وزیراعظم ہر برونِنگ کو مجبوراً مرکزی مجلس قانون ساز کے بھی نئے انتخابات کرانا پڑیں۔ نئے انتخابات کے یقینی طور پر معنی ہوں گے قومی اشتراکیوں کی کامیابی۔ اور قومی اشتراکیوں کی کامیابی کے معنی ہوں گے ایک طرف فرانس اور دوسرے ممالک سے ناچاقی اور دوسری طرف اندرون ملک میں نظام جمہوری کی تخریب۔ مگر یہ صرف اس صورت میں ہے جب یہ جماعت اپنے وعدوں پر قائم رہ سکی۔ مگر وہ سب وعدے جو آج قومی اشتراکی کر رہے ہیں ان کا پورا کرنا قدرتی ناممکنات سے ہے۔ قوت حاصل کرنے کے بعد اس جماعت کا رسوا ہونا ضروری ہے اور اس کی رسوائی کے ساتھ ہی انتہا پسند اشتراکیوں کی باری آتی ہے جرمنی کی جو موجودہ حالت ہے اس میں قدرتی طور پر انتہا پسند جماعتیں پھلتی پھولتی ہیں۔ یا تو قومی اشتراکی یا پھر کمیونسٹ!

چین و جاپان | جیسا کہ پچھلے مہینہ لکھا جا چکا ہے جاپان نے شنگھائی کے علاقہ میں تو انجمن اقوام کی قرارداد کے مطابق جنگی کارروائیاں بند کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن منچوریا پر اپنے اثر میں ذرا سی کمی بھی اسے گوارا نہیں۔ جاپان نے ایک خود مختار منچوری حکومت کا اعلان کرا دیا ہے اور معزول شاہ چین کو جس کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں صدر جمہوریہ بنا کر خود اس ملک پر حکمراں ہے۔

امریکہ اور دول یورپ اس صورت حال کو پسند نہیں کرتے مگر جاپان انھیں کی سنت پر تو چل رہا ہے اس لئے ناپسندیدگی کے اظہار میں زور کہاں سے آئے؟ چین کی تقسیم کا منصوبہ جاپان سے پہلے دول یورپ نے بنایا تھا۔ کبھی مراعات معاشی کی شکل میں، کبھی دورافتادہ صوبوں مثلاً تبت اور منگولیا پر تفوق کی صورت میں، کہیں ٹھیکوں کے نام سے، کہیں حلقہائے اثر کے روپ میں۔ اتفاق کی بات تھی کہ جاپان کو اس تقسیم میں روس کے وارث کی حیثیت سے حصہ ملا اور منچوریا کو جاپان کی

نوآبادی بنانے کا منصوبہ دراصل جاپان کو اسی تقسیم کے پروگرام کے ایک حصہ کی تکمیل ہے۔

امریکہ اس کی سخت مخالفت کر رہا ہے اگرچہ ۱۹۰۳ء میں کولمبیا سے پناما کی بغاوت میں ریاستہائے متحدہ کا جو رویہ رہا تھا اسے جاپان بطور نظیر پیش کرتا ہے۔ انگریز اس نظیر کو وزنی بتلاتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ تبت کے متعلق انگریزوں کے جو منصوبے ہیں وہ اس باب میں ان کے لئے زیادہ وزنی ہوں گے!

روس نے بھی منچوریا کی نئی حکومت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اگرچہ چینی مشرقی ریلوے کے چینی صدر مو کو جب جاپانیوں نے اس لئے نکال دیا کہ اس نے نئی حکومت کے احکام نہ مانے تو روس نے اسکی برخاستگی کو منظور کر لیا۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ فوجی نقل و حرکت کے سلسلہ میں روس کو احتجاج کا موقع ملا مگر وہ خاموش رہا۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ روس کو منچوریا میں جاپان کا اس درجہ تسلط نہیں بھاتا۔ شروع مارچ میں روسی حکومت کے سرکاری اخبار نے دو دستاویزیں شائع کیں جن کے متعلق خیال ہے کہ ممتاز جاپانی سپہ سالاروں نے تیار کی تھیں اور جن میں روسی علاقہ پر حملہ آور ہونے کے منصوبوں کی تفصیل ہے۔ اس اخبار نے پھر ایک افتتاحیہ لکھا کہ روس ہر چند کہ غیر جانبدار رہنا چاہتا ہے لیکن اگر اس کے خلاف یہ منصوبے بنائے گئے تو لڑنے پر بھی آمادہ ہے۔ یہ مضمون تمام روس میں لاسلکی کے ذریعہ پھیلایا گیا اور تمام روسی اخباروں نے اسے شائع کیا۔ اس کے بعد سے منچوری سرحد کے قریب روسی فوجیں جمع ہو رہی ہیں اور چونکہ "مشرق بعید کی ریلوے" کے سلسلہ میں روس کے اغراض جاپان سے ٹکراتے ہیں اور ادھر جاپان کا فوجی وجوہ سے ولاڈی واسٹک پر دانت ہے اس لئے ممکن ہے کچھ عرصہ بعد مخالفت کے یہ شرارے جنگ کی شکل میں ظاہر ہوں۔

شذرات

اردو اکادمی کا جلسہ جو پچھلے مہینے ملتوی ہوگیا تھا ۹ / اپریل کو منعقد ہوا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دو جلسے ہوئے پہلا ۸ بجے شام سے ۹ بجے تک دوسرا ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک۔ حاضرین کی تعداد اس مرتبہ پچھلے دو جلسوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ باہر سے بھی پہلے سے زیادہ لوگ آئے تھے اور دہلی کے اہلِ ذوق بھی بہت کثرت سے موجود تھے۔

پہلے جلسے میں مولانا اسلم جیراجپوری نے "مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر" کے عنوان سے ایک دلچسپ مقالہ پڑھا جس کا نصف حصہ اس پرچے میں چھپ رہا ہے اور نصف آیندہ مہینے چھپے گا۔ جلسے کی صدارت مولانا محمد سورتی صاحب کرنے والے تھے مگر انھیں عین وقت پر دہلی سے باہر تشریف لے جانا پڑا۔ حسنِ اتفاق سے ان کے مایۂ ناز شاگرد ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب احراری جو ابھی برلن سے علوم اسلامی کی ڈگری لے کر آئے ہیں موجود تھے اور وہی جناب شیخ الجامعہ کی تجویز سے جلسے کے صدر بنائے گئے۔ فاضل مقرر کی تقریر ختم ہونے کے بعد جناب صدر نے ایک مختصر سی تقریر میں موضوع کلام پر مزید روشنی ڈالی اور جلسہ دونوں حضرات کے شکریے پر ختم ہوا۔

پہلے جلسے کے بعد کسی قدر وقفے سے دوسرا جلسہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ "ہندوستانی یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم اجتماعی اور انفرادی دونوں پہلوؤں سے صحیح نشو و نما میں مدد دینے کے بجائے اس میں رکاوٹ ڈالتی ہے"۔

اجتماعی حیثیت سے یونیورسٹی کا فرض یہ ہے کہ قومی تمدن اور قومی روایات کو محفوظ رکھے، ان میں زمانے کے رنگ اور ضرورت کے مطابق تجدید اور اصلاح کرے، تخلیقی قوت سے کام لے کر ان کی حدود کو وسعت دے اور یہ سارا خزانہ آیندہ نسلوں کے سپرد کر دے۔ مگر ہماری یونیورسٹیاں قومی تمدن اور قومی روایات کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتیں۔ اور اگر کرتی بھی ہیں تو اسے حفاظت کے لائق نہیں بلکہ مٹا دینے

کے قابل سمجھتی ہیں۔ انھوں نے مذہب کو جو ہر قوم خصوصاً ہر ایشیائی قوم کی زندگی اور تعلیم کا مرکز ہونا چاہیے اپنے دائرے سے خارج کر دیا ہے اور اس کی طرف سے ایسی بے حسی پیدا کر دی ہے جو لامذہبی سے بھی بد تر ہے۔ انھوں نے ملکی زبانوں اور ان کے ادب کو اپنی محفل میں بار نہیں دیا اور اگر دیا بھی تو اتنی ذلت اور تحقیر کے ساتھ جتنی اونچی ذات والے اچھوتوں کی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کے علمی خزانوں کو کبھی نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا بلکہ محض مغربی علوم کو پڑھنے اور پڑھانے کے قابل سمجھا اور وہ بھی مجتہدانہ نظر سے نہیں بلکہ محض سطحی اور تقلیدی طور پر۔ علمی تحقیق درکنار ان سے اتنا بھی تو نہ ہو سکا کہ جدید علوم کو اپنے ملک کی زبانوں میں منتقل کر دیتیں تاکہ لوگ عام طور پر ان سے فائدہ اٹھا سکتے۔ سیاسی آزادی اور معاشرتی اور معاشی اصلاح کی کوششوں میں رہنمائی کرنا ایک طرف انھوں نے ہمیشہ ارباب حکومت کے اشارے سے ان کوششوں کی مخالفت کی اور انھیں بے جا اور مضر ثابت کرنے کے لئے منطق کے گلے پر چھری پھیری۔

انفرادی پہلو سے دیکھئے تو یونیورسٹی کا کام یہ ہے کہ نوجوانوں کے کل قوائے ذہنی کی تربیت کر سکے خصوصاً ان میں تعمیری تنقید اور آزادی فکر کا مادہ پیدا کر سکے، ان کے ذوق جمال کی صحیح تربیت کر سکے اور ان کے آئینۂ اخلاق کو علم کی صیقل سے چمکائے۔ ہماری یونیورسٹیوں کے اساتذہ عموماً ان صفات سے خود ہی عاری ہوتے ہیں تا بہ دیگراں چہ رسد۔ تعمیری تنقید اور آزادی فکر کا یہ حال ہے کہ شاید ہی آج تک کسی یونیورسٹی کے پروفیسر نے کوئی کتاب لکھی ہو جس میں کسی علمی مسئلے میں مغربی علماء سے مدلل طور پر اختلاف کرنے یا اپنی طرف سے کوئی رائے پیش کرنے کی جرأت کی ہو۔ ذوق جمال کی کیفیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اکثر حضرات کے کمرے ادنیٰ بازاری تصویروں سے آراستہ ہوتے ہیں اور سچے آرٹ کا منہ چڑاتے ہیں۔ اب رہا اخلاق تو وہ مذہب کے ساتھ ہی علم و فضل کے ان درباروں سے رخصت کر دیا گیا ہے اور ان کی خالص علمی فضا میں اس غیر علمی چیز کے لئے کہیں گنجائش نہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان حضرات کی تعلیم سے نوجوانوں کے انفرادی قوائے ذہنی کی نشو و نما پر کیا اثر پڑیگا۔

مجوز کی تقریر ختم ہونے پر خواجہ غلام السیدین صاحب تجویز کی تردید کے لئے کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ بات کی تردید کے مختلف پہلو اور مختلف حد ہوتی ہے۔ مجھے جناب مجوز کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم ناقص ہے اور اصلاح کی محتاج ہے۔ اس کی خرابیاں مجھے غالباً جناب

مجوزے زیادہ معلوم ہیں اور ان کی درستی کو میں بھی موصوف کی طرح ضروری سمجھتا ہوں مگر یہ مجھے تسلیم نہیں کہ ان کی تعلیم کا مجموعی نتیجہ ملک و قوم کے لئے مضر ہے۔ اس حد تک میں اس تجویز کا مخالف ہوں۔ مجموعی حیثیت سے کسی چیز کے حسن و قبح یا فائدے اور ضرر کے اندازے کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ معیار کمال پر پرکھی جائے اور جب وہ اس پر پوری نہ اترے تو کھوٹی سمجھ کر یکسر رد کر دی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ زمانے کے لحاظ سے، امکانی صورتوں کے لحاظ سے، دوسری چیزوں کے مقابلے میں اس چیز کی قدر و قیمت کیا ہے اور پھر یہ کہ اس کے فوائد زیادہ ہیں یا نقصانات۔ موجودہ تعلیم جس زمانے میں شروع ہوئی وہ ہمارے ملک کے لئے انتہائی تنزل کا زمانہ تھا۔ ہماری پستی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور ایک بیرونی قوم ہم پر حاکم ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں جو مشرقی تعلیم رائج تھی اس کا مجموعی حیثیت سے مضر ہونا اسی سے ثابت تھا کہ اس نے ہمیں ان دنوں کو پہنچایا۔ سارے ملک پر اس درجہ کم ہمتی اور مایوسی کا غلبہ تھا کہ ہمارے قدیم تہذیب و تمدن کے جو عناصر زمانے کی دستبرد سے بچ رہے تھے انھیں سنبھال کر رکھنے کا کسی کو حوصلہ نہ تھا۔ ادھر باہر سے جدید مغربی تمدن کا سیلاب آرہا تھا اور خوف تھا کہ وہ سارے مشرق کو تہ آب کر دے گا۔ ایسی صورت میں کچھ تو حاکم قوم کی مصلحتوں سے کچھ محکوموں کی اپنی خواہش سے یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم کی بنیاد پڑی جس کا مرکز مغربی علوم کی تعلیم قرار دی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ بہترین صورت نہیں تھی مگر مشکل یہ ہے کہ سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں تھی۔ اس وقت سوال کشتی کے طوفان سے بچ کر پار لگنے کا نہیں تھا بلکہ محض اتنا تھا کہ کسی طرح وہ پانی پر قائم رہے۔

اب زمانہ بدلا ہے۔ ہمارے دل تنزل کے احساس اور ترقی کی آرزو سے بے چین ہیں۔ اگر سچ پوچھئے تو اسی ناقص تعلیم کا طفیل ہے۔ سقراط جہل کے احساس کو علم کا پہلا زینہ سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک تعلیم کا سب سے اہم مقصد یہی تھا کہ یہ احساس پیدا کیا جائے۔ یہ محض شاعری نہیں بلکہ گہرا فلسفیانہ نکتہ ہے۔ تنزل کا احساس تبھی ممکن ہے جب ترقی کا نصب العین نظر کے سامنے ہو۔ موجودہ تعلیم میں لاکھ خرابیاں ہوں مگر یہ بڑی خوبی ہے کہ اس نے خود اپنی خرابیوں کا احساس ہمارے دل میں پیدا کر دیا ہے۔ زندہ قوموں کے علوم اور ان کی زندگی کے مطالعے نے خواہ وہ کتنا ہی محدود ہو ہمارے دلوں میں زندگی کا حوصلہ پھر سے ابھارا ہے اور یہ بہت بڑی چیز ہے۔ اب رہی ہمارے مذہب و اخلاق اور ہماری قدیم معاشرت کی بربادی اس کی ذمہ داری موجودہ تعلیم پر نہیں بلکہ اس گھن پر ہے جو ہماری زندگی کو پہلے

سے لگ گیا تھا اور جس کے دور کرنے میں موجودہ تعلیم حائل نہیں ہوتی بلکہ مدد دیتی ہے۔

خواجہ صاحب کی پر مغز تقریر کے بعد ڈاکٹر سید احمد صاحب بریلوی، سید تجمل حسین صاحب، مولوی نور الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر عبد العلیم صاحب اجراری سب نے تجویز کی تائید میں دلچسپ تقریریں کیں خصوصاً سید تجمل حسین صاحب نے اپنے ظریفانہ چٹکلوں سے محفل کو کشت زعفران بنا دیا۔ افسوس ہے کہ خواجہ صاحب کو سارے مجمع میں کوئی تائید کرنے والا نہ ملا۔ اس اثنا میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ناسازی مزاج کے باعث تشریف لے گئے تھے اور یوں بھی چونکہ مخالف کی تقریر کے بعد کل تقریریں انکی تائید میں ہوئی تھیں اس لیے جواب کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی اس لئے جناب صدر نے معزز مقرروں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جلسہ برخاست کر دیا۔ عام اصول کے خلاف لوگوں سے تجویز کے متعلق رائیں نہیں لی گئیں کیونکہ اکادمی نے اپنے مباحثوں کا مقصد کسی کی فتح اور کسی کی شکست قرار نہیں دیا ہے بلکہ یہ کہ زیر بحث مسئلے کے ہر پہلو پر نظر ڈالی جائے اور سامعین کو بطور خود اس پر غور کرنے کی تحریک ہو۔

مباحثے کے دوران میں اور اس کے بعد اکثر حاضرین نے اس قدر جوش اور انہماک ظاہر کیا کہ اب اکادمی کے کارکنوں کا ارادہ ہے کہ ممکن ہو تو سال میں دو تین جلسے اس قسم کے منعقد کیا کریں۔ اگر اکادمی کے اراکین میں سے کوئی صاحب آیندہ اگست کے بعد آخر ستمبر یا اکتوبر میں کسی مسئلے پر کوئی تجویز پیش کر کے مباحثے کا آغاز کرنا چاہتے ہوں تو براہ کرم ناظم اکادمی کو اپنے نام نامی سے اور اپنی تجویز سے مطلع فرمائیں۔
